یادگار شخصیتیں
جواہر لعل نہرو
ترجمہ
رفیق محمد شاستری
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دھلی

یادگار شخصیتیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

جواہر لعل نہرو

ترجمہ

رفیق محمد شاستری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار

دہلی ۶

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ

بمبئی ۳

اپریل ۱۹۶۶ء

بار اوّل ۱۱۰۰ قیمت ۵/۵۰

کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی

مہاویرا اور گوتم بُدھ

ہندوستان میں مہاویرا اور گوتم بُدھ نے جنم لیا۔ مہاویر نے جین مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اِن کا اصلی نام وردھ مان تھا مہاویر ان کا لقب ہے جو انھیں ان کی عظمت کی بنیاد پر دیا گیا تھا۔ جین مذہب کے پیرو بیشتر مغربی ہندوستان اور کاٹھیاواڑ کے علاقے میں رہتے ہیں۔ کاٹھیاواڑ اور راجستھان میں آبو پہاڑ کے مقام پر ان کے خوب صورت مندر ہیں۔ اہنسا (عدم تشدّد) میں ان کا زبردست اعتقاد ہے۔ یہ ایسے کاموں کے سخت خلاف ہیں جن سے کسی جاندار کو تکلیف پہنچتی ہو۔ اِس سلسلے میں یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگی کہ فیثاغورس بھی گوشت خوری کا سخت مخالف تھا۔ اِس نے اپنے شاگردوں کو سخت تاکید کی تھی کہ وہ ہرگز گوشت نہ کھایا کریں۔

گوتم بُدھ ایک چھتری شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا نام سدھارتھ تھا۔ ان کی ماں مہارانی مایا کے بارے میں ایک قدیم جاتک کتھا میں لکھا ہے کہ مہارانی مایا پونم کے چاند کی طرح مقدّس، قابلِ احترام و پرستش تھیں۔ وہ اپنے عزم و ارادے میں دھرتی کی طرح اٹل اور خاموش تھیں۔ ان کا دل کنول کی طرح پاک تھا۔

گوتم کے والدین نے انھیں بڑے ناز و نعم میں پالا اور اس بات کی انتہائی کوشش کی کہ وہ دنیا کے دُکھ درد اور اندوہ ناک مناظر سے دور ہی رہیں۔ لیکن بھلا یہ کیسے ممکن تھا، قصّہ مشہور ہے کہ انھوں نے ایک مفلس، ایک اپاہج اور ایک جنازے کو دیکھا۔ ان

مناظر کا ان کے دل پر گہرا اثر پڑا۔ اِس کے بعد راج محل میں انھیں کہاں چین پڑنے والا تھا۔ عیش و مسرت کی تمام آسایشیں جو ان کی زندگی کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھیں حتیٰ کہ ان کی حسین اور نوجوان بیوی بھی جسے وہ بہت عزیز رکھتے تھے، دکھ اور تکلیف سے گھری ہوئی انسانیت کی فکر ان کے دل سے دُور نہیں کرسکیں۔ اِس خیال سے وہ دن بہ دن بے چین رہنے لگے۔ اِن کے دل میں دنیا کی مصیبتوں سے نجات پانے کی تڑپ بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ اِس حالت کو برداشت نہ کرسکے اور ایک روز رات کی خاموشی میں وہ راج محل اور اپنے تمام عزیز و اقارب کو چھوڑ کر اُن سوالوں کا حل تلاش کرنے نکل پڑے، جن سوالوں نے کہ ان کے دل کو بے چین بنا رکھا تھا۔ اِس تلاش و جستجو میں ان کا بہت وقت لگا اور انھیں بہت سی مصیبتیں اُٹھانی پڑیں، بالآخر کئی سال بعد گیا میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے انھیں سچے گیان کی وہ روشنی ملی جسے "بُدھتو" کہتے ہیں اور وہ بُدھ ہوگئے۔ جس پیڑ کے نیچے وہ بیٹھے تھے وہ پیڑ "بودھی ورِکھ" کے نام سے مشہور ہے۔ کاشی (بنارس) کے قدیم شہر کے قریب سارناتھ کی شکارگاہ میں بُدھ نے اپنی تعلیم کی تبلیغ شروع کی۔ سارناتھ اُس زمانے میں "اِتی پتن" یا "رشی پتن" کہلاتا تھا۔ اُنھوں نے دنیا کو اعلیٰ اور پاک زندگی کا راستہ بتایا۔ دیوی دیوتاؤں کے نام پر کی جانے والی مویشیوں کی قربانیوں کی مذمّت کی۔ اُنھوں نے اِس بات پر زور دیا کہ اگر قربانی کرنی ہے تو انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے غصّہ، حسد اور خواہشات کو قربان کرے۔

بُدھ کی پیدایش کے وقت ہندوستان میں ویدک دھرم پھیلا ہوا تھا لیکن وہ بہت کچھ بدل چکا تھا اور اپنے اونچے آدرش (نصب العین) سے نیچے گر چکا تھا۔ براہمن پروہتوں یا مذہبی پیشواؤں نے پوجا پاٹ اور ظاہری رسومات کے ڈھونگ اور طرح طرح کے توہمات کو رواج دے رکھا تھا۔ ذاتوں کا بندھن بہت سخت ہوتا جا رہا تھا۔ عام آدمی سخت توہمات کا شکار تھا۔ لوگ جادو ٹونے، جنتر منتر، بدشگونی اور بھوت پریت سے ڈرتے تھے۔ ان طریقوں سے مذہبی پیشواؤں نے عوام کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔

وہ چھتری راجاؤں کے اقتدار کو بھی چیلنج کرنے لگے تھے۔ اس طرح چھتریوں اور براہمنوں میں ایک کشمکش پیدا ہوگئی تھی۔ اسی زمانے میں گوتم بدھ عوام کے ہر دلعزیز سُدھارک کی حیثیت سے سامنے آئے۔ انھوں نے براہمن پیشواؤں کے ان مظالم پر اور قدیم ویدک دھرم میں جو خرابیاں آگئیں تھیں، ان پر سخت حملہ کیا۔ انھوں نے اِس بات پر زور دیا کہ نیک اور پاک زندگی بسر کرنا اور دوسروں کی بھلائی کرنا اصل چیز ہے۔ پوجا پاٹ اور دکھاوے کی رسومات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ انھوں نے بدھ مذہب کو ماننے والے بھکشوؤں (سنیاسیوں) اور بھکشنوں کی ایک انجمن "بودھ سنگھ" کی بھی تنظیم کی۔

ایک مذہب کی حیثیت سے بدھ دھرم ہندوستان میں ایک عرصے تک کچھ مقبول نہیں ہوا۔ لیکن بعد میں یہ خوب پھیلا۔ مگر جلدی ہی ایک جدا مذہب کی حیثیت سے یہ یہاں سے قریب قریب ختم ہوگیا۔ اگرچہ لنکا سے لے کر چین تک کے دور دراز کے ملکوں میں اِس مذہب کا غلبہ ہوگیا، مگر اپنی مادرِ وطن یعنی ہندوستان میں یہ برہمن دھرم یا ہندو دھرم میں ضم ہوگیا۔ ہندو دھرم پر اِس کا زبردست اثر پڑا۔ اس نے ہندو مذہب سے بہت سے توہمات نکال پھینکے۔

سُقراط

سقراط ایک فلسفی تھا۔ وہ ہمیشہ حق کی جستجو میں لگا رہتا تھا۔ اس کے نزدیک محض علمِ حقیقی ہی ایک ایسی چیز تھی جسے وہ قابلِ تحصیل سمجھتا تھا۔ وہ اپنے حلقۂ احباب میں اکثر مشکل مسائل پر بحث وگفتگو کیا کرتا تھا۔ وہ اِس اُمید میں ایسا کرتا تھا کہ اِس بحث وگفتگو میں شاید اُسے حق کی کوئی جھلک نظر آجائے۔ اِس کے کئی شاگرد تھے۔ جن میں سب سے بڑا افلاطون تھا۔ افلاطون نے کئی کتابیں لکھی ہیں جو اب بھی دستیاب ہیں۔ اِن ہی کتابوں میں ہمیں سقراط کا کچھ تھوڑا بہت حال ملتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ حکومتِ وقت ایسے لوگوں کو جو حق کی تلاش وجستجو میں ہر وقت لگے رہتے ہیں عموماً پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی ہے، کیوں کہ حق کی تلاش اور حق گوئی اُنھیں بھاتی نہیں ہے۔ ایتھنس کی حکومت کو سقراط کا رنگ ڈھنگ بالکل پسند نہیں تھا۔ یہ پیرکلیز کے عہد کے تھوڑے ہی دن بعد کا واقعہ ہے اُس پر مقدمہ چلایا گیا اور اُسے موت کی سزا دی گئی۔ حکومت نے سقراط سے کہا کہ اگر تم وعدہ کرو کہ لوگوں سے بحث مباحثہ کرنا چھوڑ دو گے اور آئندہ اپنا طرزِ عمل بدل دو گے تو تمھیں معاف کیا جا سکتا ہے۔ سقراط نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس بات کو وہ صحیح سمجھتا تھا اُسے ترک کرنے پر اُس نے زہر کے اُس پیالے کو ترجیح دی جسے پی کر وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ مرتے وقت اُس نے اپنے اوپر الزام لگانے والوں، منصفوں اور ایتھنس والوں سے مخاطب

ہوکر اس طرح تقریر کی :

"...... اگر تم مجھے اس شرط پر رہا کرنا چاہتے ہو کہ میں حق کی تلاش اور جستجو چھوڑ دوں تو اے ایتھنس کے رہنے والو میں تمھارے اِس احسان کا شکریہ ادا کرتا ہوں مجھے معاف رکھو کہ میں تمھارا یہ حکم ماننے کے بجائے اُس پاک پروردگار کا حکم مانوں گا جس نے ـــــ جیسا کہ میرا ایمان ہے ـــــ یہ کام مجھے سونپا ہے اور جب تک جان میں جان ہے میں اپنی حق بینی اور حق شناسی پر بحث و گفتگو سے باز نہیں آؤں گا۔ میں اپنی یہ عادت ہرگز نہیں چھوڑوں گا جو کوئی مجھے ملے گا میں روک کر اُس سے یہی پوچھوں گا کہ کیا تمھیں اس بات پر ندامت نہیں ہے کہ تم دولت اور عزت کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو اور حق پرستی یعنی اپنی زندگی کی روحانی بلندیوں سے مالا مال کرنے کی تمھیں مطلق فکر نہیں ہے؟ میں نہیں جانتا کہ موت کیا چیز ہے۔ ممکن ہے وہ اچھی شے ہو، میں اُس سے نہیں ڈرتا، مگر مجھے یقین ہے کہ اپنے فرض سے منہ موڑنا ضرور بُری بات ہے اور اسی لیے جس چیز میں اچھائی کا امکان ہے اُسے میں اِس چیز پر ترجیح دیتا ہوں جس کی بُرائی کا مجھے یقین ہے ....."

اپنی زندگی میں سقراط نے علم و ادب کی بڑی خدمت کی اور حق پرستی کے پرچم کو بلند رکھا لیکن اِس سے بھی بڑا کام اُس نے اپنی موت کے بہانے کر دیا۔

دُنیا طرح طرح کی مصیبتوں اور بے انصافیوں کا شکار رہے۔ بہت سے لوگ موجودہ حالات سے غیر مطمئن ہیں، وہ اُسے بدلنا چاہتے ہیں۔ افلاطون نے نظامِ حکومت سے متعلق مختلف مسائل پر غور کیا تھا۔ اِس موضوع پر اُس نے بہت کچھ لکھا بھی ہے تاہم دیکھتے ہیں کہ اُس زمانے میں بھی لوگ اِس بات پر غور کیا کرتے تھے کہ کسی ملک کے سماج کو یا اُس کی حکومت کو کس طرح ڈھالا جائے جس سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اطمینان اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کا موقع ملے۔

جب افلاطون بوڑھا ہونے لگا تو ایک دوسرا یونانی جو بعد کو بہت مشہور ہوا میدان میں آیا۔ اس کا نام ارسطو تھا۔ وہ سکندرِ اعظم کا اتالیق رہ چکا تھا اور

سکندر نے اس کے کاموں میں بہت مدد کی تھی۔ سقراط اور افلاطون کی طرح ارسطو فلسفیانہ مسائل کی اُلجھنوں میں نہیں پڑا۔ وہ بیشتر مشاہدہ فطرت اور قانون قدرت کو سمجھنے میں لگا رہتا تھا اس علم کا نام فلسفہ طبیعی ہے جسے آج کل سائنس کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا ارسطو بالکل شروع کے سائنس دانوں میں تھا۔

سکندر

سکندر شمالی یونان میں مقدونیہ ریاست کا رہنے والا تھا۔ سکندر کا باپ فلپ مقدونیہ کا حکمراں تھا۔ وہ بہت قابل انسان تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی ریاست کو بہت مستحکم بنالیا تھا اور جاں باز سپاہیوں کی ایک ہوشیار فوج کی تنظیم کرلی تھی۔ سکندر کو سکندرِ اعظم کے لقب سے یاد کرتے ہیں وہ تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ مگر اُس کے عظیم کارناموں کے لیے اُس کے باپ نے پہلے سے ہی زمین ہموار کر رکھی تھی اور اس کی کامیابی کا یہی سب سے بڑا راز ہے۔ سکندر واقعی کوئی غیر معمولی اور جلیل القدر انسان تھا یا نہیں۔ یہ بات بحث طلب ہے۔ کم سے کم میں اسے اتنا بڑا بہادر نہیں مانتا کہ اُسے اپنے لیے قابلِ تقلید سمجھوں حالاں کہ اس میں شبہ نہیں کہ اُس نے تھوڑی سی عمر میں دو برِّ اعظموں پر اپنا سکہ جمالیا تھا۔ اس طرح تاریخ میں وہ پہلا فاتح عالم تصور کیا جاتا ہے۔ وسط ایشیا کے علاقوں میں آج بھی سکندر کا نام مشہور ہے۔ حقیقت میں وہ خواہ جیسا رہا ہو مگر تاریخ نے اُس کے نام کو بہت چمکا دیا ہے۔ بیسیوں شہر اُس کے نام پر بسائے گئے جن میں سے بہت سے آج تک موجود ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مصر کا اسکندریہ شہر ہے۔

اس کی عمر ابھی بیس سال کی تھی کہ وہ بادشاہ ہوگیا۔ نام و نمود حاصل کرنے کی اُس میں بہت ہوس تھی وہ اپنے باپ کی تنظیم دی ہوئی فوج سے اپنے پرانے دشمن ایران

پر دھاوا بولنے کے لیے بے تاب تھا۔ یونانی لوگ نہ تو فلپ کو چاہتے تھے اور نہ سکندر کو۔ لیکن ان کی طاقت اور دبدبے سے وہ مرعوب ضرور ہو گئے تھے اس لیے انھوں نے ایران پر دھاوا بولنے والی تمام فوجوں کا سپہ سالار پہلے فلپ کو اور بعد میں سکندر کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس طرح انھوں نے اِس نئی طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے جو اُس وقت اُبھر رہی تھی۔ ایک یونانی شہر اتھینس نے سکندر کا اقتدار تسلیم نہیں کیا اور اُس نے بغاوت کر دی۔ اِس پر سکندر نے اِس شہر پر نہایت وحشیانہ حملہ کر کے اُسے خاک میں ملا دیا۔ اُس کی عمارتیں ڈھا دیں اور بہت سے باشندوں کو قتل کر دیا۔ سکندر کی زندگی میں اِس طرح کے وحشیانہ مظالم اور بربریت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جن کی وجہ سے سکندر ہماری نظروں میں قابلِ ستائش نہیں رہ جاتا ہے بلکہ اُس کی طرف سے ہمارے دل میں نفرت بھی پیدا ہوتی ہے۔

سکندر نے مصر کو، جو اس وقت ایرانی شہنشاہ کے زیرِ نگیں تھا، آسانی سے فتح کر لیا۔ اس سے پہلے وہ ایران کے شاہ چھیارش کے ایک جانشین دارا سوم کو شکست دے چکا تھا۔ لیکن اِس نے ایران پر دوبارہ حملہ کیا اور دارا کو دوبارہ شکست دی۔ شہنشاہ دارا کے عظیم الشان محل کو اُس نے انتقاماً جلا کر خاک کر دیا کیوں کہ چھیارش اپنے زمانے میں ایتھنس کو جلا چکا تھا۔

فارسی کی ایک مشہور مثنوی شاہنامہ ہے۔ فردوسی نام کے ایک شاعر نے آج سے ایک ہزار سال پہلے اس کی تخلیق کی تھی۔ اِس میں دارا اور سکندر کی لڑائی کا حال بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ سکندر سے ہار جانے پر دارا نے ہندستان سے مدد مانگی۔ ہوا کی طرح تیز رَو اونٹ سوار پورس کے پاس پہنچا جو اس وقت ہندستان کے شمال مغرب کے علاقے کا حکمراں تھا۔ لیکن پورس اس کی ذرا بھی مدد نہ کر سکا۔ تھوڑے دنوں بعد اُسے خود ہی سکندر کے حملے کا مقابلہ کرنا پڑا۔ فردوسی کے شاہنامے میں ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ اُس میں ایرانی بادشاہوں اور سرداروں کے ہاتھ سے ہندوستانی تلواروں اور خنجروں کے استعمال کا جگہ جگہ ذکر آیا ہے اِس سے پتہ چلتا ہے

کہ سکندر کے زمانے میں بھی ہندوستان میں اچھی فولاد کی تلواریں بنتی تھیں، جن کی باہر کے ملکوں میں بڑی قدر ہوتی تھی۔

سکندر ایران سے آگے بڑھتا گیا اور وہ علاقہ جسے آج ایران، کابل اور سمرقند کہتے ہیں پار کرتا ہوا وہ دریائے سندھ کے شمالی کنارے تک پہنچ گیا وہیں پر اس کی سب سے پہلے ہندوستانی راجا سے لڑائی ہوئی۔ یونانی مورخ اس کا نام اپنی زبان میں پورس بتاتے ہیں۔ اس کا اصلی نام بھی کچھ اسی طرح کا رہا ہوگا لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ پورس نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اُسے شکست دینا سکندر کے لیے کوئی آسان کام ثابت نہیں ہوا۔ بیان کیا گیا ہے کہ وہ دراز قامت حلیم شمیم اور بہادر آدمی تھا۔ سکندر اُس کی شجاعت اور دلیری سے اتنا متاثر ہوا کہ شکست دینے کے بعد بھی اُس نے پورس کو تخت و تاج سے محروم نہ کیا۔ لیکن ایک خودمختار راجا کے بجائے وہ یونانیوں کا ایک صوبہ دار بن کر رہ گیا۔

سکندر شمال مغرب کے درۂ خیبر کو پار کر کے راولپنڈی سے کچھ دور شمال میں ٹکشلا کے راستے ہندوستان آیا۔ آج بھی اِس قدیم شہر کے کھنڈرات موجود ہیں۔ پورس کو ہرانے کے بعد سکندر نے جنوب میں گنگا کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اپنے اس ارادے کو وہ پورا نہ کر سکا اور سندھ ندی کے کنارے کنارے واپس چلا گیا۔

ذرا تصور کیجیے کہ سکندر اگر ہندوستان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا ہوتا تو کیا ہوتا۔ کیا اُس کی فتوحات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا یا ہندوستانی فوجوں نے اُسے شکست دے دی ہوتی۔ جب پورس جیسے سرحد کے چھوٹے سے راجا نے اُسے اتنا پریشان کیا تو بہت ممکن تھا کہ وسط ہندوستان کی بڑی بڑی ریاستیں سکندر کے بڑھتے ہوئے قدم کو روک دینے کے لیے کافی مضبوط ثابت ہوتیں۔ سکندر کی نیت خواہ کچھ بھی ہو مگر اُس کی فوج نے اُسے واپس لوٹنے کے فیصلے پر مجبور کر دیا برسوں تک مختلف ملکوں کی خاک چھانتے ہوئے اُس کے سپاہی بہت تھک اور اُکتا گئے تھے۔ شاید ہندوستانی سپاہیوں کی فنِ سپہ گری کا بھی اُن پر اثر پڑا ہو اور وہ شکست کا خطرہ مول نہ لینا

چاہتے ہوں۔ خواہ کچھ بھی وجہ رہی ہو، فوج نے واپس لوٹنے پر اصرار کیا اور سکندر کو اس پر راضی ہونا پڑا۔ لیکن واپسی کا یہ سفر بہت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ رسد اور پانی کی کمی کی وجہ سے فوج کو بہت نقصان پہنچا۔ راستے ہی میں سکندر بابل پہنچ کر مر گیا۔ یہ واقعہ ۳۲۳ء قبل مسیح کا ہے گویا ایرانی مہم پر روانہ ہونے کے بعد سکندر کو پھر اپنے وطن کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

سکندر تینتیس ۳۳ سال کی عمر میں مر گیا۔ اس عظیم شخصیت نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں کیا کیا؟ اس نے کچھ شاندار لڑائیاں جیت لیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت بڑا سپہ سالار تھا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ مغرور اور بد دماغ انسان بھی تھا اور اکثر وہ بہت غضب ناک اور بے رحم ہو جاتا تھا۔ خود کو وہ کسی دیوتا سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ غصہ اور اشتعال میں آکر یا کسی وقتی جوش میں آکر اس نے اپنے کئی مخلص دوستوں کو قتل کر ڈالا اور بڑے بڑے شہروں کو ان کے باشندوں سمیت خاک میں ملا دیا۔ اپنے ہاتھوں قائم کیے ہوئے اس عظیم الشان سامراج میں وہ اپنے پیچھے اپنی یادگار کے طور پر کوئی بھی پائدار چیز یہاں تک کہ اچھی سڑکیں بھی نہیں چھوڑ گیا۔ آکاش سے ٹوٹنے والے تارے کی طرح وہ یکایک چمک کر گم ہو گیا۔ اور اپنے بعد سوائے اپنے نام کے اور کوئی یادگار نہیں چھوڑ گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کے خاندان کے لوگوں نے ایک دوسرے کو قتل کر ڈالا۔ اور اس کی یہ عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ سکندر کو فاتحِ عالم کہا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ ایک بار بیٹھا بیٹھا وہ محض اس لیے رو اٹھا تھا کہ اس کے فتح کرنے کے لیے دنیا میں کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ شمال مغرب کے ایک چھوٹے سے علاقے کے علاوہ ابھی سارا ہندوستان فتح کرنے کو پڑا تھا۔ چین اس وقت بھی بڑا ملک تھا اور سکندر اس کے قریب بھی نہیں پہنچ پایا تھا۔

اس کی موت کے بعد اس کے سپہ سالاروں نے اس کی سلطنت کو آپس میں بانٹ لیا۔ مصر بطلیموس کے حصے میں آیا۔ اس نے وہاں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد ڈالی اور اس کا

خاندان وہاں عرصے تک حکومت کرتا رہا۔ اِس کی حکومت میں مصر، جس کی راج دھانی سکندریہ تھی، بہت مضبوط ریاست بن گئی۔ سکندریہ بہت بڑا شہر تھا جو علم و دانش اور فلسفے کے لیے اُس وقت ساری دُنیا میں مشہور ہو گیا تھا۔

ایران، عراق اور ایشیا کوچک کا ایک حصّہ دوسرے سپہ سالار سیلوکس کے حصّے میں آیا۔ ہندوستان کا شمال مغربی حصّہ بھی جسے سکندر نے فتح کیا تھا اسی کو ملا۔ لیکن وہ ہندوستان کے علاقے میں اپنا اقتدار قائم نہ رکھ سکا اور سکندر کی موت کے بعد یونانی فوج یہاں سے بھگا دی گئی۔

سکندر ۳۲۶ قبل مسیح میں ہندوستان آیا تھا۔ اِس کا یہ حملہ ایک ہلّے کی طرح کا تھا، جس کا ہندوستان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اِس ہلّے نے ہندوستانیوں اور یونانیوں میں ربط ضبط پیدا کرنے میں مدد دی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ سکندر سے پہلے بھی مشرق اور مغرب کے ملکوں میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا اور ہندوستان کے تعلقات ایران اور یونان سے برابر قائم تھے۔ سکندر کے آنے سے یہ تعلقات کچھ اور بڑھے ضرور ہوں گے۔ اور ہندوستانی اور یونانی دونوں تہذیبوں میں کچھ زیادہ میل جول پیدا ہوا ہوگا۔ "انڈیا" لفظ یونانی انڈوس سے بنا ہے اور انڈوس کا ماخذ "انڈس"، یعنی سندھ ندی ہے۔

چندر گپت موریہ اور چانکیہ

مگدھ ایک پرانی ریاست تھی۔ یہ اس جگہ بسی ہوئی تھی جہاں اب بہار کا صوبہ ہے۔ اِس ریاست کی راج دھانی پاٹلی پُتر تھی جسے اب پٹنہ کہتے ہیں۔ جس وقت کا ہم ذِکر کر رہے ہیں اُس وقت مگدھ کی ریاست پر نند خاندان کی حکومت تھی۔ جب سکندر نے شمال و مغربی ہندوستان پر حملہ کیا تھا اُس وقت پاٹلی پُتر کے تخت پر ایک نند راجا حکومت کرتا تھا۔ اُس وقت وہاں چندر گپت نام کا ایک نوجوان بھی تھا جو غالباً اس راجا کا کوئی رِشتے دار تھا۔ وہ بہت ہوشیار، حوصلہ مند اور اولوالعزم شخص تھا۔ نند راجا نے اُسے ضرورت سے زیادہ ہوشیار اور اپنے لیے خطرناک سمجھ کر یا اس کی کسی حرکت سے خفا ہو کر اُسے مُلک بدر کر دیا تھا۔ شاید سکندر اور یونانیوں کی کہانیوں سے متاثر ہو کر چندر گپت شمال کی جانب ٹکشلا چلا گیا۔ اُس کے ساتھ وشنو گپت نام کا ایک عالم اور تجربے کار برہمن تھا جسے چانکیہ بھی کہتے ہیں۔ چندر گپت اور چانکیہ دونوں ہی طبیعت سے ایسے انسان نہ تھے جو مقدر کے آگے سرنگوں ہو کر اطمینان کر لیتے ان کے ذہنوں میں بہت سے حوصلہ مندانہ منصوبے پرورش پا رہے تھے۔ وہ آگے بڑھنا اور کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چندر گپت شاید سکندر کے جاہ و جلال سے متاثر ہو گیا تھا اور اسی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا تھا۔ اُس کی خوش قسمتی کہ اُسے چانکیہ جیسا اچھا دوست، بہی خواہ اور صلاح کار مل گیا تھا۔ یہ دونوں ہی ہر وقت خبردار رہتے تھے

اور ٹکشلا کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھتے تھے ۔

بہت جلد وہ موقع آگیا۔ سکندر کے انتقال کی خبر جیسے ہی ٹکشلا پہنچی چندرگپت نے سمجھ لیا کہ اب کچھ کر گزرنے کا وقت آگیا ہے ۔ اُس نے آس پاس کے لوگوں کو اُبھارا اور اُن کی مدد سے یونانیوں کی فوج پر، جسے سکندر چھوڑ گیا تھا حملہ بول دیا اور اُسے مار بھگایا۔ ٹکشلا پر قبضہ کرنے کے بعد چندرگپت اور اُس کے ساتھیوں نے پاٹلی پُتر کی طرف رُخ کیا اور راجا نند کو شکست دے دی یہ ۳۲۱ قبل مسیح یعنی سکندر کے انتقال کے محض پانچ سال بعد کا واقعہ ہے ۔ اسی وقت سے موریہ خاندان کا راج شروع ہوتا ہے ۔ یہ صاف صاف پتہ نہیں چلتا کہ چندرگپت 'موریہ' کیوں کہلایا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اُس کی ماں کا نام "مورا" تھا اس لیے وہ موریہ کہلایا۔ کچھ دوسرے لوگوں کا قیاس ہے کہ اس کا نانا راجا کے موروں کا رکھوالا تھا مور کو سنسکرت میں 'میور' کہتے ہیں ۔ اس لفظ کا ماخذ خواہ کچھ ہو چندرگپت بہرحال اپنے اسی لقب سے مشہور ہے ۔

مہابھارت اور دوسری پُرانی کتابوں اور کتھاؤں میں ہمیں چکرورتی راجاؤں کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے سارے ہندوستان پر راج کیا تھا لیکن ہمیں اُس زمانے کا ٹھیک ٹھیک حال معلوم نہیں اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس وقت بھارت یا بھارت ورش کا علاقہ کتنا پھیلا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ اُس زمانے کے جو قصّے سینہ بہ سینہ چلے آتے ہوں ان میں زمانۂ قدیم کے راجاؤں کی عظمت اور شان و شوکت کو محض بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی کوشش ہی کارفرما رہی ہو۔ بہرحال چندرگپت موریہ کی سلطنت ہندوستان میں مستحکم اور وسیع سلطنت کی پہلی مثال ہے۔ اس کا نظامِ حکومت بہت ترقی یافتہ قسم کا تھا۔

چندرگپت کے دورانِ حکومت میں سکندر کے پہلے گورنر سیلوکس نے، جسے ایشیا کوچک سے لے کر ہندوستان تک کی سلطنت ملی تھی ایک بڑی فوج لے کر سندھ ندی کو پار کرلیا اور ہندوستان پر حملہ کردیا۔ مگر اپنی اس جلد بازی پر اُسے بہت شرمندگی اُٹھانی

پڑی۔ چندرگپت نے اس کے دانت کھٹے کر دیے۔ جس راستے وہ آیا تھا اسی راستے وہ اپنا سا منہ لے کر واپس لوٹ گیا۔ اُلٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔ کابل اور ہرات تک گاندھار (افغانستان) کا ایک بہت بڑا علاقہ چندرگپت کو دینا پڑا۔ چندرگپت نے سیلوکس کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ اس کی سلطنت اب سارے شمالی ہندوستان میں افغانستان کے ایک بڑے حصے کابل سے بنگال تک اور بحرِ عرب سے خلیج بنگال تک پھیل گئی۔ صرف جنوبی ہندوستان اس کے ماتحت نہیں تھا۔ اِس زبردست سلطنت کی راجدھانی پاٹلی پتر تھی۔

سیلوکس نے چندرگپت کے دربار میں میگستھنیز کو اپنا سفیر مقرر کیا۔ میگستھنیز نے اُس زمانے کا بہت ہی دل چسپ حال لکھا ہے لیکن اس سے زیادہ دل چسپ ایک دوسرا تذکرہ بھی ملتا ہے جس میں چندرگپت کے دورِ حکومت کا پورا حال موجود ہے۔ یہ کتاب کوٹلیہ کا "ارتھ شاستر" ہے۔ یہ کوٹلیہ اور کوئی نہیں چانکیہ یا وشنوگپت کا دوسرا نام ہے۔

ارتھ شاستر میں مختلف موضوعات شامل ہیں اور ان پر اتنی تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ اُن سب کے بارے میں پوری پوری باتیں بتانا ممکن نہیں ہے اس میں راجاؤں اور ان کے وزیروں اور مشیر کاروں کے فرائض، دربار داری کے آداب، مختلف انتظامی شعبہ جات، تجارت اور بیوپار، گاؤں اور قصبوں کا نظم و نسق، قانون اور عدالت، سماجی رسم و رواج، عورتوں کے حقوق، معذوروں اور ضعیفوں کی خبرگیری، سیاسیات، کھیتی باڑی، صنعت و حرفت، محصول بندی اور جیلوں تک کا ذکر موجود ہے۔

راجا کو بادشاہی کے اختیارات تاج پوشی کے وقت رعایا سونپتی تھی۔ اس کے بعد اُسے رعایا کی خدمت کے لیے حلف اُٹھانا پڑتا تھا۔ اُسے یہ عہد لینا پڑتا تھا "اگر میں تمہیں ستاؤں تو بھگوان مجھے جنت سے، زندگی سے اور آل و اولاد سے محروم کر دے۔" اِس کتاب میں راجا کے معمولات دیے ہوئے ہیں اُس کے مطابق

راجا کو ضروری کام کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا پڑتا تھا۔ کیوں کہ " رعایا کا کام نہ تو رُک سکتا ہے اور نہ اُسے راجا کی سہولت کا خیال کر کے روک کے رکھا جا سکتا ہے۔" "راجا جس قدر مستعد ہوگا اُس کی رعایا بھی اتنی ہی مستعد ہوگی" اپنی رعایا کی خوشی میں ہی اُس کی خوشی ہے۔ رعایا کی بھلائی میں ہی اُس کی بھلائی ہے۔ جو بات اُسے اچھی لگے اُسے وہ اچھی نہ سمجھے بلکہ رعایا کو جو اچھی لگے اُس کو وہ اچھا جانے۔ یہ ایک قابل لحاظ بات ہے کہ قدیم ہندوستان میں حکمرانی کا مطلب عوام کی خدمت تھا۔ راجاؤں کو نہ تو خداداد حقوق حاصل تھے اور نہ وہ مطلق العنان ہوتے تھے۔ اگر کوئی راجا ظلم کرتا تھا تو رعایا کو اختیار تھا کہ اُسے گدّی سے اُتار دے اور اس کی جگہ دوسرے کو بٹھا دے۔ اُس زمانے میں بادشاہت کے متعلّق یہی تصوّر کارفرما تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ اس وقت بھی ایسے بہت سے راجا ہوئے جو اس اونچے آدرش سے بہت نیچے جا گرے اور جن کی حماقتوں کی وجہ سے اس ملک اور اس قوم پر طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہوئیں۔

ارتھ شاستر میں اِس پُرانے اصول پر بھی زور دیا گیا ہے کہ "آریہ" کبھی غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں کسی نہ کسی صورت میں غلام ضرور ہوا کرتے تھے جو یا ملک کے باہر سے لائے جاتے ہوں گے یا اِسی ملک کے رہنے والے ہوتے ہوں گے۔ لیکن جہاں تک آریوں کا تعلق تھا اس بات کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ وہ کسی بھی حالت میں غلام نہ بنائے جائیں۔

موریہ سلطنت کا پایۂ تخت پاٹلی پُتر تھا۔ یہ بہت شان دار شہر تھا اور گنگا کے کنارے نو میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی شہر پناہ میں ۶۴ بڑے دروازے اور سینکڑوں چھوٹے دروازے تھے۔ مکان زیادہ تر لکڑیوں کے بنے ہوئے تھے اور چوں کہ آگ لگنے کا ڈر رہتا تھا اِس لیے آگ بجھانے کا بہت معقول انتظام تھا۔ خاص خاص سڑکوں پر پانی سے بھرے ہزاروں گھڑے ہر وقت رکھے رہتے تھے۔ ہر ایک گھر گرہست کو بھی اپنے اپنے گھر میں پانی سے بھرے ہوئے گھڑے، سیڑھی کانٹے اور دوسری ضروری چیزیں رکھنی پڑتی تھیں تاکہ ضرورت پڑنے پر ان سے کام لیا جا سکے۔

کوٹلیہ نے شہروں کے بارے میں ایک قاعدے کا بھی ذکر کیا ہے جس کا بیان یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اگر کوئی آدمی سڑک پر کیچڑ اور پانی جمع ہونے دیتا تھا تو اُس پر جرمانہ کیا جاتا تھا۔ اگر ان قاعدوں کی پابندی ہوتی رہی ہوگی تو پاٹلی پُتر یا دوسرے اور شہر یقیناً بہت خوب صورت اور صاف ستھرے رہے ہوں گے۔

پاٹلی پُتر میں شہری انتظام کے لیے ایک میونسپل کونسل تھی تمام شہری اس کونسل کے ممبروں کا انتخاب کرتے تھے۔ اس میں ۳۰ ممبر ہوتے تھے۔ ان میں سے پانچ پانچ ممبروں پر مشتمل چھ کمیٹیاں تشکیل کی جاتی تھیں۔ شہری صنعت و حرفت کی حوصلہ افزائی اور دیکھ ریکھ، مسافروں اور تیرتھ یاتریوں کے آرام اور حفاظت کے انتظامات، فوتی اور پیدائش کے اندراجات اور دوسری چیزوں کا انتظام انھیں کمیٹیوں کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ پوری کونسل صفائی ستھرائی، آمد و خرچ، پانی کا انتظام، باغ باغیچے اور پبلک عمارتوں کی دیکھ ریکھ کا انتظام کرتی تھی۔

انصاف کرنے کے لیے پنچایتیں اور اپیل سُننے کے لیے عدالتیں قائم تھیں۔ قحط زدوں کی مدد کا خاص انتظام ہوتا تھا۔ سرکاری گودام کا آدھا غلّہ قحط زدوں کی ضرورتوں کے لیے ہمیشہ محفوظ رکھا جاتا تھا۔

یہ تھی اُس موریہ سلطنت کی ایک جھلک جس کی آج سے ۲۲ سو سال پہلے چانکیہ اور چندر گپت نے تنظیم کی تھی۔ پاٹلی پُتر کی راج دھانی سے لے کر اس عظیم الشان سلطنت کے بڑے بڑے شہروں اور ہزاروں قصبوں اور گاؤوں تک سارے ملک میں زندگی رواں دواں اور چہل پہل سے بھرپور تھی سلطنت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بڑی بڑی سڑکیں تھیں۔ ایک شاہ راہ پاٹلی پُتر سے شمال مغربی سرحد کو چلی گئی تھی۔ بہت سی نہریں تھیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک محکمہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ جہازرانی کا شعبہ بھی تھا جو بندرگاہوں، گھاٹوں، پُلوں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک آنے جانے والے متعدد جہازوں اور کشتیوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ جہاز سمندر پار چین اور برما تک جاتے تھے۔

اس عظیم الشان سلطنت پر چندر گپت نے ۲۴ سال تک حکومت کی ۲۹۶ قبل مسیح میں اُس کا انتقال ہوا۔

اشوک

اشوک ایک شہنشاہ تو تھا ہی مگر ایک انسان کی حیثیت سے بھی وہ قابلِ قدر تھا۔ وہ چندر گپت موریہ کا پوتا تھا۔ ایچ۔جی۔ویلس نے اس کے بارے میں لکھا ہے :۔

"تاریخ کے صفحات میں دنیا کے ان لاکھوں شہنشاہوں اور حکمرانوں میں جنھیں جہاں پناہ اور اَن داتا وغیرہ کتنے ہی القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان میں تنہا اشوک کا نام ہی آسمان پر درخشاں ستارے کی طرح روشن ہے۔ والگا ندی سے جاپان تک آج بھی اس کا نام عزّت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ چین، تبّت کے علاوہ ہندوستان نے بھی ــــ جو اگرچہ اس کے مذہبی عقائد کو ترک کر چکا ہے ــــ اس کی عظمت کی یادگار کو برقرار رکھا ہے۔"

یہ کسی شہنشاہ کی شان میں مدح سرائی کا بہت اعلیٰ نمونہ ہے، مگر اشوک کی شخصیت اور کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اشوک واقعی اس کا مستحق تھا۔ ہر ہندوستانی کا دل تاریخ کے اس زمانے کو یاد کر کے خوشی سے جھوم اُٹھتا ہے۔

چندر گپت کا انتقال عیسوی سنہ شروع ہونے سے قریب ۳۰۰ سال پہلے ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا بندوسار تخت پر بیٹھا، جس نے ۲۵ سال تک پُرامن طریقے پر حکومت کی۔ یونانیوں سے اُس نے اپنے تعلقات استوار رکھے اُس کے دربار میں مغربی ایشیا کے سیلوکس کے لڑکے اینٹی اوکس اور مصر کے بطلیموس کے سفیر

آتے تھے۔ بیرون ممالک سے تجارت برابر جاری تھی اور کہا جاتا ہے کہ مصر والے اپنے کپڑے ہندوستان کے نیل سے رنگتے تھے اور اپنی ممیوں کو ہندوستانی ململ میں لپیٹ کر رکھتے تھے۔ بہار میں قدیم زمانے کے کچھ آثار ملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ موریہ سلطنت کے پہلے بھی وہاں ایک طرح کا شیشہ بنایا جاتا تھا۔

یہ بات دل چسپ معلوم ہوتی ہے کہ میگستھنیز نے جو چندر گپت کے دربار میں سفیر ہو کر آیا تھا ہندوستان والوں کے ذوق آرائش کی بہت تعریف کی ہے۔ اُس نے اِس بات کا خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ لوگ اپنا قد اونچا کرنے کے لئے اونچی ایڑی کے جوتے پہنا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اونچی ایڑی کا جوتہ کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔

بندوسار کے انتقال کے بعد یعنی ۲۶۸ سال قبل مسیح میں اشوک اُس عظیم الشان سلطنت کا حکمراں ہوا جو سارے شمال اور وسط ہندوستان سے لے کر وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاید ہندوستان کے باقی ماندہ جنوب مشرق اور جنوبی علاقوں کو اپنی سلطنت میں ملانے کی خواہش سے اُس نے اپنی تخت نشینی کے آٹھویں سال کلنگ پر حملہ کیا۔ کلنگ ہندوستان کے جنوبی ساحل پر مہاندی گوداوری اور کرشنا ندی کے درمیان واقع تھا۔ کلنگ والوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر خوف ناک خوں ریزی کے بعد اُنھیں کچل کر رکھ دیا گیا۔ اِس لڑائی اور خوں ریزی نے اشوک کے دل پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اُسے جنگ سے نفرت ہوگئی۔ اُس نے تہیّہ کر لیا کہ آئندہ اب کبھی جنگ نہیں کرے گا۔ جنوب کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو چھوڑ کر قریب قریب سارا ہندوستان اس کے زیر نگیں تھا۔ اس کے لیے اِس چھوٹے سے ٹکڑے کو جیت لینا آسان بات تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ایچ۔ جی۔ ویلس کی تحریر کے مطابق ساری تاریخ میں اشوک ہی ایک ایسا فوجی اور جنگجو شہنشاہ گزرا ہے جس نے فتح کے بعد جنگ سے توبہ کی۔

خوش قسمتی سے ہمیں خود اشوک کے ہی الفاظ میں کچھ ایسے تذکرے مل گئے ہیں جن سے

پتہ چلتا ہے کہ اُس کے خیالات کیا تھے اور اُس نے کیا کیا کام انجام دیے۔ پتھروں اور دھات کے پتروں پر کھُدے ہوئے بہت سے مذہبی کتبوں میں اس کے پیغامات آج بھی محفوظ ہیں، جو اس نے اپنی رعایا اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے نام جاری کیے تھے۔ الٰہ آباد کے قلعے میں اشوک کی ایک ایسی ہی لاٹ ہے۔ ہمارے صوبہ (موجودہ اُتر پردیش) میں ایسی اور بھی کئی لاٹیں موجود ہیں۔

ان مذہبی کتبوں میں اشوک نے بتایا ہے کہ جنگ اور فتح میں ہونے والی خوں ریزیوں نے جنگ کی طرف سے اُس کے دل میں کتنی نفرت پیدا کر دی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ نیک اعمال سے خود اپنے اور دوسرے انسانوں کے دل پر فتح پانا ہی سچی فتح ہے۔ اِن مذہبی کتبوں کو پڑھ کر دل مسرّت سے جھوم اٹھتا ہے اور ان سے اشوک کے جذبات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ایک کتبہ میں لکھا ہے :-

"نیک صفت، دھرم راج مہاراج (اشوک) نے اپنی تخت نشینی کے آٹھویں سال میں کلِنگ کو فتح کیا۔ ڈیڑھ لاکھ آدمی وہاں سے قید کر کے لائے گئے۔ ایک لاکھ وہاں قتل ہوئے اور اس سے کئی گُنا زیادہ مر گئے۔

"کلِنگ کی فتح کے بعد سے ہی دھرم راج (اشوک) بڑے جوش اور انہماک سے دھرم کی تبلیغ و اشاعت میں لگ گئے۔ انھیں اپنی کلِنگ فتح پر بہت پچھتاوا ہوا کیوں کہ کسی ملک کو فتح کرنے کے لیے قتل و غارت گری کرنا اور لوگوں کو قیدی بنانا ضروری ہوتا ہے۔ دھرم راج کو اس بات پر گہرا رنج و ملال ہے"۔

آگے چل کر اسی کتبے میں لکھا ہے کہ کلِنگ میں جتنے آدمی مارے گئے یا قید ہوئے اُس کے دسویں یا ہزارویں حصّے کا بھی مارا جانا یا قید کیا جانا اب اشوک کو برداشت نہ ہوگا۔

"اس کے علاوہ اگر کوئی دھرم راج کے ساتھ بُرائی کرے گا تو وہ اُسے جہاں تک برداشت کیا جا سکے گا، برداشت کریں گے۔ اپنی سلطنت کی جنگلی جاتیوں پر بھی

دھرم راج مہربانی کی نظر رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ لوگ اپنی نیت کو صاف رکھیں کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ دھرم راج کی دلی خواہش ہے کہ تمام جانداروں کی حفاظت ہو اور سب امن و امان کے ساتھ خوش و خرم رہیں۔"

اس کے آگے اشوک بتاتا ہے کہ نیک اعمال (دھرم) سے انسانوں کا دل جیتنا ہی سچی فتح ہے۔ اس نے ہمیں بتایا ہے کہ اُسے ایسی سچی فتح صرف اپنی ہی سلطنت میں نہیں بلکہ دور دراز کی ریاستوں میں بھی نصیب ہوئی۔

جس دھرم کا ان کتبوں میں بار بار ذکر آیا ہے وہ بودھ دھرم ہے۔ اشوک اس مذہب کا بہت جوشا مند پیرو ہو گیا تھا اور اُس نے اِس مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں اپنی ساری قوت صرف کر دی لیکن کسی طرح کی زور زبردستی سے کام نہیں لیا۔ وہ لوگوں کے دلوں کو جیت کر انھیں بودھ مذہب کا پیرو بنانا چاہتا تھا۔ دھرم کے مبلغوں میں ایسے بہت ہی کم لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے اشوک کی طرح دوسرے مذہبوں کی طرف سے اتنی رواداری برتی ہو۔ لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کے لیے مبلغوں نے زور زبردستی آپا دھاپی اور دھوکے بازی سے کام لینے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ ساری تاریخ مذہبی مظالم اور مذہبی لڑائیوں کی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ مذہب اور خدا کے نام پر جتنا خون بہا ہے اتنا شاید ہی کسی دوسرے نام پر بہا ہوگا۔ اِس لیے یہ یاد کر کے خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستان کے ایک سپوت نے جو بہت ہی مذہبی خیال کا واقع ہوا تھا اور جو ایک طاقت ور اور عظیم الشان سلطنت کا مالک و مختار بھی تھا اس نے لوگوں کو اپنے عقیدے کا پابند بنانے میں ایسا اچھا راستہ اختیار کیا۔ تعجب ہے کہ کوئی اتنا بے وقوف ہو کر وہ یہ خیال کرے کہ مذہب اور عقیدہ تلواروں اور سنگینوں کے ڈر سے لوگوں کے دلوں میں اُتارا جا سکتا ہے۔

اس طرح دیوتاؤں کے محبوب یا مذہبی کتبوں کے الفاظ میں "دیوانام پریہ" اشوک نے مغرب میں ایشیا افریقہ اور یورپ کے ممالک میں اپنے پیغامبر اور سفیر

بھیجے۔ اس نے اپنے سگے بھائی مہندر اور بہن سنگھ مترا کو لنکا بھیجا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے ساتھ گیا سے پاک بودھی درخت کی ایک قلم لیتے گئے تھے۔ کہتے ہیں انورودھ پور کے مندر کا درخت اسی پرانی قلم سے اُگا ہے۔

ہندوستان میں بودھ دھرم بہت تیزی سے پھیل گیا۔ اشوک کے نزدیک محض چند پاک کلمات زبان سے ادا کر دیے جانے یا دکھاوے کی پوجا پاٹ اور دوسری رسومات کی پابندی کر لینے کا نام ہی مذہب نہیں تھا بلکہ مذہب تو اس کے نزدیک نام تھا نیکی کا یعنی نیک اعمال کا اور سماج کی بہبود کے کام کرنے کا۔ اس کے اسی نظریے کا فیض تھا کہ سارے ملک میں عوام کے لیے باغ باغیچے، اسپتال، کنویں اور سڑکیں نظر آنے لگیں۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے خاص انتظام کیا گیا تھا۔ اس وقت چار بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ ایک شمال میں پشاور کے پاس ٹکشیلا میں۔ دوسری متھرا میں۔ تیسری وسط ہندوستان میں اُجین میں اور چوتھی پٹنہ کے پاس نالندہ میں۔ ان یونیورسٹیوں میں ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ چین سے لے کر مشرقی ایشیا تک دور دراز کے ملکوں سے طالب علم پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ سارے ملک میں بڑی بڑی خانقاہیں بن گئی تھیں جو 'وِہار' کہلاتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پاٹلی پتر یا پٹنہ کے آس پاس اتنے زیادہ 'وِہار' تھے کہ سارا صوبہ ہی 'وِہار' یا آج کل کی زبان میں بہار کہا جانے لگا۔ لیکن جیسا کہ اکثر ہوتا ہے ان وِہاروں سے گیان اور علم و فضل کی اصلی روح تھوڑے ہی دنوں میں ختم ہو گئی اور یہ ایسے بے جان مرکز بن گئے جہاں کے لوگ محض کچھ بندھے ٹکے معمولات کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ وِہار بھی بس پوجا پاٹ کی لکیر کو پیٹتے رہے۔

جانداروں سے اشوک کی محبت کا دائرہ انسانوں ہی تک محدود نہیں تھا۔ وہ جانوروں کو مارنا بھی پاپ سمجھتا تھا۔ جانوروں کے لیے اسپتال کھولے گئے تھے اور جانوروں کی قربانی دینا بند کرا دیا گیا تھا۔ ان دونوں باتوں میں اشوک ہمارے زمانے سے بھی بہت آگے تھا۔ افسوس کی بات ہے کہ جانوروں کی قربانی دینا کسی حد تک آج بھی جاری ہے اور اسے ایک مذہبی فریضہ بھی سمجھا جاتا ہے۔

اشوک کی دیکھا دیکھی اور بودھ دھرم کی تبلیغ سے لوگوں میں گوشت نہ کھانے کا پرچار ہونے لگا۔ اس وقت تک ہندوستان کے براہمن اور چھتری عام طور سے گوشت کھاتے اور شراب پیتے تھے۔ اشوک کے زمانے میں گوشت اور شراب دونوں کا رواج کم ہوگیا تھا۔

اِس طرح اشوک نے ۳۸ سال تک حکومت کی۔ وہ پُرامن طریقے سے عوام کی بہبود کے کاموں کے لیے جی جان سے کوشش کرتا رہا۔ رفاہِ عام کے کاموں کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اُس کے الفاظ میں ــــ ہر وقت اور ہر جگہ پر ــــ "خواہ میں کھانا کھا رہا ہوں یا حرم میں ہوں اپنی خواب گاہ میں ہوں یا مشیر کاروں کی مجلس میں، گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جا رہا ہوں یا محل کے باغ میں چہل قدمی کر رہا ہوں سرکاری مخبروں کو چاہیے کہ وہ رعایا کے حال کی مجھے برابر خبر دیتے رہیں" اگر کوئی مشکل درپیش آتی تو اس کی خبر فوراً اس تک پہنچانا ضروری ہوتا تھا کیوں کہ اس کا کہنا تھا کہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مجھے ہر دم کام کرنا چاہیے۔

عیسیٰؑ سے ۲۲۶ سال پہلے اشوک کا انتقال ہوگیا۔ موت سے کچھ دن پہلے وہ تخت و تاج چھوڑ کر بودھ بھکشو بن گیا تھا۔

موریہ دورِ حکومت کے آثار اب بہت کم باقی رہ گئے ہیں مگر جو آثار باقی رہ گئے ہیں وہ اب تک کی تحقیق کے مطابق آرین تہذیب کے تقریباً سب سے پرانے نشان ہیں۔ اس وقت ہم موہن جودارو کے کھنڈرات کا ذکر چھوڑے دیتے ہیں۔ بنارس کے پاس سارناتھ میں اشوک کی خوب صورت لاٹ ہے جس کے سر پر شیر بنے ہوئے ہیں۔

اشوک کی راجدھانی پاٹلی پتر کے بڑے شہر کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ پندرہ سو سال پہلے یعنی اشوک کے چھ سو برس بعد فاہیان نام کا ایک چینی سیّاح پاٹلی پتر آیا تھا۔ اُس وقت یہ شہر بہت مال دار، خوش حال اور ترقی یافتہ تھا۔ مگر اُس وقت تک اشوک کا پتھر کا راج محل کھنڈر ہو چکا تھا۔ ان کھنڈرات نے ہی

فاہیان کو بہت متاثر کیا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ یہ راج محل انسانوں کا بنایا ہوا معلوم ہی نہیں ہوتا ہے۔

بڑی بڑی چٹانوں سے بنا ہوا راج محل برباد ہوگیا اور اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑ گیا مگر اشوک کی نیک نامی ایشیا کے اس بڑے برِّاعظم میں آج بھی زندہ ہے اور اُس کے مذہبی کتبات میں ایسی باتیں لکھی ہوئی ہیں جن کو ہم سمجھ سکتے ہیں اور جن کی قدر و قیمت کا ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آج بھی ہم اُن سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ اور عیسائی مذہب

عیسیٰ مسیح کا قصہ انجیل کے نئے عہد نامے میں موجود ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سے متعلق ان قصوں میں اُن کی جوانی کے دنوں کا کوئی حال نہیں دیا گیا ہے۔ وہ ناصرہ میں پیدا ہوئے۔ گلیلی میں انھوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی اور تیس سال سے کچھ زیادہ کی عمر میں وہ بیت المقدس آئے۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد رومن گورنر پانٹیس پائلٹ کے سامنے ان کا مقدمہ پیش ہوا۔ اُس نے ان کو سزا کا حکم سُنا دیا۔ یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کیا کرتے تھے۔ یا کہاں کہاں گئے تھے۔ سارے وسط ایشیا میں، کشمیر میں، لداخ اور تبت میں، اور اس سے اور بھی شمال کے ملکوں میں ابھی تک لوگوں کو کامل یقین ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ان ملکوں میں تشریف لائے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ ہندوستان بھی تشریف لائے تھے۔ یقینی طور سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن جن عالموں نے حضرت عیسیٰؑ کی سوانح کا مطالعہ کیا ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کا ہندوستان یا وسط ایشیا آنا تسلیم نہیں کرتے۔ بہر حال ان کا ان ملکوں میں آنا ناممکنات میں نہیں ہو سکتا۔ اُس زمانے میں ہندوستان کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں، خاص طور سے شمال مغرب میں تکشیلا کی یونیورسٹی، ایسی تھیں کہ دور دراز کے ملکوں سے حوصلہ مند طالب علم کھنچ کھنچ کر یہاں آتے تھے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بھی علم و دانش کی تلاش میں یہاں آئے ہوں۔ بہت سے معاملوں میں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات گوتم بدھ کی

تعلیمات سے اتنی مشابہ ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو گوتم بدھ کی تعلیمات کا علم رہا ہو۔ لیکن صرف اتنی سی بات اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ہندوستان ضرور تشریف لائے تھے۔ یہ اِس لیے بھی کہ بُدھ مذہب اس وقت تک دوسرے ممالک میں کافی مقبول ہو چکا تھا۔ عین ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو ہندوستان سے باہر ہی ان کی معلومات ہو گئی ہو۔

مذہب کے نام پر اختلافات اور خوف ناک جنگیں ہوئی ہیں مگر دنیا کے مختلف مذہبوں کی ابتدا پر غور کرنے اور ان کا باہم موازنہ کرنے سے بہت سی دل چسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ سب مذہبوں کے نظریوں اور اصولوں میں اتنی یکسانیت ہے کہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لوگ چھوٹی چھوٹی اور غیر ضروری باتوں کے بارے میں حُجّت و تکرار اور خون خرابے کی حماقتیں کیوں کرتے ہیں۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ پُرانے اصولوں میں نئی نئی باتیں جوڑ دی جاتی ہیں اور ان کی شکل کچھ اس قدر مسخ کر دی جاتی ہے کہ ان کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور سچے مذہبی مبلغوں کی جگہ تنگ دل اور ہٹھ دھرمی لوگ آ بیٹھتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ یہودی تھے۔ یہودی ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز حد تک جد و جہد کرنے والی قوم تھی اور اب بھی ہے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے وقت میں کچھ زمانے تک شان و شوکت کے دن گزارنے کے بعد اس قوم کے بُرے دن آ گئے۔ یہ شان و شوکت کچھ بہت معمولی درجے کی تھی۔ مگر اپنے تصور میں انھوں نے اسے مبالغے کی حد تک بڑھا چڑھا دیا۔ حتّٰی کہ وہ ان کے لیے ماضی کا سُنہری دور بن گیا۔ اور وہ یقین کرنے لگے کہ وہ زمانہ ایک وقت معیّنہ پر پھر واپس لوٹے گا اور اُس وقت یہودی قوم دوبارہ طاقت ور اور عظیم الشان قوم بن جائے گی۔ وہ لوگ سارے رومن سامراج میں اور دوسرے ملکوں میں پھیل گئے۔ اور اپنے اس یقینِ کامل کی بنیاد پر باہم مضبوطی سے بندھے رہے کہ اُن کے اچھے دن آنے والے ہیں اور ایک مسیحا انھیں وہ دن دکھائے گا۔

یہودی ایک مسیحا کے منتظر تھے اور شاید حضرت عیسیٰؑ سے انھیں اسی طرح کی امید تھی۔
لیکن بہت جلد ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ حضرت عیسیٰؑ رائج طور طریقوں اور سماجی نظام
کے خلاف بغاوت کی بالکل نئی باتیں کرتے تھے۔ خاص طور سے وہ امیروں اور ان بہانہ سازوں
کے خلاف تھے جنھوں نے خاص طرح کی عبادتوں اور ریاضتوں کو ہی مذہب کا نام دے رکھا
تھا۔ دولت و حشمت کی امیدیں دلانے کے بجائے انھوں نے بہشت کی ایک غیر واضح
اور تخیلی حکومت کی خاطر لوگوں سے اپنے گھر کے اثاثے تک کو قربان کرنے کی بات کہی۔
ان کی باتیں تمثیلوں اور کہانیوں کی شکل میں ہوا کرتی تھیں لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ
جنم سے ہی باغی طبیعت لے کر دنیا میں آئے تھے۔ اور زمانے کی ابتری کی حالت کو برداشت
نہیں کر سکتے تھے اور اُسے بدلنے پر آمادہ تھے۔ یہ وہ بات نہ تھی جو یہودی چاہتے تھے
اس لیے ان میں سے بہت سے لوگ ان کے خلاف ہو گئے اور ان کو گرفتار کر کے رومن
حکمرانوں کے حوالے کر دیا۔

مذہبی معاملات میں رومن لوگ غیر روادار واقع نہیں ہوئے تھے۔ اس سامراج میں
سب مذہبوں کو روا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی رومن دیوی دیوتا کو برا بھلا کہتا یا گالیاں
دیتا تو اُسے سزا بھی نہیں دی جاتی تھی۔ "ٹائبرس نام کے ایک رومن شہنشاہ نے کہا تھا کہ
اگر کوئی دیوتا کی بے حرمتی کرتا ہے تو وہ اس سے خود ہی نبٹ لیں گے۔ اس لیے جب
رومن گورنر پانٹیس پائلٹ کے سامنے حضرت عیسیٰؑ پیش کیے گئے ہوں گے تو اُسے بھی
اِس معاملے کے مذہبی پہلو کی مطلق پرواہ نہ ہوئی ہوگی۔ حضرت عیسیٰؑ کو لوگ ایک
سیاسی باغی اور یہودی لوگ ایک سماج دشمن آدمی سمجھتے تھے۔ اور یہی فردِ جرم عاید کر کے
ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور سزا کے طور پر انھیں گولگوتھا نامی مقام پر صلیب دے دی گئی۔
مصیبت کی اِس گھڑی میں ان کے چنیدہ شاگردوں تک نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔
انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنا پیرو مرشد ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ اِس دغابازی نے
حضرت عیسیٰؑ کی تکلیف کو ناقابلِ برداشت بنا دیا۔ مرنے سے پہلے دل کو ہلا دینے والے
یہ دردناک کلمات ان کی زبان سے نکل پڑے۔ "میرے خدا! میرے خدا! تو نے مجھے

کیوں چھوڑ دیا ہے۔"

موت کے وقت حضرت عیسیٰؑ جوان ہی تھے۔ ان کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی۔ جب ہم انجیل کی خوب صورت زبان میں ان کی موت کی دل فگار کہانی پڑھتے ہیں تو ہمارا دل پسیج جاتا ہے۔ بعد کے زمانے میں عیسائی مذہب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اُس نے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں حضرت عیسیٰؑ کے نام سے عقیدت پیدا کر دی۔ حالاں کہ وہ لوگ ان کی تعلیمات پر بہت کم عمل پیرا ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس وقت حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دی گئی تھی اُس وقت ان کا نام فلسطین سے باہر کے لوگ بہت کم جانتے تھے۔ روم کے لوگ تو ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور پانٹیس پائلٹ نے اِس حادثے کو بالکل ہی کوئی اہمیت نہ دی ہوگی۔

حضرت عیسیٰؑ کے تمام پیرو اور شاگردوں نے خوف کی وجہ سے انھیں اپنا پیر و مُرشد ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ کی موت کے کچھ ہی دنوں بعد پال نام کے ایک نئے معتقد نے، جس نے حضرت عیسیٰؑ کو خود نہیں دیکھا تھا، اپنی سمجھ کے مطابق عیسائی اصولوں کی تبلیغ کرنا شروع کر دی۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ جس عیسائیت کی پال نے تبلیغ شروع کی وہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے کچھ مختلف ہے۔ پال ایک قابل اور سالم آدمی تھا لیکن وہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح سماج کے خلاف جہاد کرنے والا نہیں تھا۔ بہر حال پال کامیاب ہوا اور عیسائی مذہب رفتہ رفتہ پھیلنے لگا۔ رومن لوگوں نے شروع میں اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ انھوں نے سمجھا کہ عیسائی بھی یہودیوں ہی کا کوئی فرقہ ہے۔ لیکن عیسائیوں کی ہمت اور جُراُت بڑھنے لگی۔ وہ دوسرے تمام مذہبوں کے کٹر مخالف بن گئے اور انھوں نے شہنشاہ کے بُت کی پرستش سے انکار کر دیا۔ رومن لوگ ان کے اس جذبے کو اور اپنی سمجھ میں ان کی اس تنگ نظری کو سمجھ نہیں سکے۔ اس لیے وہ عیسائیوں کو خبطی، باغی اور غیر مہذب اور انسانی ترقی کا دشمن سمجھنے لگے۔ عیسائیت کو ایک مذہب کی حیثیت سے برداشت کرنے پر شاید وہ تیار ہو جاتے مگر شہنشاہ کے بُت کی پرستش سے انکار کرنا حکومت کے خلاف بغاوت پر محمول کیا گیا اور

اس کی سزا سزائے موت قرار پائی۔ نتیجے کے طور پر عیسائی طرح طرح سے ستائے جانے لگے۔ ان کی جائدادیں ضبط کی جانے لگیں۔ انھیں شیروں کا لقمہ بنایا جانے لگا۔ لیکن جب کوئی شخص کسی اصول کی خاطر جان دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور ایسی موت اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہے تو اُسے یا اُس کے اصول کو دبانا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رومن سامراج عیسائی مذہب کو دبانے میں ناکام رہا۔ برخلاف اس کے اس لڑائی میں عیسائی مذہب کو فتح نصیب ہوئی۔ اور چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں ایک رومن شہنشاہ نے بھی عیسائی مذہب قبول کر لیا اور عیسائی مذہب رومن حکومت کا شاہی مذہب بن گیا۔ اس شہنشاہ کا نام کانسٹنٹائن تھا جس نے قسطنطنیہ آباد کیا۔

عیسائی مذہب جوں جوں پھیلا حضرت عیسیٰؑ کے روحانی مرتبے کے بارے میں زبردست چپقلشیں پیدا ہو گئیں۔ گوتم بدھ نے کبھی پیغمبری کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ایک دیوتا اور اوتار کی حیثیت سے پوجے جانے لگے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے بھی خدائی کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے جو بار بار کہا ہے کہ وہ خدا کے بیٹے اور انسان کے بیٹے ہیں اس کا لازمی طور سے یہ مطلب نہیں ہے کہ انھوں نے خدائی کا یا انسانوں سے برتر ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن اپنے بڑے آدمیوں کو دیوتا کا روپ دے دینا اور دیوتا کا مقام دے کر ان کی تعلیمات کو ترک کر دینا شاید انسانی خصلت میں داخل ہو چکا ہے۔ چھ سو سال بعد پیغمبر حضرت محمدؐ صاحب نے ایک اور بڑا مذہب چلایا۔ لیکن شاید ان تجربوں سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے صاف صاف اور بار بار یہ تاکید کی کہ وہ محض انسان ہیں خدا ہرگز نہیں ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے بجائے عیسائی لوگ حضرت عیسیٰؑ کی پیغمبرانہ شان و شوکت اور تثلیث کے مسئلے پر بحث مباحثے اور حجت و تکرار کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کو بدعتی کہنے لگے ایک دوسرے پر مظالم کرنے لگے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے۔

عیسائیت کو طاقت حاصل ہونے کے ساتھ ہی اس کے اندرونی جھگڑے بھی

بڑھتے گئے۔ عیسائی مذہب کے مختلف فرقوں میں اسی طرح کے جھگڑے بعض مغربی ملکوں میں کچھ عرصہ پہلے تک ہوتے رہے ہیں۔

یہ معلوم کرکے تعجب ہوتا ہے کہ انگلینڈ میں یا مغربی یورپ میں پہنچنے کے بہت پہلے، جب کہ روم میں اُسے ایک حقیر اور غیر قانونی فرقہ قرار دیا جاتا تھا، عیسائی مذہب ہندوستان میں آپہنچا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی موت کے قریب سو سال کے اندر عیسائی مبلغین بحری راستوں سے جنوبی ہندوستان آئے تھے۔ یہاں ان کے ساتھ بہت رواداری کا سلوک کیا گیا اور انھیں اپنے نئے مذہب کی تبلیغ کی اجازت دے دی گئی۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو اپنے مذہب کا پیرو بنایا اور یہ لوگ اُس وقت سے آج تک جنوبی ہندوستان میں زمانے کی اونچ نیچ دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ عیسائی مذہب کے ان قدیم فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کا اب یورپ میں نام ونشان تک باقی نہیں رہا ہے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے آج کل عیسائی مذہب کا بول بالا ہے۔ کیوں کہ وہ یورپ کی ان قوموں کا مذہب ہے جن کا آج دنیا میں طوطی بولتا ہے۔ لیکن اہنسا کے علمبردار اور رائج سماجی نظام کے خلاف آواز بلند کرنے والے باغی حضرت عیسیٰؑ کا مقابلہ جب ہم ان کے آج کے ان نام نہاد پیرووں سے کرتے ہیں جو سامراجی ریشہ دوانیوں، اسلحہ بندی، جنگ وغارت گری اور دولت کی پرستش کا شکار ہو رہے ہیں تو یہ خیال ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے" ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا"۔ حضرت عیسیٰؑ کی ان نصیحتوں میں جو انھوں نے پہاڑ پر دی تھیں اور آج کل کی یورپ اور امریکہ کی عیسائیت میں کتنا حیرت انگیز فرق ہے۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر بہت سے لوگ یہ سوچنے لگیں کہ آج کل مغرب میں اپنے آپ کو حضرت عیسیٰؑ کا پیرو کہنے والے بیشتر لوگوں کے مقابلے میں باپو (مہاتما گاندھی) حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے زیادہ قریب ہیں۔

گپت شہنشاہ

شمالی ہندوستان میں عجیب ہلچل مچی ہوئی تھی ۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن پر بیشتر شک، سیدی ین یا ترک نسل کے لوگ حکومت کیا کرتے تھے ۔ یہ لوگ ہندوستان کی شمالی مغربی سرحدوں کو پار کرکے یہاں آئے تھے ۔ یہ بدھ مذہب کے ماننے والے تھے اور ہندوستان میں دشمنوں کی طرح حملہ آور بن کر نہیں بلکہ یہاں بس رہنے کے مقصد سے آئے تھے ۔ ہندوستان میں آکر ان لوگوں نے ہندوستانی آریوں کے آداب و اطوار بہت کچھ اختیار کر لیے یہ لوگ ہندوستان کو تہذیب و تمدن اور مذہب کا گہوارہ مانتے تھے ۔ یہ ہندوستانی آریوں کی طرح آداب و اطوار برتنے کی کوشش کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس ملک کے رہنے والے ان کا غیر ملکی ہونا بھول جائیں۔ اس میں انھیں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ۔ مگر پوری طرح نہیں کیوں کہ چھتریوں کے دل میں یہ بات خاص طور سے کھٹکتی تھی کہ غیر ملکی لوگ ان پر حکومت کر رہے ہیں ۔ وہ اس غیر ملکی حکومت کی ماتحتی سے تلملاتے تھے جس سے بے چینی بڑھتی گئی اور لوگوں کے دلوں میں غم و غصّہ پیدا ہونے لگا ۔ بالآخر ان غیر مطمئن لوگوں کو ایک قابل رہنما مل گیا اور اس کے پرچم کے نیچے انھوں نے آریہ ورت (ہندوستان) کو آزاد کرانے کے لیے جہاد شروع کر دیا ۔

اس رہنما کا نام چندر گپت تھا ۔ وہ پاٹلی پتر کا ایک چھوٹا سا راجا تھا ۔ یہ

اشوک کی موت کے ۵۲۴ سال بعد یعنی ۳۲۰ء کی بات ہے۔

چندر گپت بہت اولوالعزم اور قابل انسان تھا۔ وہ شمال کے تمام آریائی راجاؤں کو اپنے ساتھ ملانے اور ان سب کا ایک وفاق بنانے میں لگ گیا۔ اس نے مشہور اور طاقت ور لچھوی خاندان کی لڑکی کمار دیوی سے شادی کی اور اس طرح اس طاقت ور خاندان کا تعاون حاصل کرلیا۔ اسی طرح بہت ہوشیاری سے زمین ہموار کرنے کے بعد چندر گپت نے ہندوستان کے تمام غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ چھتری اور آریہ نسل کے اونچے طبقے کے لوگ جن کے عہدے اور اختیارات غیر ملکیوں نے چھین لیے تھے، اِس جہاد کے حامی تھے۔ بارہ سال کی لڑائی کے بعد چندر گپت شمالی ہندوستان کے کچھ حصّوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ جس میں وہ حصّہ بھی شامل تھا جو آج کل اُتر پردیش کہلاتا ہے۔ اس کے بعد وہ "راج راجیشوری" کا لقب اختیار کرکے تخت نشین ہوا۔

اس طرح گپت خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ خاندان تقریباً دو سو سال تک حکومت کرتا رہا۔ کچھ حد تک یہ زمانہ زبردست ہندویت یا ہندو قومیت کا زمانہ تھا۔ ترکی پارتھو وغیرہ غیر آریائی اور غیر ملکی حکمرانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا اور انھیں زبردستی نکال باہر کیا گیا۔ اس طرح ہم یہاں نسلی تعصب کارفرما دیکھتے ہیں۔ اونچے طبقے کے ہندوستانی آریوں کو اپنی قوم پر فخر تھا۔ وہ ان غیر مہذب بربر اور ملیچھ ذات کے لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ گپتوں نے جن ہندوستانی آریائی ریاستوں اور راجاؤں کو ختم کیا ان کے ساتھ رعایت برتی۔ لیکن غیر آریوں کے ساتھ کوئی رعایت روا نہیں رکھی گئی۔

چندر گپت کا لڑکا سمدر گپت اپنے باپ سے بھی زیادہ جنگ جو اور بہادر تھا۔ وہ بہت بڑا سپہ سالار تھا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے سارے مُلک میں یہاں تک کہ جنوب میں بھی، اپنی فتح کا پرچم لہرایا۔ اس نے گپت سلطنت کو اس قدر وسعت دی کہ وہ ہندوستان کے بہت بڑے حصّے میں پھیل گئی۔ لیکن جنوب میں اس کی

حکومت بس نام نہاد ہی تھی۔ شمال میں اس نے کشان لوگوں کو سندھ کے اُس پار کھدیڑ کر بھگا دیا۔

سمُدر گپت کے لڑکے چندر گپت دوئم نے کاٹھیاواڑ اور گجرات کو فتح کرلیا جو بہت زمانے سے شک یا ترک خاندان کے زیر حکومت چلے آرہے تھے۔ اس نے اپنا نام "وکرمادیتہ" رکھا اور اسی نام سے وہ آج تک مشہور بھی ہے۔ لیکن یہ نام بھی سیزر (قیصر) کی طرح بہت سے شہنشاہوں کا لقب بن گیا۔ اس لیے اس نام سے بہت سی اُلجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔

دلّی میں قطب مینار کے پاس ایک بہت بھاری لوہے کی لاٹ ہے۔ کہتے ہیں کہ وکرمادیتہ نے اس لاٹ کو فتح کے نشان کے طور پر بنوایا تھا۔ یہ لاٹ فن کاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس کی چوٹی پر کنول کا پھول بنا ہوا ہے جو گپت سلطنت کی سرکاری مُہر تھا۔

گپت سلطنت کا دَور ہندوستان میں ہندو سامراج کا دَور تھا۔ اس دَور میں قدیم آریائی تہذیب اور سنسکرت علوم کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ سنسکرت سرکاری زبان تھی۔ ان دنوں بھی وہ عوام کی بول چال کی زبان نہ تھی۔ عام بول چال کی زبان پراکرت کی ایک شکل تھی جو سنسکرت سے کافی ملتی جلتی تھی۔ سنسکرت کو عام بول چال کی زبان نہ ہونے کے باوجود کافی مقبولیت حاصل تھی۔ اس زمانے میں سنسکرت شعر و ادب، ناٹک اور آرٹ کی خوب ترقی ہوئی۔ جس سُنہری دور میں وید و رامائن اور مہابھارت وغیرہ عظیم شاہکاروں کی تشکیل ہوئی تھی۔ اُس کے بعد سنسکرت شعر و ادب کی تاریخ میں شاید اسی زمانے میں سب سے زیادہ اور سب سے خوب صورت ادب کی تشکیل ہوئی۔ سنسکرت کا مایۂ ناز اور بے مثل شاعر کالی داس اسی زمانے میں ہوا۔ کہتے ہیں وکرمادیتہ کے دربار میں بہت شان و شوکت رہتی تھی۔ جو اُس زمانے کے مشہور ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کا مرکز بن گیا تھا۔

سمُدر گپت اپنا دارالسلطنت پاٹلی پُتر سے ایودھیا لے گیا۔ شاید اس کا یہ

خیال تھا کہ اس کے کٹر آریائی عقیدے اور نظریے کے لیے ایودھیا نگری زیادہ موزوں ہو سکتی ہے جسے شاعر اعظم بالمیک نے اپنی لاثانی رزمیہ داستان (راماین) میں رام چندر جی کی کہانی کے ساتھ امر بنا دیا ہے۔

یہ قدرتی بات تھی کہ گپت راجاؤں نے آریائی تہذیب اور ہندو مذہب کو دوبارہ عروج دیا۔ بودھ مذہب کے بارے میں ان کا اچھا رویہ نہ تھا۔ اس کی کچھ وجہ تو یہ تھی کہ یہ تحریک اونچے طبقے سے متعلق تھی۔ اور اُسے امداد دینے والے چھتری سردار تھے جو بودھ مذہب کے عوامی رجحانات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ بودھ مذہب کے حامیان فرقے کا گستان اور شمالی ہندوستان کے دوسرے غیر ملکی حکمرانوں سے قریبی تعلق تھا۔ لیکن یہ بات کہ بودھ مذہب پر کوئی ظلم کیا گیا ہو اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ بودھ وِہار (خانقاہیں) قائم تھے اور بڑی بڑی درس گاہیں اُس وقت بھی موجود تھیں۔ گپت حکمرانوں کے لنکا کے حکمرانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے جب کہ وہاں بودھ مذہب کا بول بالا تھا۔ لنکا کے راجا میگھ وان نے سمُدر گپت کے پاس بیش قیمت تحائف بھیجے تھے اور اس نے سنہالی طالب علموں کے لیے گیا میں ایک وِہار بھی بنوایا تھا۔

لیکن ہندوستان سے بودھ مذہب رفتہ رفتہ مٹنے لگا۔ یہ حالت اس لیے نہیں پیدا ہوئی کہ برہمنوں نے یا اُس وقت کی حکومت نے اس کے اوپر کوئی پابندی عاید کی تھی یا کوئی دباؤ ڈالا تھا بلکہ اس لیے کہ ہندو مذہب کے اندر اُسے رفتہ رفتہ ہضم کرنے کی قوت موجود تھی۔

اسی زمانے میں چین کا ایک مشہور سیاح فاہیان ہندوستان آیا۔ بودھ مذہب کا پیرو ہونے کی حیثیت سے وہ بودھ مذہب کی مقدس کتابوں کی تلاش و جستجو میں یہاں آیا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ مگدھ کے لوگ خوش حال تھے۔ عدل و انصاف میں بہت فیاضی برتی جاتی تھی۔ موت کی سزا نہیں تھی۔ گیا ویران اور اُجڑا ہوا تھا۔ کپل وستو اُجاڑ ہو چکا تھا۔ لیکن پاٹلی پتر کے لوگ دولت مند، خوش حال اور نیک تھے۔ بڑے بڑے

اور خوش حال بودھ وِہار بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ شاہراہوں پر مسافر خانے تھے جہاں مسافروں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ اور سرکاری خرچ سے کھانا دیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں خیراتی شفا خانے تھے۔

ہندوستان کی سیاحی کرنے کے بعد فاہیان لنکا گیا اور وہاں اُس نے دو سال گزارے۔ لیکن اُس کے ایک ساتھی تاؤچِنگ کو ہندوستان اتنا پسند آیا اور بودھ بھکشوؤں کی مذہبی روایات کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اُس نے یہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ فاہیان بحری راستے سے لنکا ہوتا ہوا چین کو روانہ ہوا۔ راستے میں بہت سی مشکلات جھیلتا ہوا کئی سال میں وہ اپنے ملک واپس پہنچا۔

چندر گپت ثانی یا وکرمادیتہ نے ۲۲ سال حکومت کی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے کمار گپت نے چالیس سال تک حکومت کی۔ پھر ۴۵۳ء میں اسکند گپت تخت پر بیٹھا۔ اسے ایک نئے خطرے کا سامنا کرنا پڑا جس نے بالآخر اس عظیم الشان سلطنت کی کمر ہی توڑ دی۔

اجنتا کے غاروں کی دیواروں پر بنے ہوئے نقش و نگار اور ان کے بڑے بڑے کمرے اور عبادت خانے گپت دورِ حکومت کی فن کاری کے نمونے ہیں۔ انھیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں کتنا انوکھا پن ہے۔ بدقسمتی سے وہاں کی تصویریں رفتہ رفتہ مٹتی جارہی ہیں کیوں کہ موسم کی تبدیلیوں کو وہ اور بہت دن نہیں جھیل سکتی ہیں۔

چندر گپت اوّل، قسطنطنیہ بسانے والے رومن شہنشاہ کانسٹنٹائن کا ہم عصر تھا۔ سمدر گپت کو کچھ لوگ ہندوستان کا نپولین کہتے ہیں۔ لیکن اولوالعزم اور حوصلہ مند انسان ہوتے ہوئے بھی اُس نے ہندوستان کی سرحدوں سے باہر کے ملکوں کو فتح کرنے کا کبھی خیال نہیں کیا۔

گپت دورِ حکومت سلطنت کی توسیع اور فتوحات کا دور تھا۔ ہر ایک ملک کی تاریخ میں ایسے زمانے بار بار آتے رہتے ہیں مگر بعد میں ان کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی ہے۔ لیکن گپت دورِ حکومت کی خصوصیت جس کے لیے وہ ہندوستان میں فخر کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے اس بات میں ہے کہ اِس دور میں فنون و ادب کو بہت حیرت انگیز ترقی ہوئی۔

ہرش وردھن اور ہوان سانگ

کانپور سے تھوڑی دُور پر قنوج نام کا ایک قصبہ ہے۔ کانپور آج تو ایک بڑا شہر ہے جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس وقت قنوج ایک بڑا دارالسلطنت تھا اور اپنے شاعروں، فن کاروں اور فلسفیوں کے لیے مشہور تھا۔ کانپور کا اُس وقت تک نام و نشان بھی نہیں تھا اور نہ سینکڑوں سال تک اُس کے پیدا ہونے کے آثار ہی تھے۔

قنوج نیا نام ہے۔ اس کا اصلی نام "کانیہ کبج" یا کبڑی لڑکی ہے۔ قصّہ مشہور ہے کہ پُرانے زمانے میں کسی رِشی نے اِس وہم میں کہ اس کی بےعزتی کی گئی ہے غصّے میں ایک راجا کی سو لڑکیوں کو بد دُعا دے دی جس سے وہ سب کی سب کبڑی ہو گئیں۔ اُسی وقت سے یہ شہر کبڑی لڑکیوں کا شہر یعنی "کانیہ کبج" کہا جانے لگا۔

لیکن اختصار کے لیے ہم اسے قنوج ہی کہیں گے۔ ہُنوں نے قنوج کے راجا کو مار ڈالا اور اُس کی ملکہ راج شری کو قید کر لیا۔ راج شری کا بھائی راج وردھن اپنی بہن کو آزاد کرانے کے لیے ہُنوں سے لڑنے آیا۔ اُس نے ہُنوں کو تو شکست دے دی لیکن دھوکے سے خود مارا گیا۔ اس پر اس کا چھوٹا بھائی ہرش وردھن اپنی بہن کی تلاش میں نکلا۔ یہ بےچاری کسی طرح نکل کر پہاڑیوں میں جا چھپی تھی۔ اور روز روز کی مصیبتوں سے تنگ آکر خودکشی کا ارادہ کر چکی تھی۔ کہتے ہیں وہ آگ میں جلنے جا رہی تھی کہ ہرش نے اُسے ڈھونڈھ نکالا اور اس کی جان بچائی۔

اپنی بہن کو صحیح وسلامت بچالانے کے بعد ہرش نے پہلا کام یہ کیا کہ اس ذلیل راجا کو جس نے اس کے بھائی کو دھوکے سے مار ڈالا تھا سزا دی۔ اس نے اُسے صرف سزا ہی نہیں دی بلکہ سارے شمالی ہندوستان کو بھی۔ خلیج بنگال سے بحرِ عرب تک اور جنوب میں وندھیاچل پہاڑ تک، فتح کر لیا۔ وندھیاچل کے بعد چالکیہ سلطنت تھی اور ہرش وردھن کو یہاں رُک جانا پڑا۔

ہرش وردھن نے قنوج کو اپنی راج دھانی بنایا۔ وہ خود شاعر اور ڈراما نگار تھا؛ اس وجہ سے اس کے گرد شاعروں اور فن کاروں کا ایک حلقہ جمع ہوگیا تھا۔ قنوج کی اس وجہ سے بڑی شہرت تھی۔ ہرش بودھ مذہب کا سچا پیرو تھا۔ اس وقت بودھ مذہب ایک آزاد اور جُداگانہ مذہب کی حیثیت سے ہندوستان میں کافی کمزور پڑ چکا تھا۔ برہمن اُسے اپنے مذہب کے اندر ضم کرتے جا رہے تھے۔ ہرش ہندوستان کا آخری بودھ شہنشاہ ہوا ہے۔

ہرش کے دورِ حکومت میں ہوان سانگ ہندوستان آیا تھا اور اس کے سفرنامے میں جو اُس نے ہندوستان سے واپس جانے پر لکھا تھا، ہندوستان اور وسط ایشیا کے ان ملکوں کا بہت کچھ حال ملتا ہے جن سے ہوکر وہ ہندوستان پہنچا تھا۔ ہوان سانگ ایک مذہبی قسم کا بودھ تھا۔ وہ بودھ مذہب کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے اور اس مذہب کی مقدس کتابوں کو اپنے ساتھ لے جانے کی غرض سے ہندوستان آیا تھا۔ گوبی کے ریگستان کو پار کر کے وہ ہندوستان پہنچا تھا۔ راستے میں اس نے تاشقند، سمرقند، بلخ، ختن، یارقند وغیرہ کئی مشہور مقامات کی سیاحی کی تھی۔ وہ سارے ہندوستان میں گھوما اور شاید لنکا بھی گیا۔ اُس کی کتاب بہت ہی دل چسپ باتوں اور عجوبہ روزگار چیزوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں اُن تمام ملکوں کی سچی تصویر ملتی ہے جہاں جہاں ہوان سانگ گیا تھا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے باشندوں کی کردارنگاری میں تو اس نے غضب کے مشاہدے کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کردار آج بھی زندہ اور بولتے بات کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی کتاب میں کتنی ہی انمول کہانیاں محفوظ ہیں۔ جو ہوان سانگ

نے یہاں سُنی تھیں۔ یہ کہانیاں مہاتما بدھ اور بودھی ستو کی کرامات سے متعلق ہیں۔
ہوان سانگ نے ہندوستان میں کئی سال گزارے۔ خاص طور سے پاٹلی پتر کے پاس نالندہ کی یونیورسٹی میں اُس نے کافی دن گزارے۔ کہتے ہیں نالندہ میں جس کی حیثیت ایک ساتھ خانقاہ اور یونیورسٹی دونوں کی تھی، دس ہزار طالب علم اور بھکشو رہا کرتے تھے۔ یہ بودھ علوم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اور بنارس جو اُس وقت ہندو (برہمن) علوم کا مرکز تھا اس کا ہم پلہ سمجھا جاتا تھا۔

ہوان سانگ ۶۲۹ء میں ہندوستان آیا۔ چین سے جب اس نے اپنا سفر شروع کیا اس وقت اس کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ ایک قدیم چینی کتاب میں لکھا ہے کہ ہوان سانگ بہت حسین اور دراز قامت انسان تھا۔ اس کا رنگ دل کش اور آنکھیں چمک دار تھیں۔ چال ڈھال سے سنجیدگی اور شان وشوکت ٹپکتی تھی۔ اس کے چہرے پر غضب کی کشش تھی ــــــ اس میں دنیا کی چاروں طرف سے گھیر رکھنے والے سمندر کی سی گہرائی اور سنجیدگی تھی اور پانی میں پیدا ہونے والے کنول کی دل کشی اور ٹھنڈک تھی۔

بودھ بھکشوؤں جیسا زعفرانی بانا پہن کر وہ تن تنہا اتنے مشکل سفر پر نکل پڑا۔ حالاں کہ چینی شہنشاہ نے اُسے اجازت نہیں دی تھی۔ اس نے گوبی کا ریگستان پار کیا اور جب یہ سب مشکلات جھیل کر طرخان کی ریاست میں پہنچا۔ جو اس ریگستان کے کنارے پر واقع تھی اُس وقت اس کی جان کے سوا اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ طرخان کا ریگستانی ملک تہذیب وتمدن کا چھوٹا سا مرکز ایک عجیب وغریب قسم کا "نخلستان" تھا۔ آج یہ ایک ویران جگہ ہے جہاں آثارِ قدیمہ کے ماہرین اور مورخین پرانے کھنڈرات کی تلاش میں زمین کھودتے پھرتے ہیں۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی میں جب ہوان سانگ یہاں سے گزرا تھا، طرخان ایک اعلیٰ تہذیب کا مرکز اور زندگی سے بھرپور ملک تھا۔ اس کی تہذیب میں ہندوستان، چین، ایران اور کسی حد تک یورپ کی تہذیبوں کا عجیب وغریب امتزاج تھا۔ یہاں بودھ مذہب رائج تھا۔ اور سنسکرت کی وجہ سے

ہندوستانیت کا اثر بھی نمایاں تھا۔ پھر بھی اس مُلک کا رہن سہن زیادہ تر چین اور ایران سے ملتا جلتا تھا۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہاں پتھر کی دیواروں پر جو تصویریں ہیں ان کے خد و خال یورپین ہیں۔ پتھر پر بنے ہوئے بدھ اور بدھی ستو دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بہت خوب صورت ہیں۔ دیویوں کی مورتیاں یا تو ہندوستانی پوشاک میں ہیں یا اُن کے تاج اور پوشاک یونانی ہیں۔

طرخان آج بھی موجود ہے لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ یہ بہت دل چسپ بات ہے کہ کس طرح اتنے زمانے پہلے ساتویں صدی عیسوی میں تہذیب کے مختلف دھارے مختلف ملکوں سے آکر یہاں ملے اور ان کی ایک مشترکہ اور بالکل نئی شکل بن گئی۔

طرخان سے ہوان سانگ کوچک گیا۔ یہ اُس زمانے میں وسط ایشیا کا ایک دوسرا مشہور مرکز تھا۔ اس کی تہذیب بہت شان دار اور چمک دمک والی تھی۔ یہاں کے گوتے بہت مشہور تھے اور عورتوں کے حُسن کی دُور دُور شہرت تھی۔ اس مُلک میں آرٹ اور مذہبی عقاید ہندوستان کے تھے۔ ایران نے اسے تہذیب و تمدن اور تجارتی سامان فراہم کیا تھا۔ یہاں جو زبان بولی جاتی تھی وہ سنسکرت قدیم پہلوی، لیٹن اور کیلٹک سے ملتی جُلتی تھی۔ مختلف زبانوں کا یہ بہت دل کش سنگم تھا۔ اس کے بعد ہوان سانگ ترکوں کے ملک سے ہو کر گزرا جہاں کا بادشاہ خان اعظم لودھ تھا۔ وسط ایشیا کے بیشتر علاقوں پر اس کی حکومت تھی۔ اس کے بعد وہ سمرقند پہنچا جو اس وقت بھی ایک پُرانا شہر مانا جاتا تھا اور جس کے ساتھ سکندر کی یاد وابستہ تھی۔ اس سے ایک ہزار سال پہلے سکندر یہیں سے ہو کر گزرا تھا۔ پھر وہ بلخ گیا اور وہاں سے کابل ندی کی وادی پار کر کے کشمیر ہوتا ہوا ہندوستان آیا۔

یہ زمانہ چین میں تانگ خاندان کی بادشاہت کی شروعات کا زمانہ تھا جب کہ چین کا دارالسلطنت سی آن فو، علم و فن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے اس وقت کے تمام ملکوں سے آگے تھا۔ اس لیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہوان سانگ

ایک اعلیٰ تہذیب کا وارث تھا اور اس نے جب دوسرے ملکوں کی تہذیبی زندگی کا موازنہ کیا ہوگا، اس وقت اس کے سامنے چین کی اعلیٰ تہذیب کا معیار رہا ہوگا۔ اسی لیے ہندوستان کے حالات کے بارے میں اس کا بیان بہت اہم اور بیش قیمت ہے۔ اس نے ہندوستان کے رہنے والوں کی اور یہاں کے سرکاری انتظامات کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

" حالاں کہ ہندوستان کے عام آدمی فطرتاً بے پرواہ ہوتے ہیں پھر بھی وہ ایمان دار اور عزت والے ہیں۔ روپیے پیسوں کے معاملات میں ان میں کوئی کھوٹ نہیں پایا جاتا۔ وہ انصاف کے معاملے میں رحم دل ہوتے ہیں۔ نہ ان کے قول وفعل میں دھوکے بازی ہے اور نہ دغا بازی۔ یہ لوگ اپنی باتوں اور وعدوں کے پکے ہیں۔ حکومت کے قوانین میں اعلیٰ اصولوں کو نظر انداز نہ کرنا ایک بڑی خصوصیت ہے۔ ان کے برتاؤ میں بڑی نرمی اور شگفتگی ہوتی ہے۔ مجرموں اور باغیوں کی تعداد یہاں بہت ہی کم ہے۔ اور ان کی وجہ سے بس کبھی کبھار تھوڑی سی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔" وہ آگے چل کر لکھتا ہے۔

"چوں کہ سرکاری نظم ونسق کی بنیاد اعلیٰ اصولوں پر ہے اس لیے انتظامی محکموں میں بہت پیچیدگی نہیں ہے۔ لوگوں سے بیگار نہیں لی جا سکتی ...... اس طرح لوگوں پر ٹیکسوں کا بوجھ بہت کم ہے اور اُن سے معمولی کام لیا جاتا ہے۔ ہر ایک آدمی اپنی دولت و جائداد سے بہت اطمینان اور چین سے فائدہ اٹھاتا ہے اور سبھی لوگ روزی کے لیے ہل چلاتے ہیں۔ جو لوگ سرکاری زمین میں کھیتی کرتے ہیں انھیں پیداوار کا چھٹا حصہ لگان میں دینا پڑتا ہے۔ تجارت پیشہ لوگ اپنے کام کے لیے آزادی سے اِدھر اُدھر آجا سکتے ہیں۔"

ہوان سانگ نے دیکھا کہ یہاں تعلیم کا اچھا انتظام تھا اور بچوں کی تعلیم جلدی شروع کردی جاتی تھی۔ پہلی کتاب ختم کرنے کے بعد لڑکی یا لڑکے کو سات سال کی عمر سے ہی پانچوں علوم (شاستر) پڑھانا شروع کردیا جاتا تھا۔ آج کل شاستر کا مطلب صرف مذہبی علوم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اُس وقت شاستر سے مُراد ہر طرح کا علم تھا۔ پانچ شاستر یہ ہیں :

(۱) ویاکرن (صرف ونحو)۔ (۲) دست کاری اور کاری گری کا علم۔ (۳) آیور وید (طب)۔ (۴) نیائے (منطق)۔ (۵) درشن (فلسفہ)۔ اِن علوم کی تعلیم کا انتظام یونیورسٹیوں میں ہوتا تھا۔ یہ نصاب عام طور پر ۳۰ سال کی عمر میں پورا ہوجاتا تھا میرا خیال ہے کہ بیشتر لوگ اس عمر تک نہ پڑھ سکتے ہوں گے۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کا کافی رواج تھا۔ ہوان سانگ پر ہندوستان والوں کی علم دوستی کا بہت اثر پڑا تھا اپنی کتاب میں وہ جگہ جگہ اس بات کا ذکر کرتا ہے۔

اُس نے پریاگ (الٰہ آباد) کے بڑے کمبھ میلے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ اُس وقت بھی یہ میلہ بہت قدیم تھا اور ٹھیٹھ ویدک زمانے سے چلا آرہا تھا۔ اس قدیم روایتی میلے کے مقابلے میں ہمارا شہر الٰہ آباد ابھی کل کا شہر ہے۔ اس شہر کو چار سَو سال سے کم ہوئے اکبر نے بسایا تھا۔ پریاگ اس سے بہت زیادہ پُرانا ہے۔ لیکن وہ کشش پریاگ سے بھی کافی پُرانی ہے جو ہزاروں سال سے لاکھوں یاتریوں کو ہر سال گنگا اور جمنا کے سنگم پر لاکھینچتی ہے۔

ہوان سانگ لکھتا ہے کہ بودھ ہونے کے باوجود بھی ہرش اس خالص ہندو میلے میں جایا کرتا تھا۔ اُس کی طرف سے شاہی فرمان جاری کیے جاتے تھے۔ جس میں "پنج ہند" کے سب غریبوں اور محتاجوں کو میلے میں آنے اور اُس کا مہمان بن کر رہنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ کسی شہنشاہ کے لیے بھی اس طرح کی دعوت دینا بڑے حوصلے کا کام تھا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہت سے آدمی آتے تھے۔ روزانہ تقریباً ایک لاکھ آدمی ہرش کے یہاں کھانا کھاتے تھے۔ اس میلے میں ہر پانچویں سال ہرش اپنے خزانے کی ساری بچت، سونا، زیورات، ریشم وغیرہ کی شکل میں جو کچھ اس کے پاس ہوتا تھا تقسیم کردیتا تھا۔ ایک بار اس نے اپنا تاج اور اپنی قیمتی پوشاک تک خیرات کردی تھی اور اپنی بہن راج شری سے معمولی اور اُتری ہوئی پوشاک مانگ کر پہنی تھی۔

عقیدت مند بودھ ہونے کی وجہ سے ہرش نے جانوروں کا ذبیحہ بند کرادیا تھا۔ برہمنوں نے شاید اس پر اعتراض نہیں کیا کیوں کہ مہاتما بُدھ کے بعد سے یہ لوگ رفتہ رفتہ

سپرد خود ہو گئے تھے۔

ہوان سانگ کی کتاب میں ایک بہت دلچسپ بات آئی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی آدمی بیمار پڑتا تھا تو وہ فوراً سات دنوں کا برت رکھ ڈالتا تھا۔ بہت لوگ تو اسی مدت میں ہی اچھے ہو جاتے تھے۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی بیماری قائم رہتی تو پھر علاج کرواتے تھے۔ اُس زمانے میں بیمار پڑنا اچھی بات نہیں سمجھی جاتی ہو گی اور نہ ہی علاج کرنے والوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہو گی۔

اُس زمانے کے ہندوستان میں ایک قابلِ قدر بات یہ تھی کہ حکمران اور فوجی افسر عالموں اور نیک سیرت انسانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ ہندوستان اور چین میں اس بات کی شعوری کوشش کی گئی اور اس میں کامیابی بھی ہوئی کہ دھن دولت کے مقابلے میں علم وفن کو عزت کا مقام حاصل ہو۔

ہندوستان میں کئی سال گزارنے کے بعد ہوان سانگ پھر شمالی دروں اور پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا اپنے ملک لوٹ گیا۔ ایک بار وہ سندھ ندی میں ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ لیکن اس کی بہت سی قیمتی اور نایاب کتابیں سندھ کی نذر ہو گئیں۔ پھر بھی وہ قلمی کتابوں کے بہت سے نسخے اپنے ساتھ لیتا گیا اور کئی سال تک ان کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کرتا رہا۔ تانگ شہنشاہ نے سی آن فو، میں اس کا بہت خلوص اور محبت سے خیر مقدم کیا۔ اسی شہنشاہ کی ایما پر اس نے اپنا سفر نامہ لکھا تھا۔

اُس زمانے کے سیاح بہت عجیب وغریب ہوتے تھے۔ آج کے زمانے کے افریقہ کے اندرونی ممالک اور شمالی اور جنوبی قطب تک کے سفر ان کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ پہاڑوں اور ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے اور سالہا سال اپنے احباب اور عزیز واقارب سے بچھڑے ہوئے یہ لوگ منزل درمنزل آگے بڑھتے جاتے تھے۔ شاید کبھی کبھی انھیں اپنے گھر کی یاد بھی ستاتی تھی، لیکن وہ اتنے خوددار ہوتے تھے کہ اس کو زبان تک لانا اپنے لیے کسرِ شان سمجھتے تھے۔ پھر بھی ایک سیاح نے اپنے دل کی ہلکی سی جھلک ہمیں دکھائی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جب وہ ایک دُور دراز ملک میں کھڑا تھا اُسے اپنے گھر کی یاد ستانے لگی اور وہ بے چین ہو اُٹھا۔ اِس سیاح کا نام تسنگ یُن تھا۔ جو ہندوستان میں ہوان سانگ سے سو سال قبل آیا تھا۔

شنکراچاریہ

جنوبی ہندوستان میں ایک ایسی عظیم شخصیت نے جنم لیا جس نے ہندوستان کی زندگی میں سارے شہنشاہوں اور راجے مہاراجوں سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ نوجوان شنکراچاریہ کے نام سے مشہور ہے۔ شاید وہ آٹھویں صدی کے آخیر میں پیدا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے مثل صلاحیتوں کا مالک تھا۔ وہ ہندو مذہب یا ہندو مذہب کی ایک خاص استدلالی شکل کو جسے "شیو" نظریہ کہتے ہیں، دوبارہ عروج بخشنے میں لگ گیا۔ وہ اپنی قوتِ استدلال کے سہارے بودھ مذہب کے خلاف لڑا۔ بودھ سنگھ کی طرح اس نے بھی سنیاسیوں کا سنگھ یا انجمن بنائی جس میں سب مذہب کے لوگ شامل ہو سکتے تھے۔ اس نے سنیاسیوں کے سنگھ کے چار مرکز ہندوستان کے شمال، جنوب، مغرب اور مشرق کے چاروں کونوں میں قائم کیے۔ اس نے ہندوستان کے طول و عرض کی خاک چھانی۔ وہ جہاں کہیں گیا کامیابی نے اس کی قدم بوسی کی۔ ایک فاتح کی حیثیت سے وہ بنارس پہنچا۔ یہ فتح اس نے عقل و استدلال کے سہارے حاصل کی تھی۔ آخر میں وہ ہمالیہ پر کیدارناتھ گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ جب وہ مرا اس وقت اس کی عمر ۳۲ سال یا اس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔

شنکراچاریہ کے عجیب و غریب کارنامے ہیں۔ بودھ مذہب، جو شمالی ہندوستان سے جنوب کی طرف چلا گیا تھا اب ہندوستان سے قریب قریب ختم ہوگیا۔ ہندو مذہب اور

شیونظریے (شیومت) کے نام سے مشہور اس کا ایک فرقہ سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ شنکر کی تصنیفات، تشریحات اور استدلال نے ملک کی فکر و نظر میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ شنکر صرف برہمنوں کا ہی عظیم رہنما نہیں بن گیا بلکہ اُس نے عوام کے دلوں کو بھی جیتا۔ یہ ایک غیر معمولی بات معلوم ہوتی ہے کہ کوئی آدمی صرف استدلال کے سہارے ایک بڑا رہنما بن جائے۔ اور پھر کروڑوں انسانوں پر اور تاریخ پر اپنا نقش بھی چھوڑ جائے بڑے بڑے جنگجو اور فاتح جو تاریخ میں خاص مقام حاصل کر لیتے ہیں، وہ یا تو ہر دل عزیز ہو جاتے ہیں یا لوگ اُن سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ تاریخ پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے مذہبی رہنماؤں نے کروڑوں دلوں کو ہلا دیا ہے اور ان میں جوش اور ولولہ پھونک دیا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہمیشہ عقیدت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ انھوں نے جذبات کو اپیل کی ہے اور انھیں متاثر کیا ہے۔

عقل اور دماغ کو جو اپیل کی جاتی ہے اس کا اثر بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے زیادہ تر لوگ غور و فکر نہیں کرتے۔ وہ تو صرف محسوس کرتے ہیں اور جذبات کے تحت عمل کرتے ہیں۔ لیکن شنکر کی اپیلِ عقل اور دماغ کو، فہم اور ادراک کو ہوتی تھی۔ وہ کسی قدیم کتاب میں لکھے ہوئے پُرانے رائج اور متعین نظریات اور اصولوں کو نہیں دُہراتا تھا۔ اس کی دلیلیں ٹھیک تھیں یا غلط، اس پر غور کرنا اس وقت فضول ہے۔ دل چسپی کی بات تو یہ ہے کہ جس طریقے کو اختیار کرکے اس نے کامیابی حاصل کی ہے اُس سے ہمیں اُس وقت کے حکمراں طبقے کی ذہنی کیفیت کی ایک جھلک ملتی ہے۔

ہندو فلسفیوں میں ایک آدمی چارواک نام کا بھی ہوا ہے جس نے الحاد کی تبلیغ کی ہے۔ وہ خدا کے وجود سے منکر تھا۔ آج بہت سے ایسے لوگ ہیں، خاص طور سے روس میں، جو خدا میں یقین نہیں رکھتے۔ لیکن ہمیں یہاں اس سوال کی گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مطلب کی بات یہ ہے کہ پُرانے زمانے میں ہندوستان میں غور و فکر اور خیالات و نظریات کی تبلیغ و اشاعت کی کتنی آزادی تھی۔ وہ ضمیر کی آزادی کا زمانہ تھا۔ یہ بات یورپ میں ابھی تک نہیں تھی اور آج بھی اس سلسلے میں بہت کچھ بندشیں ہیں۔

شنکر کی مختصر مگر سخت جان زندگی سے ایک دوسری اہم بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ سارے ہندوستان میں تہذیبی یگانگت تھی۔ یہ یگانگت قدیم تاریخ میں برابر تسلیم کی گئی ہے۔ جغرافیائی نقطۂ نظر سے ہندوستان قریب قریب ایک اکائی ہے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں اکثر تفرقہ رہا ہے۔ حالاں کہ اکثر و بیشتر سارا ملک ایک ہی مرکزی حکومت کے زیرِ اثر رہا ہے۔ تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے یہ ملک ہمیشہ سے ایک رہا ہے۔ کیوں کہ اس کا پسِ منظر، اس کی روایات و اقدار، اس کا مذہب، اس کے بہادر مرد و عورت، اس کے قدیم قصّے کہانیاں، اس کی علم سے بھرپور زبان (سنسکرت)، ملک بھر میں پھیلے ہوئے مقدّس مقامات (تیرتھ)، اس کی گاؤں پنچایتیں، اس کا طرزِ فکر اور اس کی سیاسی تنظیم شروع سے ایک ہی چلی آ رہی ہے۔ عام ہندوستانیوں کی نظر میں سارا ہندوستان مقدّس زمین (پنیہ بھومی) تھی اور باقی دنیا بیشتر ملیچھوں اور بربروں کی قیام گاہ۔

اس طرح ہندوستان (بھارت) میں ہندوستانیت (بھارتیت) کا ایک ہمہ گیر جذبہ بیدار ہوا جس نے ملک کی سیاسی تقسیم کی پروا نہیں کی بلکہ اس پر فتح حاصل کی۔ سنیاسیوں کی خانقاہوں کے لیے شنکر کا ہندوستان کے چار کونوں کا انتخاب کرنا بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہندوستان کو تہذیبی اعتبار سے ایک اکائی سمجھتا تھا۔ اور اُسے اپنی تحریک میں، تھوڑی سی مدّت میں، جو کامیابی ملی وہ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ عقلی اور تہذیبی دھارے کتنی تیزی سے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ گئے تھے۔

شنکر نے شیو نظریے کی تبلیغ کی۔ یہ نظریہ جنوب میں خاص طور سے مقبول ہوا۔ جہاں بیشتر شیو کے قدیم مندر ہیں۔ شمال میں گپت عہدِ سلطنت میں "ویشنو دھرم" اور کرشن کی پوجا کا پھر سے رواج ہوا۔ ہندو دھرم کے ان دونوں فرقوں کے مندر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

حضرت محمدؐ اور اسلام

اسلام نے عربوں کو جگایا۔ ان میں خود اعتمادی اور جوش پیدا کیا۔ اس مذہب کو پیغمبر محمدؐ نے، جو مکّہ میں ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے، پھیلایا تھا۔ انھیں اس مذہب کو چلانے کی کوئی عجلت نہیں تھی وہ اطمینان کی زندگی گزارتے تھے۔ مکّہ کے لوگ انھیں بہت چاہتے تھے اور ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ در اصل لوگ انھیں "الامین" کہا کرتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے اپنے نئے مذہب کی تبلیغ شروع کی اور خاص طور سے جب وہ مکّہ کے بتوں کی پرستش کی مخالفت کرنے لگے تو بہت سے لوگوں نے ان کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور بالآخر انھیں مکّہ سے کوچ کرنا پڑا۔ اپنی تعلیمات میں وہ سب سے زیادہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ خدا صرف ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔

مکّہ کے لوگوں نے آپ کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تو یثرب میں اپنے چند احباب اور رفیقوں کے یہاں پناہ لی۔ مکّہ سے ان کے اس کوچ کرنے کو عربی میں ہجرت کہتے ہیں۔ اور مسلمانوں کا سنہ اُسی وقت یعنی ۶۲۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ہجری سنہ قمری ہے یعنی اس میں تاریخوں کا شمار چاند کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے شمسی سال سے جو آج کل عام طور سے رائج ہے ہجری سال دس دن کم ہوتا ہے ہجری سال کے مہینے ہر سال ایک ہی موسم میں نہیں پڑتے۔ ہجری سال کا ایک مہینہ اگر اس سال سردیوں میں ہے تو کچھ سال بعد وہی مہینہ گرمی میں پڑ سکتا ہے۔

ہم ایسا کہہ سکتے ہیں کہ اسلام اس وقت سے شروع ہوا جب حضرت محمدؐ نے مکّہ سے ہجرت کی یعنی ۶۲۲ء سے ۔ حالاں کہ ایک لحاظ سے اسلام اس سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا ۔ یثرب شہر نے حضرت محمدؐ کا خیر مقدم کیا اور اُس تقریب میں اس کا نام بدل کر مدینۃ النبی یعنی نبی کا شہر کر دیا گیا ۔ آج کل اس کو صرف مدینہ کہتے ہیں ۔ مدینہ کے جن لوگوں نے حضرت محمدؐ کی مدد کی تھی وہ انصار کہلائے ۔ انصار کا مطلب ہے مددگار ۔ ان کی آل اولاد اپنے اس خطاب پر فخر کرتی تھی ۔ یہ لوگ اب تک اسے اپنے نام کا جزو بنائے ہوئے ہیں ۔

ہجرت کے بعد آٹھ سال کے اندر ہی حضرت محمدؐ مکّہ کے مالک و مختار کی حیثیت سے وہاں لوٹے ۔ اس کے پہلے ہی وہ مدینہ سے دنیا کے بادشاہوں اور حکمرانوں کے پاس یہ پیغام بھیج چکے تھے کہ وہ ایک خدا اور اس کے رسول کو مانیں ۔ ان بادشاہوں اور حکمرانوں کو بڑا تعجب ہوا ہوگا کہ آخر یہ کون انجان آدمی ہے جو ان کے پاس حکم بھیجنے کی جرأت کرتا ہے ۔ ان پیغاموں کے بھیجنے سے ہی ہم کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت محمدؐ کو اپنے اوپر اور اپنے پیغام کے اوپر کتنا زبردست اعتماد تھا ۔ یہی ایمان اور یہی خود اعتمادی انھوں نے اپنی قوم والوں کو بخشی اور اس سے تحریک پا کر ریگستان کے ان لوگوں نے جن کی اس سے پہلے کوئی حیثیت نہیں تھی ، اُس وقت کی آدھی دُنیا پر اپنا پرچم لہرا دیا ۔ ایمان اور اعتماد خود تو بڑی چیز تھے ہی ، اسی کے ساتھ اسلام نے اخوت یعنی سب ہی مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں ، کا پیغام دیا ۔ اس طرح ایک حد تک جمہوریت کا اصول لوگوں کے سامنے آیا ۔ اخوت کے اس پیغام نے صرف عربوں پر ہی نہیں ، بلکہ جہاں جہاں وہ گئے ، ان مختلف ملکوں پر بھی بہت اثر ڈالا ہوگا ۔

حضرت محمدؐ ۶۳۲ء میں یعنی ہجرت کے دس سال بعد انتقال فرما گئے ۔ انھوں نے عرب ملک کے آپس میں لڑنے والے قبیلوں کو منظم کر کے ایک نئی قوم کی تشکیل کی اور ان میں ایک نصب العین کے لیے زبردست جوش اور حوصلہ پیدا کر دیا ۔ ان کے بعد ان کے خاندان قریش کے ایک شخص حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے ۔ خلیفہ کے انتخاب کا یہ کام عام

مجلس میں سرسری انتخاب سے ہوتا تھا۔ دو سال بعد ابو بکرؓ انتقال فرما گئے اور حضرت عمرؓ ان کی جگہ خلیفہ بنائے گئے۔ حضرت عمرؓ دس سال تک خلافت کرتے رہے۔

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بلند شخصیتوں کے مالک تھے جنھوں نے عربی اور اسلامی عظمت کی داغ بیل ڈالی۔ خلیفہ کی حیثیت سے وہ مذہبی رہنما اور سیاسی حیثیت سے حکمراں، دونوں تھے۔ اپنے اونچے عہدے اور سلطنت کی دن پر دن بڑھتی ہوئی طاقت کے باوجود انھوں نے اپنی زندگی میں سادگی قائم رکھی اور عیش و آرام اور باہری شان و شوکت کی زندگی اختیار کرنے سے گریز کیا۔ اسلام کی جمہوریت ان کے لیے ایک مسلّمہ چیز تھی۔ لیکن ماتحت حاکم اور اُمراء جلدی ہی عیش و عشرت اور شان و شوکت کی زندگی میں پھنس گئے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے طرح طرح سے ان عہدہ داروں کی لعنت و ملامت کی اور انھیں سزائیں دیں۔ یہاں تک کہ ان کی فضول خرچی پر آنسو بھی بہائے۔ اس کی بہت سی روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ سادہ اور پُرمشقت زندگی میں ہی ان کی قوّت کا راز مضمر ہے۔ اور اگر انھوں نے قُسطُنطُنیہ اور ایران کے شاہی درباروں کا سا عیش و طرب اختیار کر لیا تو عرب لوگ بے راہ روی کا شکار ہو جائیں گے اور ان پر تباہی آجائے گی۔

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت ۱۲ سال رہی۔ لیکن اس مختصر مدّت میں ہی عربوں نے رومن سامراج اور ایران کے ساسانی شہنشاہ دونوں کو شکست دے دی تھی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے مقدس شہر بیت المقدس پر عربوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ سارا شام، عراق اور ایران اس نئے عرب سامراج کا حصّہ بن چکا تھا۔

دوسرے مذہبوں کے بانیوں کی طرح حضرت محمدؐ بھی اُس وقت کی بہت سی سماجی بُرائیوں کے مخالف تھے۔ جس مذہب کی انھوں نے تبلیغ کی اس کی سادگی، صفائی، اس کے جمہوری اصول۔ اخوت اور مساوات کی خوشبو نے آس پاس کے ملکوں کے عوام کے دلوں

کو کھینچ لیا۔ مطلق العنان بادشاہوں نے اور ان ہی کی طرح کے ظالم مذہبی اجارہ داروں نے عوام کو بہت دنوں سے پیس رکھا تھا۔ لوگ پُرانے طریقوں سے تنگ آچکے تھے اور کسی انقلاب کے لیے بے چین بیٹھے ہوئے تھے۔ اسلام نے انھیں اسی انقلاب کا پیغام سُنایا۔ انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس کی وجہ سے ان کی حالت کئی حیثیتوں سے بہتر ہوگئی اور بہت سی پُرانی بُرائیاں دُور ہوگئیں۔ اسلام کے ساتھ کوئی ایسا بڑا سماجی انقلاب نہیں آیا کہ اس سے عوام کی لوٹ کھسوٹ ختم ہوگئی ہوتی لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا یہ لوٹ کھسوٹ درحقیقت کم ہوئی اور وہ محسوس کرنے لگے کہ وہ سب ایک ہی بڑی برادری کے فرد ہیں۔

محمود غزنوی

خلیفہ ہارون رشید کے بعد خلافت کمزور پڑ گئی اور ایک وقت آیا جب کہ خلفا کی یہ سلطنت کئی آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ سبکتگین نام کے ایک ترک غلام نے ۹۷۵ء کے آس پاس غزنی اور قندھار میں اپنی ایک خود مختار ریاست قائم کر لی۔ اُس نے ہندوستان پر بھی حملہ کیا۔ ان دنوں لاہور کا راجا جے پال تھا۔ جے پال بہت دلیر اور باہمت شخص تھا۔ وہ سبکتگین کے خلاف کابل کی وادی میں جا دھمکا۔ لیکن وہاں اس کو شکست کھانی پڑی۔ سبکتگین کے بعد اس کا بیٹا محمود تخت نشین ہوا۔ وہ ایک لائق سپہ سالار اور بہترین شہسوار تھا۔ ہر سال وہ ہندوستان پر حملہ کرتا۔ لوٹتا، مار کاٹ کرتا اور اپنے ساتھ بہت سے آدمی قید کر کے لے جاتا۔ اس نے ہندوستان پر کُل ملا کر ۱۷ حملے کیے اس میں سے صرف کشمیر کا ایک حملہ ناکام رہا۔ باقی تمام حملوں میں وہ کامیاب رہا۔ سارے شمالی ہندوستان پر اس کا خوف چھا گیا۔ وہ پاٹلی پتر، متھرا اور سومنا تھ تک جا پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ تھانیشور سے وہ دو لاکھ قیدی اور بہت سا خزانہ لے گیا تھا۔ لیکن اُسے سب سے زیادہ خزانہ سومنا تھ میں ملا۔ کیوں کہ وہاں ایک بہت بڑا مندر تھا اور صدیوں سے چڑھاوے اور نذرانے وہاں آ آ کر جمع ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں جب محمود سومنا تھ کے پاس پہنچا تو وہاں اس امید میں لاکھوں آدمیوں نے پناہ لے رکھی تھی کہ دیوتاؤں کی ان مورتیوں سے ضرور ہی کوئی کرشمہ ظاہر ہوگا اور ان کے دیوتا اس وقت ان کی ضرور مدد کریں گے۔ لیکن عقیدت مندوں

کے تخیل سے باہر شاید ہی یہ کرشمے کبھی ظہور میں آتے ہوں۔ محمود نے مندر کو مسمار کر ڈالا اور اُسے لوٹ لیا۔ پچاس ہزار آدمی اس کرشمے کے انتظار میں ہی تباہ و برباد ہو گئے۔

(محمود کا ۱۰۳۰ء میں انتقال ہوا۔ اُس وقت سارا پنجاب اور سندھ اس کے زیرِ اقتدار تھا۔ لوگ اُسے اسلام کا ایک بڑا رہنما مانتے ہیں جو بھارت میں اسلام کا پرچم لہرانے کی غرض سے آیا تھا۔ لیکن اصل میں وہ مذہبی آدمی تھا ہی نہیں۔ وہ مسلمان ضرور تھا لیکن یہ بات اُس کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ فنِ سپہ گری کا ماہر اور ایک قابل سپہ سالار تھا۔ وہ عام سپاہیوں کی طرح ہندوستان کو فتح کرنے اور لوٹنے آیا تھا۔ وہ خواہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہوتا یہی کرتا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ محمود نے سندھ کے مسلم حکمرانوں کو بھی دھمکی دی تھی اور جب انھوں نے اُس کی ماتحتی میں رہنا اور خراج دینا منظور کر لیا تب ہی اُس نے انھیں بخشا تھا۔ اُس نے بغداد کے خلیفہ کو بھی موت کی دھمکی دی تھی اور اُس سے سمرقند کی مانگ کی تھی۔ اِس لیے ہمیں محمود کو ایک کامیاب فوجی کے علاوہ اور کسی حیثیت سے سمجھنے کی عام غلطی سے بچنا چاہیے۔

محمود بہت سے ہندوستانی کاری گروں اور معماروں کو اپنے ساتھ غزنی لے گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک خوب صورت مسجد تعمیر کرائی تھی، جس کا نام اُس نے "عروسِ فردوس" رکھا تھا۔ باغیچوں کا اُسے بہت شوق تھا۔

محمود نے متھرا کی ایک جھلک ہمیں دکھائی ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ متھرا اس وقت کتنا بڑا شہر تھا۔ محمود نے غزنی کے اپنے صوبے دار کو ایک خط میں لکھا تھا: — یہاں ایک ہزار ایسی عمارتیں ہیں جو مومنوں کے ایمان کی طرح اٹل اور مضبوط ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ یہ شہر اپنی موجودہ حالت کو کروڑوں دینار خرچ کیے بغیر پہنچا ہو اور نہ اس طرح کا شہر دو سو سال سے کم میں تیار کیا جا سکتا ہے۔

محمود کا تحریر کردہ متھرا کا یہ حال ہمیں فردوسی کے شاہنامہ میں ملتا ہے۔ فردوسی فارسی کا ایک بڑا شاعر اور محمود کا ہم عصر تھا۔ قصہ مشہور ہے کہ شاہنامہ محمود کی ایما پر لکھا گیا تھا اور اس نے فردوسی کو ہر شعر کے عوض ایک سونے کا دینار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی اختصار سے لکھنے کا قائل نہ تھا۔ اس نے بہت ہی مفصّل شاہنامہ لکھا۔ اور جب وہ محمود کے سامنے اپنے ہزاروں اشعار کا شاہنامہ لے کر پہنچا تو حالاں کہ اس کے کلام کو بہت داد ملی مگر محمود کو اپنے احمقانہ وعدے پر افسوس ہوا۔ اُس نے اُسے وعدے سے بہت کم انعام دینے کی کوشش کی۔ فردوسی کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور اس نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا۔

محمد تغلق

محمد بن تغلق عجوبہ روزگار شخصیت کا مالک تھا۔ وہ فارسی اور عربی کا بہت بڑا عالم تھا اس نے فلسفے اور منطق کا مطالعہ کیا تھا۔ اور یونانی فلسفے میں بھی دست رس رکھتا تھا۔ وہ بہت بہادر شخص تھا۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے اس کا علم و فضل ایک عجوبہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بربریت اور ضد کا مادہ پاگل پن کی حد تک تھا۔ وہ اپنے ہی باپ کو قتل کر کے تخت پر بیٹھا تھا۔ ایران اور چین فتح کرنے کے بارے میں اس کے عجیب و غریب منصوبے تھے جس میں ناکام ہونا قدرتی بات تھی۔ لیکن اس کا سب سے مشہور کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اپنے ہی دارالسلطنت دہلی کو اس لیے اجاڑ ڈالنے کا فیصلہ کیا کہ شہر کے کچھ لوگوں نے گمنام پرچوں میں اس کی پالیسی پر نکتہ چینی کرنے کی گستاخی کی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ دارالسلطنت کو دہلی سے بدل کر جنوب میں دیوگیری لے جایا جائے۔ اس جگہ کا نام اس نے دولت آباد رکھا۔ مکان کے مالکوں کو کچھ معاوضہ دیا گیا اور اس کے بعد بلا استثنا ہر آدمی کو تین دن کے اندر اندر شہر چھوڑ دینے کا حکم سنا دیا گیا۔

بہت سارے لوگ شہر چھوڑ کر چل دئے۔ کچھ چھپ بھی گئے، جب ان کا پتہ چلا تو انھیں بے رحمی کے ساتھ سزا دی گئی۔ ان میں ایک اندھا اور ایک مفلوج شخص بھی شامل تھا۔ دلی سے دولت آباد چالیس دن کا راستہ تھا۔ اس کوچ میں لوگوں کو کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانی پڑی ہوں گی اور ان میں سے کتنے ہی راستے میں ختم ہو گئے

ہوں گے، یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔

اور دلّی شہر کا کیا حشر ہوا؟ دو سال بعد محمدؐ بن تغلق نے اس شہر کو پھر بسانا چاہا لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک چشم دید گواہ کے الفاظ میں اس نے اسے بالکل ویران بنا دیا تھا۔ کسی باغ کو ایک دم بیابان بنایا جا سکتا ہے۔ مگر بیابان کو پھر باغ بنانا آسان نہیں ہوتا۔ افریقہ کا مؤرخ سیاح ابن بطوطہ لکھتا ہے ـــــــــ "اس شہر کا شمار دُنیا کے بڑے بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔ مگر جب ہم اس شہر میں داخل ہوئے تو یہ بالکل اُجاڑ ہو چکا تھا۔ آبادی بھی بس خال خال تھی"۔ ایک دوسرے آدمی نے اس شہر کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ آٹھ یا دس میل میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔ اس کی بربادی اتنی مکمل تھی کہ شہر کی عمارتوں، محلّوں اور بستیوں میں کوئی کُتّا یا بلّی بھی نظر نہیں آتی تھی۔

یہ خبطی پورے پچیس ۲۵ سال تک یعنی ۱۳۵۱ء تک حکومت کرتا رہا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عوام اپنے حکمرانوں کی حماقت، تشدّد اور نا اہلیت کو کس طرح اور کس حد تک جھیل سکتے ہیں۔ عوام کی تابعداری کے باوجود محمدؐ بن تغلق اپنی حکومت کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب رہا۔ اُس کے پاگل پن کے منصوبوں نے اور بھاری ٹیکسوں نے ملک کو برباد کر دیا۔ قحط پڑے اور بالآخر بغاوتیں ہونے لگیں۔ اس کی زندگی میں ہی، سنہ ۱۳۴۰ء کے بعد، سلطنت کے بڑے بڑے صوبے آزاد ہو گئے۔ بنگال آزاد ہو گیا۔ جنوب میں بھی کئی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ ان میں وجے نگر کی ریاست خاص تھی جو ۱۳۳۶ء میں قائم ہوئی اور دس سال کے اندر ہی جنوب کی ایک بڑی طاقت بن گئی۔

دلّی کے پاس اب بھی تغلق آباد کے کھنڈرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ شہر محمدؐ تغلق کے باپ نے بسایا تھا۔

چنگیز خاں

۱۲۱۱ء اور ۱۲۲۶ء کے درمیان ہندوستان کی سرحد پر ایک بھیانک بادل اُٹھا۔ یہ بادل منگولوں کا تھا جس کا رہنما چنگیز خاں تھا۔ چنگیز خاں اپنے ایک دشمن کا پیچھا کرتا ہوا سندھ ندی تک آگیا۔ لیکن وہ وہیں رُک گیا اور ہندوستان اُس طوفان سے بچ گیا۔ اس کے تقریباً دوسو سال بعد اسی خاندان کا ایک دوسرا آدمی تیمور، ہندوستان میں قتل و غارت گری کا طوفان لے کر آیا۔ حالاں کہ چنگیز خاں یہاں نہیں آیا۔ لیکن بہت سے منگولوں نے ہندوستان پر چھاپہ مارنا اور ٹھیک لاہور تک آدھمکنا اپنا معمول سا بنالیا تھا۔ یہ کبھی کبھی تو اتنا خوف و ہراس پھیلاتے تھے اور سلطانوں تک کو اتنا ڈرا دھمکا دیتے تھے کہ وہ دولت دے کر اپنا پنڈ چھڑانے میں ہی اپنی خیریت جانتے تھے۔ ہزاروں منگول پنجاب میں ہی بس گئے۔

منگولوں کے یہ خانہ بدوش مرد و عورت، بہت مضبوط اور جفاکش ہوتے تھے۔ تکلیفیں اُٹھانے کی اُنھیں عادت تھی۔ یہ لوگ شمال ایشیا کے لمبے چوڑے میدانوں میں خیموں میں رہا کرتے تھے۔ لیکن ان کی یہ ساری طاقت و قوت اور ان کی دُکھ تکلیف جھیلنے کی یہ مشق و مہارت کسی کام نہ آتی اگر انھوں نے اپنے اندر ایک سردار نہ پیدا کیا ہوتا۔

یہ سردار عجیب وغریب صلاحیتوں کا مالک تھا۔ یہ وہی شخص ہے جو چنگیز خاں کے نام سے مشہور ہے۔ چنگیز خاں ۱۱۵۵ء میں پیدا ہوا تھا اور اس کا اصل نام تموچن تھا۔ اس کا باپ یسوگی بغتور اسے بچہ ہی چھوڑ کر مرگیا تھا۔ بغتور منگول امیروں میں بہت مقبول نام تھا۔ اس کا مطلب ہے بہادر۔ میرا خیال ہے کہ اردو کا لفظ "بہادر" اسی سے نکلا ہے۔

چنگیز خاں حالاں کہ دس سال کا بچہ ہی تھا اور اس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا لیکن وہ برابر ہاتھ پیر مارتا رہا اور بالآخر کامیاب ہوا۔ وہ ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ منگولوں کی مجلسِ اعلیٰ نے، جو "کورل تائی" کہلاتی تھی، اپنا جلسہ کرکے اُسے اپنا سردار یعنی "خانِ اعظم" یا گگن منتخب کرلیا۔ اس سے کچھ سال پہلے اُسے چنگیز کا لقب مل چکا تھا۔

چنگیز جب "خانِ اعظم" یا گگن بنا تو اُس وقت اس کی عمر ۵۱ سال کی ہو چکی تھی۔ یہ جوانی کی عمر نہیں تھی۔ اس عمر کو پہنچ کر بیشتر آدمی آرام اور اطمینان کی زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے تو فتوحات کی زندگی کا سفر اب شروع ہونے والا تھا۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کیوں کہ عام طور پر فاتح عالم اپنے شباب کے عالم میں ہی فتوحات کیا کرتے ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ چنگیز نے جوانی کے جوش اور ولولے میں آکر ایشیا کو نہیں روند ڈالا تھا۔ یہ پکی عمر کا ایک ہوشیار اور ہوش مند انسان تھا اور ہر بڑے کام کو ہاتھ لگانے سے پہلے اس کے نتائج پر اچھی طرح غور اور اس کے لیے پوری تیاری کرلیتا تھا۔

منگول خانہ بدوش تھے۔ شہروں اور شہری زندگی کے رنگ ڈھنگ سے بھی انھیں نفرت تھی۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ چوں کہ وہ خانہ بدوش تھے اس لیے بالکل وحشی ہوں گے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ یہ تو ضرور ہے کہ شہر کے بہت سے فنون کا انھیں علم نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنی زندگی اور معاشرت کو ایک الگ رنگ میں ڈھال لیا تھا اور اپنی تنظیم بہت اعلیٰ پیمانے پر کی تھی۔

لڑائی کے میدان میں انھوں نے اگر بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں تو وہ اس لیے نہیں کہ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے بلکہ اس لیے کہ ان کے اندر نظم و اتحاد تھا۔ اور شاید

اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ انھیں چنگیز خاں جیسا جگمگاتا ہوا فوجی سپہ سالار ملا تھا۔ بلاشبہ تاریخ عالم میں چنگیز جیسی صلاحیتوں والا جنگجو اور فوجی رہنما دوسرا کوئی نہیں گزرا ہے سکندر اور سیزر (قیصر) کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ چنگیز نہ صرف خود بہت بڑا سپہ سالار تھا بلکہ اس نے اپنے بہت سے فوجی افسروں کو تربیت دے کر انھیں ہوشیار رہنما بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے وطن سے ہزاروں میل دور دشمنوں اور مخالفوں سے چاروں طرف سے گھرے رہتے ہوئے بھی وہ اپنے سے زیادہ تعداد کی فوجوں پر برابر فتح حاصل کرتا رہا۔

چنگیز نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے حملے کی تیاریاں کیں۔ اس نے اپنی فوج کو لڑائی کی تربیت دی۔ سب سے زیادہ اس نے اپنے گھوڑوں اور سواری کے جانوروں کی تربیت پر توجہ کی اور اس بات کا خاص انتظام کیا تھا کہ ایک گھوڑے کے مرنے کے بعد دوسرا گھوڑا فوراً اس کی جگہ لے سکے۔ خانہ بدوشوں کے لیے گھوڑوں سے زیادہ اہم اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ان سب تیاریوں کے بعد اُس نے مشرق کی طرف کوچ کیا اور شمالی چین اور منچوریا کی کین سلطنت کو قریب قریب ختم کر دیا اور پیکنگ پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے کوریا فتح کر لیا۔ سُنگ خاندان والوں سے اس نے دوستی کر لی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے جنوبی کین کو فتح کرنے میں اس کی مدد بھی کی تھی۔ لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ اس کے بعد خود ان کی باری آنے والی ہے۔ چنگیز نے بعد میں سُنگوں کو بھی زیر کر لیا۔

ان فتوحات کے بعد چنگیز آرام کر سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب پر حملہ کرنے کی اس کی خواہش نہیں تھی۔ وہ شاہ خوارزم سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ ہو نہیں سکا۔ ایک پرانی کہاوت ہے جس کا مطلب ہے خدا جسے برباد کرنا چاہتا ہے اس کا دماغ پھیر دیتا ہے۔ شاہ خوارزم خود اپنی بربادی پر تلا ہوا تھا۔ اس میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اُس کے ایک صوبیدار نے چند مغل سوداگروں کو قتل کر دیا۔ چنگیز پھر بھی صلح چاہتا تھا۔ اس نے اپنے سفیر بھیجے اور یہ درخواست کی کہ اس صوبیدار کو سزا

دی جائے۔ مگر وہ بے وقوف بادشاہ اتنا مغرور تھا کہ اُس نے ان سفیروں کو ذلیل کیا اور انھیں قتل کر ڈالا۔ چنگیز کے لیے اس حرکت کو برداشت کرنا ناممکن تھا۔ لیکن اُس نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ پہلے اُس نے بہت ہوشیاری سے تیاریاں کیں اور پھر مغرب کی طرف کوچ کا ڈنکا بجا دیا۔

اس یلغار نے، جو ۱۲۱۹ء میں شروع ہوئی، ایشیا اور کچھ حد تک یورپ کی آنکھوں کے سامنے ایک تہلکہ مچا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا بیلن ہے جو بڑے بڑے شہروں اور کروڑوں آدمیوں کو بے رحمی کے ساتھ روندتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ خوارزم کی سلطنت تباہ ہو گئی۔ بخارا کا بڑا شہر جس میں بہت سے محل تھے اور دس لاکھ سے زیادہ آبادی تھی جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ دارالسّلطنت سمرقند برباد ہو گیا اور اس کی دس لاکھ کی آبادی میں سے صرف پچاس ہزار آدمی زندہ بچے۔ ہرات، بلخ اور دوسرے بہت سے گلزار شہر اُجاڑ ہو گئے۔ لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ جو فن اور دست کاریاں سالہا سال سے وسط ایشیا میں پھول پھل رہی تھیں ان کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ ایران اور وسط ایشیا میں متمدن زندگی کا خاتمہ ہو گیا جہاں جہاں سے چنگیز گزر جاتا تھا بستیاں اُجاڑ ہو جاتی تھیں۔

شاہ خوارزم کا بیٹا جلال الدین اس طوفانی حملے کے خلاف بہادری سے لڑا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے سندھ ندی تک چلا آیا اور جب یہاں بھی چاروں طرف سے گھر گیا تو کہتے ہیں کہ وہ گھوڑے پر بیٹھا ہوا ۳۰ فٹ نیچے سندھ ندی میں کود پڑا اور تیر کر اس پار نکل آیا۔ چنگیز نے اب اس کا پیچھا کرنا فضول سمجھا۔

سلجوقی ترکوں کی اور بغداد کی خوش قسمتی تھی کہ چنگیز نے ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور شمال میں روس کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے کیف کے گرانڈ ڈیوک کو شکست دے کر قید کر لیا۔ اُس کے بعد وہ تنگتوں کی بغاوت کو دبانے کے لیے مشرق کی طرف لوٹ گیا۔

چنگیز ۱۲۲۷ء میں ۷۲ سال کی عمر میں انتقال کرگیا۔ اس کی سلطنت مغرب میں بحرِ اسود اور مشرق میں بحرالکاہل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُس میں اب بھی کافی چستی تھی اور وہ دن دن آگے بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اس کا دارالسلطنت ابھی تک منگولیا کا قراقرم نام کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ خانہ بدوش ہوتے ہوئے بھی چنگیز خاں میں غضب کی تنظیمی صلاحیتیں تھیں۔ سب سے بڑی عقل مندی کا کام اس نے یہ کیا تھا کہ اپنی مدد کے لیے قابل سے قابل وزیر مقرر کر رکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی عظیم الشان سلطنت جسے اُس نے بہت تھوڑی مدّت میں فتح کرلیا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد منتشر نہیں ہونے پائی۔

عرب اور ایرانی مورخوں کی نظر میں چنگیز ایک شیطان ہے۔ اُسے انھوں نے "خدا کا قہر" کہا ہے۔ اُسے بڑا ظالم آدمی بتایا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا ظالم تھا۔ لیکن اُس کے زمانے کے دوسرے بہت سے حکمرانوں میں اور اس میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ہندوستان میں افغان بادشاہ کچھ چھوٹے پیمانے پر اسی طرح کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ جب غزنی پر افغانوں نے ۱۱۵۰ء میں قبضہ کیا تو پرانی عداوت نکالنے کے لیے ان لوگوں نے اس شہر کو پہلے تو خوب لوٹا اور پھر نذرِ آتش کردیا۔ سات دن تک لوٹ مار اور غارت گری جاری رہی۔ جو مرد ملا اُسے قتل کرڈالا گیا۔ تمام عورتوں اور بچوں کو قید کرلیا گیا۔ محمودی (یعنی سلطان محمود کے خاندان والے) بادشاہوں کے محلات اور عمارتیں جو دنیا میں لاثانی سمجھی جاتی تھیں تباہ و برباد کردی گئیں۔ مسلمانوں کا اپنے ہی بھائی بندوں کے ساتھ یہ سلوک تھا۔ افغانوں کے ان کارناموں میں اور وسط ایشیا اور ایران میں چنگیز خاں کے قتل و غارت میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔

چنگیز شاہ خوارزم سے خاص طور سے ناراض تھا کیوں کہ شہنشاہ نے اس کے سفیروں کو قتل کرادیا تھا۔ اس کے لیے تو یہ خون کا معاملہ تھا۔ اور جگہوں پر بھی چنگیز نے خوب قتل و غارت گری مچائی تھی مگر اتنی نہیں جتنی کہ وسط ایشیا میں۔

شہروں کو اس طرح برباد کرنے کے پیچھے چنگیز کے اندر ایک اور جذبہ بھی کارفرما تھا۔ وہ طبعاً خانہ بدوش تھا۔ قصبوں اور شہروں سے اسے نفرت سی تھی۔ ایک دفعہ تو اس کے اندر یہ خیال بھی پیدا ہوا تھا کہ چین کے تمام شہر برباد کردیے جائیں۔ لیکن خوش قسمتی

سکھیے کہ وہ ایسا کرنے سے باز رہا۔ اس کا خیال تھا کہ متمدن زندگی اور خانہ بدوشی کی زندگی کو باہم شیر وشکر کر دیا جائے۔ لیکن ایسا کرنا نہ تو اُس وقت ممکن تھا اور نہ آج ممکن ہے۔

چنگیز خاں کے نام سے شاید یہ خیال گزرے کہ وہ مسلمان تھا۔ لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ یہ ایک منگول نام ہے۔ مذہب کے معاملے میں چنگیز بہت فراخ دل تھا۔ اس کا اگر کوئی مذہب تھا تو وہ شامانی مذہب تھا۔ اس میں ابدی نیلے آسمان کی پرستش ہوتی تھی۔ وہ چین کے تاؤ مذہب کے عالموں سے اکثر علم وفضل کی باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن وہ خود شامانی مذہب پر ہی قائم رہا۔ اور جب مشکل میں ہوتا تب آسمان کی ہی پناہ مانگا کرتا تھا۔

چنگیز کو منگولوں کی مجلس نے خانِ اعظم منتخب کیا تھا۔ یہ مجلس اصل میں سرداروں کی مجلس تھی۔ عوام کی نہیں۔ اور اس طرح چنگیز خاں سرداروں کا سردار تھا۔

چنگیز پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ اس کے تمام ساتھی بھی اسی جیسے تھے۔ شاید بہت دنوں تک وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ لکھنے کا بھی کوئی فن ہے۔ پیغام زبانی بھیجے جاتے تھے اور عام طور سے منظوم تمثیلوں اور کہاوتوں کی شکل میں ہوتے تھے۔ تعجب تو یہ ہے کہ زبانی پیغامات کے سہارے وہ کس طرح اتنی بڑی سلطنت کا کاروبار چلایا کرتا تھا۔ جب چنگیز کو فنِ تحریر کا علم ہوا تو اسے فوراً اس کی افادیت کا احساس ہو گیا اور اس نے اپنے لڑکوں اور خاص خاص سرداروں کو اسے سیکھنے کا حکم دیا۔ اُس نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ منگولوں کا پُرانا روایتی قانون اور اس کی اپنی حکمت عملی کی باتیں بھی قلمبند کر لی جائیں۔ اِس کی مُراد یہ تھی کہ یہ روایتی قانون ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اٹل ہے جس میں کوئی ذرا سی بھی ترمیم نہیں کر سکتا ہے۔ بادشاہ کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ اس دستور کی پابندی کرے۔ لیکن یہ نہ بدلنے والا قانون اب نایاب ہے اور آج کل کے مغلوں کو بھی

اس کا کوئی علم نہیں ہے اور نہ ہی اس کی روایات باقی بچی ہیں۔

چنگیز خاں کی موت کے بعد اس کا لڑکا اوغتائی "خان اعظم" منتخب ہوا۔ چنگیز اور اُس وقت کے مغلوں کے مقابلے میں وہ رحم دل اور صلح پسند طبیعت کا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا ہمارے خان اعظم چنگیز نے بہت محنت و مشقت سے ہمارے شاہی خاندان کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے آدمیوں کو اطمینان اور چین کی زندگی دیں۔ انھیں خوش حال بنائیں اور ان کی مصیبتوں کو کم کریں۔

مارکوپولو

منگول اپنے دربار میں بیرونی ملکوں سے آنے والے سیّاحوں کی بڑی قدر اور ہمّت افزائی کرتے تھے۔ ان کو علم کی پیاس تھی اور وہ ان سیّاحوں سے علم و فضل کی دولت سے مالامال ہونے کے خواہش مند تھے۔ ان کے دماغ کھُلے ہوئے تھے جن میں سیکھنے اور سمجھنے کی خواہش اور استعداد موجود تھی اس لیے وہ دوسروں سے بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔

۱۲۳۹ء میں چین کا صوبیدار قبلائی خاں "خانِ اعظم" بنا۔ قبلائی بہت دنوں تک چین میں رہ چکا تھا اور اسے یہ ملک پسند تھا۔ اس لیے اس نے اپنا دارالسلطنت قراقرم کو چھوڑکر پیکنگ کو بنایا۔ قبلائی خاں خاص طور سے بیرونی ملکوں کے سیّاحوں کی ہمّت افزائی کرتا تھا۔ اُس کے پاس وینس سے دو تاجر آئے تھے۔ یہ دو بھائی تھے۔ ان میں ایک کا نام نکولو پولو تھا اور دوسرے کا مافیو پولو۔ یہ لوگ روزگار کی تلاش میں بخارا تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں قبلائی خاں کے کچھ قاصد انھیں ملے ان لوگوں نے ان دونوں کو قافلے میں شامل ہونے پر راضی کر لیا اور اس طرح یہ دونوں خانِ اعظم کے دربار میں پیکنگ پہنچے۔

قبلائی خاں نے نکولو پولو اور مافیو پولو کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے خان کو یورپ، عیسائی مذہب اور پوپ کے بارے میں باتیں بتائیں۔ اُس نے ان باتوں میں

بہت دل چسپی لی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا رجحان عیسائی مذہب کی طرف ہو رہا ہے۔ اُس نے ۱۲۶۹ء میں ان دونوں کو یورپ واپس بھیج دیا اور پوپ کے پاس یہ پیغام کہلا بھیجا کہ ایک سو ایسے ذہین اور قابل عالم بھیج دیے جائیں جو ساتوں فنون میں مہارت رکھتے ہوں اور عیسائی مذہب کی باتوں کو اچھی طرح سمجھا سکتے ہوں۔ لیکن یہ دونوں بھائی جب یورپ واپس پہنچے تو اُس وقت یورپ اور پوپ دونوں کی حالت ابتر تھی۔ ان شرائط پر پورے اُترنے والے سو آدمی ملے ہی نہیں۔ دو سال ٹھہر کر یہ لوگ دو عیسائی فقیروں کو ساتھ لے کر واپس لوٹے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ نکولو کے جوان بیٹے مارکو پولو کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئے۔

تینوں پولو دشوار گزار سفر پر روانہ ہوئے۔ خشکی کے راستے سے انھوں نے ایشیا کی مسافت طے کی۔ یہ کتنا مشکل اور دشوار گزار سفر رہا ہوگا اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر آج بھی کوئی اسی راستے پر جائے تو قریب قریب سال بھر لگ جائے گا۔ انھوں نے کچھ حد تک ہوان سانگ کا پرانا راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ فلسطین ہو کر آرمینیا آئے اور یہاں سے عراق اور پھر خلیج فارس پہنچے۔ یہاں انھیں ہندوستانی تاجر ملے۔ ایران پار کر کے وہ بلخ پہنچے اور وہاں سے پہاڑوں کو عبور کرتے ہوئے کاشغر سے ختن پہنچے۔ ختن سے وہ لوگ پوپ نار جھیل پہنچے۔ جو چلتی پھرتی جھیل کہلاتی ہے۔ وہاں سے پھر ریگستانی سلسلہ طے کرتے ہوئے چین کے کھیتوں اور میدانوں میں سے گزر کر پیکنگ پہنچے۔ اُن کے پاس ایک شاہی اجازت نامہ (پاسپورٹ) تھا۔ یہ اجازت نامہ سونے کی ایک تختی تھی جو خان اعظم نے عطا کی تھی۔

اس طرح کے لمبے چوڑے سفر سے ایک فائدہ بھی تھا۔ سیاحوں کو نئی نئی زبانیں سیکھنے کا وقت مل جاتا تھا۔ ان تینوں کو وینس سے پیکنگ تک پہنچنے میں ساڑھے تین سال لگ گئے۔ اس لمبی مدت میں مارکو کو منگول زبان پر پورا عبور حاصل ہوگیا اور شاید چینی زبان پر بھی۔ مارکو خان اعظم کا بہت معتمد اور محبوب ہوگیا۔ اس نے تقریباً سترہ سال تک اس کی ملازمت کی۔ وہ صوبیدار بنا دیا گیا۔ سرکاری کاموں کی انجام دہی

کے سلسلے میں وہ چین کے مختلف صوبوں میں آیا جایا کرتا تھا۔ مارکو اور اُس کے باپ کو گھر کی یاد بار بار ستاتی تھی اور وہ وینس واپس جانا چاہتے تھے۔ مگر خان کی اجازت حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ آخران کو واپس جانے کا موقع مل ہی گیا۔ ایران میں ایلخانی حکومت کے منگول حکمراں کی بیوی مرگئی۔ یہ حکمراں قبلائی خاں کا چچازاد بھائی تھا۔ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر اُس کی پہلی بیوی یہ وصیت کرگئی تھی کہ اپنے فرقے سے باہر کی عورت سے شادی ہرگز نہ کرنا۔ اس لیے آرغون (قبلائی خاں کا چچازاد بھائی) نے قاصدوں کے ذریعے خان کے پاس پیکنگ، یہ پیغام بھیجا اور اُس سے درخواست کی کہ وہ اپنے فرقے کی ایک قابل عورت اُس کے لیے منتخب کر کے بھیج دے۔

قبلائی خاں نے ایک نوجوان منگول شہزادی کو پسند کیا اور تینوں پولو کو اُس کے لشکر کے ساتھ کر دیا کیوں کہ یہ تجربے کار سیاح تھے۔ یہ لوگ سمندر کے راستے جنوبی چین سے سماترا گئے اور وہاں کچھ دن قیام کیا۔ سماترا سے یہ لوگ جنوبی ہندوستان آئے۔ شہزادی اور اس کا لشکر بہت دن ہندوستان میں ٹھہرا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کوئی عجات نہ تھی۔ انھیں ایران پہنچتے پہنچتے دو سال لگ گئے لیکن اس درمیان میں اس کا منگیتر مرچکا تھا مگر اس کا مرجانا اس کے لیے کچھ بُرا بھی نہیں ہوا۔ نوجوان شہزادی کی شادی آرغون کے لڑکے سے ہوگئی جو عمر کے لحاظ سے اس کے جوڑ کا بھی تھا۔ تینوں نے شہزادی کو تو وہیں چھوڑ دیا اور خود قسطنطنیہ ہوتے ہوئے آگے اپنے وطن چلے گئے۔ ۱۲۹۵ء میں، یعنی گھر چھوڑنے کے ۲۴ سال بعد وہ وینس پہنچے۔ کسی نے ان کو نہیں پہچانا۔ کہتے ہیں اپنے پُرانے احباب اور دوسرے لوگوں پر رُعب جمانے کے لیے انھوں نے ایک دعوت دی اور اس دعوت کے درمیان ہی انھوں نے اپنے پھٹے پُرانے اور روئی بھرے کپڑے اُدھیڑ ڈالے فوراً ہی قیمتی جواہرات ـــــ ہیرے موتی اور زمرّد وغیرہ ان کے کپڑوں میں سے نکل پڑے اور مہمان حیرت سے منہ تکتے رہ گئے۔ پھر بھی ان کی کہانیوں اور چین اور ہندوستان کی ان کی سرگزشت پر بہت کم لوگوں نے یقین کیا۔ ان لوگوں نے سمجھا کہ مارکو اور اُس کے باپ اور چچا بہت بڑھا چڑھا کر

ہانک رہے ہیں۔ یہ لوگ چین اور ایشیا کے دوسرے ممالک کی وسعت اور ان کی مال و دولت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔

تین سال بعد ۱۲۹۵ء میں وینس اور جینوا کی ریاست کے درمیان لڑائی ٹھن گئی۔ یہ دونوں بحری طاقتیں تھیں اور ایک دوسرے کی حریف اور دشمن تھیں۔ دونوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ اس میں وینس کو شکست ہوئی اور جینوا والوں نے ان کے ہزاروں آدمیوں کو قید کر لیا۔ ان قیدیوں میں ہمارا دوست مارکو پولو بھی تھا۔ جینوا کے قید خانے میں بیٹھے بیٹھے مارکو پولو نے اپنے سفر کا حال لکھا بلکہ یوں کہیے کہ لکھایا۔ اس طرح مارکو پولو کے سفرنامے کے نام کی کتابیں تیار ہوئیں۔ اچھے کام کرنے کے لیے جیل بھی واقعی کتنی اچھی جگہ ہے۔

اس سفرنامے میں مارکو نے خاص طور سے چین کا حال لکھا ہے اور ان سیر و سیاحت کا ذکر بھی کیا ہے جو اس نے چین میں کی تھیں۔ اس نے سیام، جاوا، سماترا، لنکا اور جنوبی ہندوستان کا بھی کچھ حال لکھا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ چین میں بڑے بڑے بندرگاہ تھے جہاں مشرق کے تمام ملکوں کے جہازوں کا ہر وقت تانتا بندھا رہتا تھا۔ بعض جہاز تو اتنے بڑے ہوتے تھے کہ انھیں ۳۰۰ یا ۴۰۰ ملّاح چلایا کرتے تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ چین ایک سرسبز و شاداب اور خوش حال ملک تھا۔ جس میں متعدد شہر اور قصبے تھے۔ یہاں ریشمی اور زری کے کپڑے اور نفیس قسم کے کمخواب بُنے جاتے تھے۔ خوش نما انگور کی بیلیں، لہلہاتے ہوئے مرغزار اور باغیچے تھے۔ تمام شاہ راہوں پر مسافروں کے لیے اچھی اچھی سرائیں تھیں۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاہی پیغامات کو پہنچانے کے لیے ہرکاروں کا خاص انتظام تھا۔ یہ ہرکارے تھوڑی تھوڑی دور پر بدلے جانے والے گھوڑوں کے ذریعے ۲۴ گھنٹوں میں چار سو میل کی مسافت طے کر لیتے تھے۔ اس نے بتلایا ہے کہ چین کے لوگ ایندھن میں لکڑی کے بجائے ایک سیاہ پتھر کام میں لاتے تھے۔ جو زمین سے کھود کر نکالا جاتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ چینی لوگ کوئلے کی کھانیں کھودتے تھے اور

ایندھن کے لیے کوئلہ استعمال کرتے تھے۔ قبلائی خاں نے کاغذ کا سکہ بھی جاری کیا تھا یعنی کاغذ کے نوٹ چلائے تھے جن کے بدلے میں سونا دینے کا وعدہ ہوتا تھا، جیسا کہ آج کل کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی دل چسپ بات ہے کیوں کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے ساہوکاری کا ایک جدید طریقہ اختیار کیا تھا۔ مارکو نے یہ بھی بتایا ہے کہ چین میں عیسائیوں کی ایک نوآبادی بھی تھی جس کا حکمراں پریسٹر جان تھا۔ یہ بات سُن کر یورپ کے لوگوں کو بہت حیرت ہوئی۔ غالباً یہ وہی نسطوری تھے جو پُرانے زمانے میں منگولیا گئے تھے۔

مارکو نے جاپان، برما اور ہندوستان کا بھی حال لکھا ہے جو کچھ تو ذاتی مشاہدے اور کچھ سُنے سنائے واقعات پر مبنی ہے۔ مارکو کی سرگزشت، سیاحت کی ایک عجیب و غریب داستان تھی اور اب بھی ہے۔ اس نے چھوٹے چھوٹے ملکوں میں رہنے والے اور حسد و حقارت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے یورپیوں کی آنکھیں کھول دیں اور انھیں اس لمبی چوڑی دنیا کی عظمت اور دولت و حشمت کا احساس دلا دیا۔ لالچ سے ان کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اِس سے اُن کے تخیّل کو نئی پرواز ملی۔ اُن میں ہمّت سے کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اس نے ان میں سمندری سیاحت کے ذوق شوق کو از بھی جگا یا۔

مارکو کے چلے آنے کے تھوڑے دن بعد ہی "خانِ اعظم" قبلائی کی موت واقع ہو گئی۔ یوآن خاندان کی حکومت، جو اُس نے قائم کی تھی، اس کے مرنے کے بعد بہت دن نہیں ٹک سکی۔ منگولوں کی طاقت تیزی سے گھٹنے لگی۔ غیر ملکیوں کے خلاف چین میں ایک قومی لہر پیدا ہو گئی۔ ساٹھ سال کے اندر ہی منگول جنوبی چین سے نکال دیے گئے اور نانکنگ میں ایک چینی شہنشاہ نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بارہ سال بعد ۱۳۶۸ء میں یوآن خاندان کی حکومت بالکل ختم ہو گئی اور منگول چین کی بڑی دیوار کے اُس پار کھدیڑ دیے گئے۔

فیروز شاہ تغلق

خبطی سلطان محمد تغلق دلّی کو اُجاڑنے اور برباد کرنے میں کس طرح کامیاب ہوا اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ جنوب میں بڑی بڑی ریاستیں آزاد ہوگئیں۔ نئی نئی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ان ریاستوں میں وجے نگر کی ہندو ریاست اور گلبرگہ کی مسلم ریاست خاص تھیں۔ مشرق میں گوڑ کی ریاست جس میں بنگال اور بہار شامل تھے، ایک مسلم حکمراں کی ماتحتی میں آزاد ہوگئی۔

محمد تغلق کا وارث اس کا بھتیجا فیروز شاہ ہوا۔ وہ اپنے چچا سے زیادہ سمجھدار اور رحم دل تھا۔ فیروز شاہ ایک ہوشیار حکمراں تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں بہت سے سُدھار بھی کیے۔ وہ جنوب اور مشرق کے کھوئے ہوئے صوبوں کو دوبارہ حاصل نہیں کر سکا۔ لیکن سلطنت کے شیرازے کو اور زیادہ بکھرنے سے روک ضرور لیا۔ اُسے نئے نئے شہر، محل، مسجدیں اور باغ باغیچے بنوانے کا بہت شوق تھا۔ دلّی کے نزدیک فیروز آباد اور الٰہ آباد سے کچھ دور پر جونپور شہر اُسی کے بسائے ہوئے ہیں۔ اُس نے جمنا کی ایک بڑی نہر بھی بنوائی تھی اور بہت سی ایسی پرانی عمارتوں کی جو بہت بوسیدہ حالت میں پڑی ہوئی تھیں، مرمّت وغیرہ کروائی تھی۔ اُسے اپنے اس کام پر بہت فخر تھا۔ اس نے اپنی بنوائی ہوئی نئی عمارتوں کی اور جن عمارتوں کی اُس نے مرمّت کرائی تھی۔ ان کی ایک مفصّل فہرست بھی تیار کرائی تھی۔

فیروز شاہ کی ماں راج پوت عورت تھی۔ اس کا نام بی بی نیلا تھا۔ وہ ایک بڑے سردار کی بیٹی تھی۔ کہتے ہیں اُس کے باپ نے پہلے فیروز کے باپ کے ساتھ اس کا نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر لڑائی شروع ہوئی۔ نیلا کے دیس پر حملہ ہوا اور وہ برباد کر دیا گیا۔ جب بی بی نیلا کو معلوم ہوا کہ اُس کی وجہ سے اُس کی رعایا پر مصیبت آ رہی ہے تو وہ بہت پریشان ہوئی اور اُس نے طے کیا کہ اپنے آپ کو فیروز شاہ کے باپ کے حوالے کر کے اس مصیبت سے اپنی رعایا کو بچالے۔ اس طرح فیروز شاہ میں راجپوتی خون تھا۔ مسلمان حکمرانوں اور راجپوت عورتوں میں اس طرح کی شادیاں اکثر ہونے لگی تھیں۔ اس کی وجہ سے ایک قومیت کے جذبے کو پرورش پانے میں ضرور مدد ملی ہوگی۔

فیروز شاہ ۳۷ سال کی لمبی مدت تک حکومت کرنے کے بعد ۱۳۸۸ء میں انتقال کر گیا۔ اس کے فوراً بعد دلّی کی حکومت کا ڈھانچہ جو اس کے دم سے قائم تھا پاش پاش ہو گیا۔ کوئی مضبوط مرکزی طاقت نہیں رہ گئی اور ہر جگہ چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کا طوطی بولنے لگا۔ بدنظمی اور افراتفری کے اسی عالم میں فیروز شاہ کے انتقال کے ٹھیک دس سال بعد تیمور شمالی ہندوستان میں آدھمکا جس نے دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

تیمور لنگ

تیمور دوسرا چنگیز خاں بننا چاہتا تھا۔ وہ چنگیز کی نسل کا ہونے کا دعویٰ کرتا تھا لیکن اصل میں وہ ترک تھا۔ وہ لنگڑا تھا اسی لیے تیمور لنگ کہلاتا ہے ۱۳۶۹ء میں اپنے باپ کے مرنے کے بعد تیمور سمرقند کا حکمراں بنا۔ اس کے بعد ہی اُس نے اپنی فتوحات اور ظلم و غارت گری کا سفر شروع کیا۔ وہ بہت بڑا سپہ سالار تھا مگر پورا وحشی بھی تھا۔ وسط ایشیا کے منگول مسلمان ہو چکے تھے اور تیمور خود بھی مسلمان تھا۔ لیکن مسلمانوں سے پالا پڑنے پر وہ اُن کے ساتھ ذرا بھی نرمی سے نہیں پیش آتا تھا۔ جہاں جہاں وہ پہنچا تباہی و بربادی کا طوفان برپا کر دیا۔ انسانوں کی کھوپڑیوں کے بڑے بڑے انبار لگوانے میں اُسے بہت لطف آتا تھا۔ مشرق میں دلّی سے لے کر مغرب میں ایشیا کوچک تک اس نے لاکھوں آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور گنبد کی شکل میں ان کی کھوپڑیوں کا انبار لگا دیا۔

چنگیز خاں اور اُس کے منگول ساتھی بے رحم اور ظالم ضرور تھے مگر وہ اپنے زمانے کے دوسرے لوگوں سے ظلم و تشدد میں مختلف نہیں تھے۔ لیکن تیمور اُن کے مقابلے میں بہت بُرا آدمی تھا۔ وحشیانہ مظالم اور تشدد میں اس کا ثانی نہیں ملتا۔ کہتے ہیں ایک جگہ اُس نے دو ہزار زندہ آدمیوں کا ایک مینار بنوایا اور اُنھیں اینٹ گارے سے چُنوا دیا۔

ہندوستان کی دولت نے اس وحشی انسان کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہندوستان پر

حملہ کرنے کے لیے اُسے اپنے سرداروں اور سپہ سالاروں کو راضی کرنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ سمرقند میں ایک بڑا اجلاس ہوا جس میں امیروں نے ہندوستان چلنے پر اس لیے اعتراض کیا کہ وہاں گرمی بہت پڑتی ہے۔ بالآخر تیمور نے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ ہندوستان میں قیام نہیں کرے گا محض لوٹ مار کرکے واپس چلا آئے گا۔ اُس نے اپنا وعدہ پورا بھی کیا۔

شمالی ہند میں اُس وقت مسلمانوں کی حکومت تھی۔ دہلی میں ایک سلطان حکومت کرتا تھا لیکن یہ مسلم ریاست کافی کمزور تھی۔ سرحد پر منگولوں سے برابر جنگ کرتے رہنے سے اس کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ اس لیے تیمور جب منگولوں کی فوج لے کر آیا تو کوئی زیادہ سخت مقابلہ نہیں ہوا۔ وہ قتلِ عام کرتا ہوا اور انسانی استخوانوں کے انباروں کا گنبد بناتا ہوا اطمینان کے ساتھ بڑھتا چلا آیا۔ ہندو اور مسلمان دونوں قتل کیے گئے۔ معلوم ہوتا ہے ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی گئی۔ جب زیادہ قیدیوں کا سنبھالنا مشکل ہوا تو اُس نے ان کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔ اور ایک لاکھ قیدی موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ کہتے ہیں ایک بار ہندو مسلمان دونوں نے راجپوتوں کی جوہر کی رسم ایک ساتھ مل کر ادا کی تھی۔ یعنی بُزدلی سے مرنے کی جگہ آخری دم تک لڑتے ہوئے جان دینے کے لیے سب ایک ساتھ باہر نکل پڑے تھے۔ راستے بھر وہ یہی ہنگامے بپا کرتا گیا۔ تیمور کی فوج کے پیچھے قحط اور وبا کے دستے چلتے تھے۔ دہلی میں وہ پندرہ دن رہا اور اس نے اس خوب صورت اور عظیم الشان شہر کو ذبیحہ خانہ بنا دیا۔ بعد میں وہ کشمیر کو لوٹتا ہوا سمرقند واپس چلا گیا۔

حالاں کہ تیمور وحشی اور بربر تھا مگر وہ سمرقند اور اس کے علاوہ وسط ایشیا کے کچھ دوسرے مقامات پر خوب صورت عمارتیں تعمیر کرانا چاہتا تھا۔ اس غرض سے اُس نے سلطان محمود کی طرح ہندوستان کے صناعوں، معماروں اور ہوشیار کاری گروں کو جمع کیا اور انھیں اپنے ساتھ لیتا گیا۔ ان میں سے ہوشیار اور ماہر کاری گروں کو اس نے اپنی شاہی ملازمت میں رکھ لیا۔ دوسرے کاری گروں کو اُس نے مغربی ایشیا کے خاص خاص شہروں میں بھیج دیا۔ اس طرح

فنِ تعمیر میں ایک جدید طرز کی داغ بیل پڑی۔

تیمور کے جانے کے بعد دلّی اُجاڑ ہو گئی تھی۔ ہر طرف ایسی وحشت برستی تھی گویا مُردوں کا شہر ہو۔ چاروں طرف وبا اور قحط کا دور دورہ تھا۔ دو مہینے تک نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ نظم و نسق کی کوئی تنظیم۔ یہاں تک کہ جس شخص کو تیمور نے دلّی کا صوبیدار مقرر کیا تھا وہ بھی ملتان چلا گیا۔

اس کے بعد تیمور، ایران اور عراق کو تہ و بالا کرتا ہوا مغرب کی طرف بڑھا۔ انگورا میں ۱۴۰۲ء میں عثمانی ترکوں کی ایک بڑی فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ ہوا۔ فنِ سپہ گری میں اس کی عظیم الشان مہارت اُس کے کام آئی اور اُس نے ترکوں کو شکست دے دی مگر اس کے آگے سمندر کی پیچ و تاب کھاتی ہوئی لہریں تھیں جن پر اس کا بس نہیں چلا اور وہ فاسفورس کو عبور نہ کرسکا اس لیے یورپ اس سے محفوظ رہا

تین سال بعد ۱۴۰۵ء میں جب وہ چین کی طرف بڑھ رہا تھا، تیمور مر گیا۔ اسی کے ساتھ اس کا عظیم الشان سامراج جو قریب قریب سارے مغربی ایشیا پر مشتمل تھا غرق ہو گیا۔ عثمانی، ترک، مصر اور سنہرے قبیلے والے اُسے خراج دیتے تھے۔ مگر اس کی قابلیت صرف اُس کی عظیم الشان سپہ سالاری تک ہی محدود تھی۔ سائبیریا کے برف کے میدانوں میں اُس کے کچھ معرکے بہت غیر معمولی رہے ہیں۔ مگر اصلیت یہ ہے کہ وہ ایک بربر خانہ بدوش تھا۔ اُس نے نہ تو کوئی تنظیم بنائی اور نہ چنگیز کی طرح سامراج چلانے کے لیے اپنے بعد قابل آدمی ہی چھوڑے۔ یہی وجہ ہے کہ تیمور کا سامراج اُسی کے ساتھ مٹ گیا اور وہ اپنے پیچھے صرف غارت گری بربادی اور قتلِ عام کی خوفناک یادگار چھوڑتا گیا۔ وسطِ ایشیا سے ہو کر جتنے بھی قسمت آزمانے والے اور فاتح گزرے ہیں اُن میں چار نام لوگوں کو ابھی تک یاد ہیں۔ سکندر، سلطان محمود، چنگیز خاں اور تیمور۔

چند ہندو مصلحین

(ہندو سُدھارک)

تاریخ بتاتی ہے کہ شروع کے زمانے سے ہی ہندو مذہب میں مصلح یا سُدھارک پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنھوں نے اس کی بُرائیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ گوتم بُدھ ان میں سب سے ممتاز تھے۔ میں شنکر آچاریہ کا ذکر کر چکا ہوں جو آٹھویں صدی میں ہوئے تھے۔ تین سو سال بعد گیارھویں صدی عیسوی میں ایک اور بڑے سدھارک پیدا ہوئے جو دکھن کی چول ریاست کے رہنے والے تھے۔ یہ شنکر آچاریہ کے مخالف مکتبِ خیال کے رہنما تھے۔ ان کا نام رامانج تھا۔ شنکر شیو نظریے کے حامی تھے۔ جنھوں نے استدلال سے کام لے کر عقل و ذہن کو خطاب کیا تھا۔ رامانج ویشنو تھے اور عقیدتمندی کے قائل تھے۔ رامانج کا اثر سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔

ہندوستان میں اسلام مذہب کی آمد کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک نئے ڈھنگ کے سُدھارک پیدا ہونے لگے۔ وہ ان دونوں مذہبوں کے مشترک پہلوؤں کو اُجاگر کرکے دونوں کو ایک دوسرے سے نزدیک لانے کی کوشش کرتے تھے اور دونوں کی خامیوں اور باہری دکھاوے کی باتوں پر چوٹ کرتے تھے۔ اس طرح دونوں میں باہم اشتراک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ ایک مشکل کام تھا کیوں کہ دونوں میں تعصب اور توہمات کی بہت بڑی خلیج حائل تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر صدی میں اس طرح کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ مسلم حکمرانوں نے اور

خاص طور سے اکبر نے بھی باہمی اشتراک قائم کرنے کی کوشش کی۔

راما نند جو چودھویں صدی عیسوی میں ہوئے ہیں۔ اِس باہمی اشتراک کی تبلیغ کرنے والے سب سے پہلے مذہبی رہنما تھے۔ وہ ذات پات کے خلاف پرچار کرتے تھے اور اس تفریق کا بالکل خیال نہیں رکھتے تھے۔ کبیر نام کے ایک مسلمان جُلاہے ان کے پیرو تھے جو بعد میں ان سے بھی زیادہ مشہور ہوئے۔ کبیر عوام میں بہت مقبول ہو گئے۔ ان کے بھجن شمالی ہندوستان کے دُور دراز کے گاؤں میں آج بھی زبان زد ہیں۔ وہ نہ ہندو تھے نہ مسلمان۔ وہ ہندو مسلمان دونوں تھے یا دونوں کے بیچ کے تھے اور دونوں مذہب کے ماننے والے اور سب ہی ذاتوں کے لوگ ان کے پیرو تھے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ مرے تو ان کی لاش ایک چادر سے ڈھک دی گئی۔ ان کے ہندو چیلے اسے جلانا چاہتے تھے اور مسلمان شاگرد اُسے دفن کرنا چاہتے تھے۔ دونوں میں خوب حجّت و تکرار رہی، مگر جب چادر ہٹائی گئی تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ لاش جس کے لیے تکرار و حجت ہو رہی تھی غائب ہے اور اس کی جگہ چند تازہ پھول پڑے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے یہ کہانی بالکل من گڑھت ہو مگر دلچسپ ضرور ہے۔

کبیر کے کچھ ہی دنوں بعد شمال میں ایک دوسرے بڑے سدھارک اور مذہبی پیشوا پیدا ہوئے۔ ان کا نام گرو نانک تھا۔ انھوں نے سکھ پنتھ چلایا۔ ان کے بعد ایک ایک کرکے سکھوں کے دس گرو ہوئے۔ جن میں آخری گرو گو بند سنگھ تھے۔

ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی تاریخ میں ایک اور نام مشہور ہے جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ نام چیتنیہ کا ہے، جو سولھویں صدی عیسوی میں بنگال کے ایک مشہور عالم گزرے ہیں۔ اور جنھوں نے یکایک یہ فیصلہ کر ڈالا کہ ان کا سارا مطالعہ کسی کام کا نہیں ہے۔ اسی لیے انھوں نے "گیان" کو چھوڑ کر "بھگتی" کا راستہ اختیار کیا۔ وہ ایک پکّے بھگت بن گئے اور اپنے شاگردوں کو ساتھ لے کر سارے بنگال میں بھجن گاتے ہوئے گھومنے لگے۔ انھوں نے ایک خاص ویشنو فرقے کی تشکیل بھی کی۔ بنگال میں آج بھی ان کا بہت اثر ہے۔

ولیم، پرنس آف آرینج

نیدرلینڈ میں ہالینڈ اور بلجیم دونوں شامل ہیں۔ ان کا نام ہی بتاتا ہے کہ یہ نشیبی علاقے میں واقع ہیں۔ ہالینڈ کا مطلب ہے، دھنسی ہوئی زمین اور دراصل ان ملکوں کے بہت سے حصّے سمندر کی سطح سے نیچے ہیں بھی اور سمندر کے پانی کو روکنے کے لیے ان ملکوں کے شمال کی جانب بڑے بڑے بند اور دیواریں بنائی گئی ہیں۔ ایسے ملک کے رہنے والوں کا جنھیں آئے دن سمندری تھپیڑوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہو مضبوط اور باہمّت ہونا اور سمندری زندگی کو پسند کرنا قدرتی سی بات ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ سمندری سفر کرتے رہتے ہیں اُن میں سے اکثر تاجر بن جاتے ہیں۔ اس لیے نیدرلینڈ کے رہنے والے تجارت پیشہ ہو گئے۔ وہ اونی کپڑے اور دوسری چیزیں تیّار کرتے تھے۔ مشرقی ممالک سے گرم مسالے بھی لے جانے لگے۔ نتیجے کے طور پر وہاں بہت سے مالدار اور تجارتی شہر بن گئے۔ جیسے جیسے مشرقی دُنیا سے تجارت بڑھتی گئی ان شہروں کی دولت و حشمت بھی بڑھتی گئی اور سولھویں صدی میں اینٹ وَرپ یورپ کا تجارتی مرکز بن گیا۔ ان ہی تجارت پیشہ طبقوں کے ہاتھ میں ان شہروں کے نظم و نسق کی باگ ڈور تھی۔

بیوپاریوں اور تاجروں کی یہ ایک ایسی برادری تھی جو "ریفارمیشن" (اصلاحی تحریک) کے نئے مذہبی اصولوں کی طرف متوجہ ہوسکتی تھی۔ یہاں پر اور خاص طور سے

شمالی حصّوں میں، پروٹسٹنٹ خیال پھیلنے لگا۔ ہیپس برگ کے چارلس پنجم اور اس کے بعد اُس کے لڑکے فلپ دوئم کو نیدر لینڈز کی حکمرانی وراثت میں ملی۔ دونوں کسی بھی طرح کی سیاسی یا مذہبی آزادی کے روادار نہیں تھے۔ فلپ نے شہریوں کے مخصوص حقوق اور نئے مذہبی خیالات کو کچل ڈالنا چاہا۔ اس نے ایلوا کے ڈیوک کو گورنر جنرل بناکر بھیجا جو اپنی وحشیانہ اور ظالمانہ حکمرانی کے لیے بدنام ہوگیا ہے۔ انکویزیشن[1]، کا قیام ہوا اور ایک "خونی مجلس" بنائی گئی جس نے ہزاروں آدمیوں کو زندہ جلادیا یا سولی پر لٹکا دیا۔

یہ ایک بڑی لمبی داستان ہے جیسے جیسے اسپین کا تشدد بڑھتا گیا، اُس سے ٹکر لینے کی قوت بھی لوگوں میں بڑھتی گئی۔ اُن میں پرنس ولیم آف آرینج یا امن پسند ولیم نام کا ایک ایسا دانش مند اور عظیم رہنما پیدا ہوا جس کا مقابلہ کرنا ڈیوک آف ایلوا کے بس کی بات نہیں تھی۔ ۱۵۶۸ء میں "انکویزیشن" نے معدودے چند کو چھوڑکر نیدرلینڈز کے تمام باشندوں کے لیے ایک ہی فیصلے میں کفر کا فتویٰ صادر کرکے سزائے موت سنادی۔ یہ حیرت انگیز فیصلہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ جس نے تین چار سطروں میں ہی تیس لاکھ آدمیوں کو سزا کا مرتکب بنا دیا۔

شروع میں تو یہ لڑائی نیدر لینڈز کے اُمرا اور اسپین کے بادشاہ کے درمیان ہوتی معلوم پڑی۔ دوسرے ممالک میں شہنشاہوں اور اُمرا کے درمیان جو کشمکش جاری تھی کچھ ایسی ہی حالت اس لڑائی کی بھی تھی۔ ایلوا نے ان کو کچل ڈالنے کی کوشش کی اور بہت سے امیروں کو بریسلس کی سولی پر چڑھنا پڑا۔ ان پھانسی پانے والوں میں کاؤنٹ ایگمونٹ نام کا ایک ہردلعزیز اور مشہور امیر بھی تھا۔ اس کے بعد ایلوا کو جب جب روپیوں کی کمی محسوس ہوئی اُس نے نئے نئے اور بھاری ٹیکس لگانے کی کوشش کی۔ بیوپاری طبقے کی جیبوں پر اس کا اثر پڑا اور وہ لوگ بگڑ اُٹھے۔ اسی کے ساتھ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے درمیان کشمکش بھی جاری تھی۔

---

[1] مذہبی عدالت

اسپین ایک بڑی زبردست ریاست تھی جسے اپنی برتری پر ناز تھا۔ اُدھر نیدرلینڈ میں صرف بیوپاریوں اور "نکمے" اور فضول خرچ امیروں کے کچھ صوبے تھے۔ دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی اسپین کے لیے ان کو دبانا مشکل ہو گیا۔ بار بار قتلِ عام ہوتے رہتے تھے۔ پوری پوری آبادیاں موت کے گھاٹ اُتار دی جاتی تھیں۔ ایلوا اور اس کے سپہ سالار انسان کی جانوں سے کھیلنے میں چنگیز اور تیمور سے بازی لے جانا چاہتے تھے اور اکثر وہ ان بربر منگولوں سے بھی ایک قدم آگے بڑھ جاتے تھے۔ ایلوا ایک کے بعد ایک شہر کو اپنے محاصرے میں لے رہا تھا۔ ان شہروں کے غیر تربیت یافتہ مرد۔ اور کہیں کہیں تو عورتیں بھی، ایلوا کی تربیت یافتہ فوجیوں سے خشکی اور پانی میں اُس وقت تک مقابلہ کرتے رہتے تھے جب تک کہ بھوک کی شدت ان پر پوری طرح غالب نہیں آجاتی تھی۔ اسپین کی غلامی کے مقابلے میں انھوں نے اپنی عزیز ترین چیزوں کو قربان کر دینا بہتر سمجھا۔ اُنھوں نے اُس باندھ کو ہی توڑ ڈالنے کا فیصلہ کر ڈالا جو سمندر کے تھپیڑوں سے ان کے ملک کی حفاظت کرتا تھا۔ اسپین کی فوجوں کو غرقِ آب کرنے اور انھیں بھاگ جانے پر مجبور کرنے کے لیے ہالینڈ والوں نے شمالی حصے کا باندھ توڑ ڈالا۔ یہ جنگ جیسے جیسے بڑھتی گئی وہ اتنی ہی زیادہ خوفناک ہوتی گئی اور دونوں فریق نے جبر و تشدد کی تمام حدیں توڑ ڈالیں۔

خوب صورت ہارلیم شہر کا محاصرہ ایک معرکے کا محاصرہ تھا۔ اسے آخری دم تک بڑی بہادری کے ساتھ بچانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ دوسری جگہوں کی طرح وہاں بھی اسپین کے فوجیوں نے قتلِ عام اور لوٹ و غارت گری مچائی۔ الکمار کا بھی محاصرہ کیا گیا، لیکن یہ شہر باندھ توڑ کر بچا لیا گیا۔ جب دشمنوں نے لیڈن کا محاصرہ کیا تو بھوک اور بیماری سے ہزاروں آدمی مر گئے۔ لیڈن کے درختوں پر ایک بھی سبز پتہ باقی نہ بچا۔ ہر وہ چیز جو کھائی جا سکتی تھی لوگوں کی بھوک کی نذر ہو گئی تھی۔ کوڑے خانوں پر پھینکے ہوئے جھوٹے ٹکڑوں کو مریل کتوں کے مُنہ سے چھیننے کے لیے مرد عورت ٹوٹ پڑتے تھے۔ اس حالت پر پہنچ جانے پر بھی

وہ برابر دشمنوں کا مقابلہ کیے جا رہے تھے۔ یہ مریل اور ادھ مرے انسان شہر کی فصیلوں پر سے دشمن کی فوجوں کو برابر للکارتے رہتے تھے اور اسپین والوں سے کہتے تھے کہ وہ چوہے، گھیتے اور چاہے کچھ بھی کھا کر زندہ رہیں مگر ان کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے۔ اور "جب ہمارے سوا کچھ بھی باقی نہیں بچے گا تو یقین جانو کہ ہم میں سے ہر ایک پہلے اپنے بائیں ہاتھ کو کھا ڈالے گا اور داہنے ہاتھ کو، غیر ملکیوں کے مظالم سے اپنی عورتوں اپنی آزادی اور اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے بچا رکھے گا۔ اگر خدا بھی اپنے قہر سے ہمارے لیے بربادی کا انتظام کر دے اور ہمیں کسی طرح کی راحت نہ دے تو بھی ہم تمھیں اندر گھسنے سے روکنے کے لیے اپنے آپ کو زندہ رکھیں گے۔ جب ہماری آخری گھڑی آجائے گی تو ہم خود اپنے ہاتھوں سے شہر میں آگ لگا دیں گے اور مرد عورت اور بچے سب ایک ساتھ آگ میں جل کر خاک ہو جائیں گے لیکن اپنے گھروں کو ہرگز ہرگز ناپاک نہیں ہونے دیں گے۔ اور نہ اپنے حقوق کو پامال ہوتا دیکھیں گے۔"

لیڈن کے رہنے والوں میں یہی جذبہ کارفرما تھا، لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مدد کی کوئی صورت نظر نہ آنے سے اُن کی مایوسی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ بالآخر انھوں نے ہالینڈ کی دوسری جاگیروں میں اپنے دوستوں کے پاس پیغام بھیجا۔ ان جاگیروں نے یہ زبردست فیصلہ کیا کہ لیڈن کو دشمنوں کے حوالے کرنے سے تو یہ اچھا ہے کہ اپنے پیارے مُلک کو ہی غرق آب کر دیا جائے اور اُنھوں نے انتہائی مصیبت میں پڑے ہوئے اپنے ساتھی شہر کو یہ جواب بھیجا ——— اے لیڈن ہم تجھے مصیبت میں چھوڑنے کے مقابلے میں یہ بہتر سمجھیں گے کہ ہمارا سارا ملک اور ہمارے تمام مال و اسباب سمندر کی لہروں کی نذر ہو جائیں۔

آخر کار ایک ایک کر کے باندھ توڑے جانے لگے۔ ہوا کے تھپیڑوں سے سمندر کا پانی اندر داخل ہو گیا اور اس کے ساتھ ہالینڈ کے جہاز رسد اور دوسری امداد لے کر آ پہنچے۔ سمندر کی شکل میں اس نئے دشمن سے خوف زدہ ہو کر اسپین کے فوجی سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح لیڈن بچ گیا اور وہاں کے لوگوں

کی بہادری کی یاد میں لیڈن میں ۱۵۷۵ء میں ایک یونیورسٹی قائم کی گئی جو آج تک مشہور ہے۔

اس معرکے میں ہالینڈ نے ہی زیادہ تر حصہ لیا' نیدرلینڈس کے جنوبی حصے نے نہیں۔ اسپین کے حکمراں رشوت اور دباؤ ڈال کر نیدرلینڈس کے بہت سے امیروں کو اپنی طرف ملا لینے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے ان کے ہاتھوں ان کے ملک والوں کو کچلوایا۔ ان کو اس بات سے بڑی مدد ملی کہ جنوب میں کیتھلکوں کی تعداد پروٹسٹینٹوں سے زیادہ تھی۔ انھوں نے کیتھلکوں کو ملانے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ یہ بہت شرم کی بات ہے کہ وہاں کے اُمرا میں سے بہتوں نے اسپین کے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور تھوڑی سی دولت کی خاطر ملک سے غدّاری کرنے میں انتہائی ذلالت کا ثبوت دیا۔ انھیں اس بات سے کچھ مطلب نہیں تھا کہ ملک کا کیا حشر ہوگا۔

نیدرلینڈس کی قانون ساز انجمن میں تقریر کرتے ہوئے ولیم آف آرینج نے کہا تھا "نیدرلینڈس کو کچلوانے والے نیدرلینڈس کے ہی لوگ ہیں۔ ایلوا کا ڈیوک جس قوت اور طاقت کا زعم دکھاتا ہے وہ تمھاری ہی — نیدرلینڈس کے شہریوں کی — بخشی ہوئی طاقت ہے۔ بھلا سوچو یہ طاقت اُن کے پاس اور کہاں سے آئی؛ اُن کے پاس یہ سارے جہاز، رسد، دولت، اسلحہ اور سپاہی کہاں سے آئے ہیں؟ یہ سب نیدرلینڈس کے لوگوں سے ہی اُن کو ملے ہیں۔"

اس طرح اسپین والے نیدرلینڈس کے اُس حصّے کو اپنی طرف ملا لینے میں کامیاب ہوئے، جو آج موٹے طور پر بلجیم کہلاتا ہے۔ لیکن لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ ہالینڈ کو قابو میں نہ لا سکے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ لڑائی کے دوران میں اور قریب قریب اس کے ختم ہونے تک ہالینڈ نے فلپ دوئم کی ماتحتی سے کبھی انکار نہیں کیا۔ وہ اُسے اپنا بادشاہ ماننے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ وہ ان کے آزادانہ حقوق کو تسلیم کر لیتا۔ لیکن بعد میں انھیں اُس سے تعلقات منقطع کر لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ انھوں نے اپنے محبوب

رہنما ولیم کے سر پر تاج رکھنا چاہا مگر اُس نے انکار کر دیا۔ اس طرح حالات نے انھیں اپنی خواہش کے خلاف جمہوریت کے قیام کے لیے مجبور کر دیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں شہنشاہیت کو کتنی زبردست مقبولیت حاصل تھی۔

ہالینڈ میں یہ کشمکش کتنے ہی سال تک جاری رہی۔ تب کہیں ۱۶۰۹ء میں جاکر ہالینڈ آزاد ہوا۔ لیکن نیدرلینڈز میں اصل لڑائی ۱۵۶۷ء سے ۱۵۸۴ء تک ہوئی۔ اسپین کا فلپ دوئم جب ولیم آف آرینج کو شکست نہ دے سکا تو اُسے قتل کرا ڈالا۔ اس قتل کے لیے اُس نے انعام کا ایک عام اعلان کیا۔ اُس زمانے میں یورپ کی اخلاقی حالت ایسی ہی تھی۔ ولیم کو قتل کرنے کے کتنے ہی منصوبے ناکام ہوئے۔ ۱۵۸۴ء میں چھٹی کوشش کامیاب ہوئی اور یہ عظیم الشان رہنما جو ہالینڈ بھر میں فادر ولیم کے نام سے جانا جاتا تھا ــــ مارا گیا، لیکن اس کا کام پورا ہو چکا تھا۔ مظالم سہتے سہتے اور ایثار و قربانی کی بھٹی میں تپ کر ڈچ جمہوریہ ــــ ہالینڈ ــــ پر نکھار آ چکا تھا۔ ظالم اور وحشی حکمرانوں کے خلاف کھڑے ہونے سے ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم کو فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ اس سے ظلم کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ طاقت ور اور خودکفیل ہالینڈ جلد ہی ایک مضبوط بحری طاقت بن گیا اور بہت دور مشرق تک پھیل گیا۔ بلجیم جو ہالینڈ سے علحدہ ہو گیا تھا اسپین کے ہی قبضے میں رہا۔

چارلس اوّل

ہندوستان میں اکبرِ اعظم کی موت کے ٹھیک دو سال پہلے انگلینڈ کی ملکہ ایلزابتھ کی موت واقع ہوئی۔ اس کے بعد اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ تخت نشین ہوا۔ جس نے جیمس اوّل کا لقب اختیار کیا۔ اس طرح انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کی ایک مشترک حکومت قائم ہوئی۔ جیمس اوّل بادشاہوں کے خداداد اختیارِ فرماں روائی کا حامی تھا اور پارلیمنٹ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ جلدی ہی پارلیمنٹ اور اس کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ اس کے دورِ حکومت میں انگلینڈ کے بہت سے کٹر پروٹسٹنٹ مادرِ وطن کی آغوش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ امریکا میں بسنے کے خیال سے ۱۶۲۰ء میں "مے فلاور" نامی جہاز سے روانہ ہو گئے۔ امریکا کے شمالی ساحل کے کسی مقام پر اُترے جسے انھوں نے نیو لائی ماؤتھ کا نام دیا۔ اس کے بعد اور بھی کتنے ہی لوگ وہاں بسنے کے لیے پہنچے۔ اور آہستہ آہستہ مشرقی ساحل کے کنارے کنارے ان بستیوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے تیرہ تک پہنچ گئی۔ بالآخر یہ بستیاں مل کر ممالک متحدہ امریکا بن گئیں۔ لیکن یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔

جیمس اوّل کا لڑکا چارلس اوّل تھا۔ ۱۶۲۵ء میں اس کے تخت نشین ہونے کے بعد ہی پرانی کشمکش پھر سے شروع ہو گئی۔ ۱۶۲۷ء میں پارلیمنٹ نے اس کے سامنے حقوق کی عرض داشت (PETITION of RIGHT) پیش کی جو انگلینڈ کی

تاریخ میں بہت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ بادشاہ مطلق العنان حکمراں نہیں ہے۔ وہ بہت سی باتیں اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا ہے۔ وہ غیر قانونی طریقے پر نہ تو عوام پر ٹیکس عائد کر سکتا ہے اور نہ انھیں حراست میں لے سکتا ہے۔

اُس کے اوپر جب پارلیمنٹ کی طرف سے یہ پابندیاں لگائی جانے لگیں تو چارلس نے پارلیمنٹ کو توڑ دیا اور اس کے بغیر ہی حکومت کرنے لگا۔ لیکن کچھ ہی سال بعد اُسے روپیوں کی اتنی تنگی محسوس ہوئی کہ اُسے مجبوراً دوسری پارلیمنٹ بلانی پڑی۔ پارلیمنٹ کے بغیر چارلس نے جو کچھ کیا اس پر لوگ بہت ناراض تھے۔ اور نئی پارلیمنٹ تو اُس سے لڑائی مول لینے کے لیے موقع کی تلاش میں تھی۔ دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ ۱۶۴۲ء میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں ایک طرف تو شہنشاہ تھا جس کی مدد کے لیے اُمراء، نواب اور فوج کا ایک بہت بڑا حصّہ تھا، دوسری طرف پارلیمنٹ تھی جس کی مدد کے لیے دولت مند بیوپاری اور لندن کے شہری تھے۔ یہ خانہ جنگی کئی سال تک طول کھینچتی رہی اور بالآخر پارلیمنٹ کی طرف سے ایک عظیم رہنما اولیور کرامول اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس میں غضب کی تنظیمی صلاحیتیں تھیں۔ اپنے مقصد سے اُسے زبردست لگاؤ تھا۔ کرامول نے ایک نئی فوج کی تنظیم کی اور اُسے نظم و ضبط کے جذبے سے سرشار کر دیا۔ آخر کار کرامول کو فتح ہوئی اور شہنشاہ چارلس پارلیمنٹ کا قیدی ہو گیا۔

پارلیمنٹ کے بہت سے ممبر اب بھی بادشاہ سے سمجھوتہ کرنے پر تیّار تھے لیکن کرامول کی نئی فوج اس بات کو سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ اس فوج کے ایک افسر کرنل پرائڈ نے بلا جھجک پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل ہو کر ایسے ممبروں کو نکال باہر کیا۔ اس حادثے کو پرائڈس پرج یعنی پرائڈ کی صفائی کہا جاتا ہے یہ رویّہ بہت سخت اور پارلیمنٹ کی عظمت کے شایانِ شان نہیں تھا۔ اگر پارلیمنٹ نے بادشاہ کی مطلق العنانی کی مخالفت کی تو اب خود اسی کی فوج ایک ایسی طاقت بن گئی جو اُس کی دستوری اصلاحات کا احترام نہیں کرتی تھی۔

باقی ماندہ ممبروں نے جسے رمپ پارلیمنٹ کا نام دیا گیا تھا چارلس پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کر لیا اور اُسے ظالم، غدّار، قاتل اور ملک دشمن قرار دے کر سزائے موت دے دی۔

۱۶۴۹ء میں اُس انسان کا، جو اُن کا بادشاہ رہ چکا تھا اور بادشاہت کے خداداد اختیار فرماں روائی کا حامی تھا، لندن میں سر اُڑا دیا گیا۔

بادشاہ بھی عام آدمیوں کی موت مرتے ہیں۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ بیشتر شہنشاہوں کی موت قتل سے واقع ہوئی ہے۔ مطلق العنان شہنشاہیت اور قتل و خون کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انگلینڈ کے بادشاہوں نے اب تک پوشیدہ طریقے سے کافی قتل کرائے تھے۔ لیکن ایک منتخب جماعت کا اپنے آپ کو عدالت بنا لینے کی جرأت کرنا، بادشاہ کو موت کی سزا دینا اور پھر اس کا سر اُڑا دینا ایک بالکل نئی اور حیرت انگیز بات تھی۔ یہ ایک انوکھی بات ہے کہ انگریزوں نے جو ہمیشہ سے قدامت پسند رہے ہیں، اس طرح سے یہ غیر معمولی مثال پیش کر دی کہ ایک ظالم اور غدار بادشاہ کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔

اس حادثے سے یورپ کے بادشاہوں، قیصروں اور راجوں مہاراجوں اور رجواڑوں کے دِل دہل اُٹھے۔ وہ سوچنے لگے کہ اگر سبھی رعایا اتنی بے غیرت اور نکمی ہو جائے کہ وہ انگلینڈ کے نقشِ قدم پر چلنے لگے تو ان کا کیا حشر ہوگا؟ اگر ان کا بس چلتا تو ان میں سے کتنے ہی انگلینڈ پر حملہ کر کے اسے کچل ڈالتے، لیکن انگلینڈ کی باگ ڈور اُن دنوں کسی "نکمے" بادشاہ کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ پہلی بار انگلینڈ ایک جمہوری ملک بنا تھا اور اس کی حفاظت کے لیے کرامول اور اس کی فوج تیار تھی۔ کرامول قریب قریب ڈکٹیٹر تھا۔ وہ لارڈ پروٹیکٹر یا محافظ لارڈ کہلاتا تھا۔ اُس کی مستحکم اور دانشورانہ حکمرانی میں انگلینڈ کی طاقت بڑھنے لگی اور اس کے جہازی بیڑوں نے ہالینڈ، فرانس اور اسپین کے بیڑوں کو مار بھگایا اور پہلی بار انگلینڈ یورپ کی سب سے مضبوط بحری طاقت بن گیا۔

بابر

۱۵۲۶ء میں دلّی کے کمزور افغان سلطان پر بابر کی فتح سے ہندوستان میں ایک نئے تاریخی دور کا آغاز ہوتا ہے یعنی ہندوستان میں مغل خاندان کی سلطنت کا قیام جو درمیان میں مختصر سی مدّت کو چھوڑ کر ۱۵۲۶ء سے ۱۷۰۷ء تک یعنی ۱۸۱ سال تک قائم رہی۔ یہ زمانہ اس کے عروج اور عظمت کا زمانہ تھا۔ جس میں اس سلطنت نے بہت طاقت پکڑی اور ہندوستان کے مغل شہنشاہوں کی شہرت سارے ایشیا اور یورپ میں پھیل گئی۔ اس خاندان کے چھ بڑے حکمراں ہوئے جن کے بعد یہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور مرہٹوں، سکھوں وغیرہ نے اس میں سے ریاستیں بانٹ لیں۔ ان کے بعد انگریز آئے جنھوں نے مرکزی طاقت کے زوال اور ملک میں پھیلی ہوئی بدامنی سے فائدہ اُٹھا کر دھیرے دھیرے اپنا اقتدار جما لیا۔

چنگیز اور تیمور کی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بابر میں بھی کچھ کچھ ان کی سی عظمت اور فوجی مہارت موجود تھی۔ لیکن چنگیز کے زمانے کے مقابلے میں اب منگول بہت مہذّب اور متمدّن ہو چکے تھے۔ بابر جیسا سلیقہ مند، مہذّب اور ہر دل عزیز شخص اُس زمانے میں ملنا مشکل تھا۔ اُس میں نسلی امتیاز کی بو باس بالکل نہیں تھی۔ اس میں نہ تو مذہبی کٹّرپن تھا اور نہ اُس نے اپنے بزرگوں کی طرح تباہی اور غارت گری کا بازار ہی گرم کیا۔ وہ ادب نواز اور فنون سے رغبت رکھتا تھا۔ خود بھی فارسی کا شاعر تھا۔ وہ پھولوں اور باغوں سے دلچسپی

رکھتا تھا۔ ہندوستان کی گرمی میں اُسے اکثر اپنے وطن (وسط ایشیا) کی یاد آجاتی تھی۔

اپنے باپ کی موت پر جب بابر سمرقند کا حکمراں ہوا اُس وقت وہ بارہ سال کا معصوم بچّہ تھا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ وہ چاروں طرف دُشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس لیے جس عمر میں چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں اسکول جاتے ہیں اُس عمر میں اُسے تلوار لے کر میدانِ جنگ میں کود جانا پڑا۔ اس کا تخت و تاج چھن گیا مگر اُس نے اسے دوبارہ حاصل کرلیا۔ اُسے اپنی طوفانی زندگی میں متعدّد خطرات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے باوجود اُسے ادب، شعر و شاعری اور فنونِ لطیفہ سے برابر شغف رہا۔ وہ بہت حوصلہ مند اور باہمت شخص تھا۔ کابُل کو فتح کرکے وہ سندھ ندی پار کرتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا۔ اُس کے پاس فوج تو بہت تھوڑی تھی مگر توپ خانہ ساتھ تھا جو ان دنوں یورپ اور مغربی ایشیا میں کام میں لایا جارہا تھا۔ افغانوں کی جو بڑی فوج اُس سے لڑنے آئی وہ اس چھوٹی مگر اچھی طرح تربیت یافتہ فوج اور اس کے توپ خانوں کے آگے نہ ٹک سکی اور فتح بابر کے ہاتھ رہی۔ لیکن اُس کی مصیبتیں یہیں ختم نہیں ہوگئیں اور کتنی ہی بار اُس کی قسمت کی نیا ڈانوا ڈول ہو ہوگئی۔ ایک بار جب وہ بہت خطرات میں گھرا ہوا تھا اس کے سپہ سالاروں نے اُسے شمال کی طرف واپس بھاگ چلنے کا مشورہ دیا۔ مگر وہ بہت جی دار انسان تھا۔ اس نے اُن سے کہا کہ پیچھے ہٹنے سے تو مرجانا بہتر ہے۔ وہ شراب کا بہت شوقین تھا۔ لیکن اپنی زندگی میں اس مصیبت کے وقت اُس نے شراب ترک کردینے کا تہیّہ کرلیا۔ اس نے تمام جام و مینا توڑ ڈالے۔ خوش قسمتی سے وہ فتح مند ہوا۔ اس نے ترک شراب کا عہد زندگی بھر نبھایا۔

ہندوستان میں آئے ابھی اُسے چار سال بھی نہیں گزرے تھے کہ بابر کا انتقال ہوگیا لیکن یہ چار سال لڑائی جھگڑوں میں ہی گزرے اور اُسے ذرا بھی آرام نصیب نہ ہوا۔ وہ ہندوستان کے لیے ایک اجنبی ہی رہا اور یہاں کے بارے میں کچھ نہ جان سکا۔ آگرے میں اُس نے ایک عظیم الشان دارالسّلطنت کی بنیاد ڈالی اور قسطنطنیہ سے ایک مشہور شاہی معمار کو بلوایا۔

بابر نے اپنی سوانح لکھی ہے۔ اس دل چسپ کتاب میں بابر کی شخصیت کے داخلی پہلوؤں کی جھلک ملتی ہے۔ اُس نے ہندوستان اور اس کے جانوروں، پھولوں، درختوں اور پھلوں کا ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ مینڈکوں کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ وہ اپنے وطن کے خربوزوں، انگوروں اور پھلوں کے لیے پھڑپھڑاتا ہے۔ ہندوستان والوں کے بارے میں حد درجے کی مایوسی کا اظہار کرتا ہے۔ اِس کے کہنے کے مطابق ان لوگوں میں کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ شاید چار سال تک مسلسل لڑائی میں پھنسے رہنے کی وجہ سے وہ ہندوستان والوں کو سمجھ بھی نہ سکا۔ مہذب اور متمدن طبقے کے لوگ اس اجنبی فاتح سے دور ہی رہے ہوں گے۔ شاید ایک نووارد دوسرے ملک کے لوگوں کی زندگی اور ان کے تمدن میں آسانی سے گھل مل نہیں سکتا۔ بہر حال اُسے نہ تو افغانوں میں، جو کچھ دنوں پہلے سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے اور نہ ہندوستان کے باشندوں ہی میں کوئی قابلِ تعریف بات نظر آئی۔ اس کا مشاہدہ بہت عمیق تھا اور ایک غیر ملکی کی تعصب آمیز نظر سے قطع نظر اُس کے تذکروں سے اتنی بات تو بہر حال ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس وقت شمالی ہندوستان کی حالت بہت خستہ تھی۔ وہ جنوبی ہندوستان کی طرف گیا ہی نہیں۔

بابر نے لکھا ہے ـــــ "ہندوستان کی سلطنت بہت لمبی چوڑی، گنجان اور مال دار ہے۔ اُس کی مشرقی، جنوبی اور مغربی سرحدیں سمندر سے گھری ہوئی ہیں۔ اس کے شمال میں کابل، غزنی اور قندھار ہیں۔ سارے ہندوستان کا دارالسلطنت دہلی ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ بابر سارے ہندوستان کو ایک مُلک تصور کرتا تھا۔ حالاں کہ جب وہ یہاں آیا تھا تو یہ مُلک کئی سلطنتوں میں منقسم تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں وحدت کا یہ جذبہ بہت دنوں سے کارفرما دکھائی دیتا ہے۔

ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے بابر لکھتا ہے ـــــ "یہ ایک عجیب وغریب اور دل کش ملک ہے۔ ہمارے ملکوں کے مقابلے میں یہ ایک الگ دُنیا ہے۔ اس کے پہاڑ اور ندیاں، اس کے جنگل اور میدان، اس کے جانور اور پودے، اس کے رہنے والے اور ان کی زبان، اس کی فضا اور برکھا رُت سب مختلف ہیں۔ سانپ تک مختلف قسم کے ہیں......

ہندوستان کے مینڈک بھی قابلِ غور ہیں، حالاں کہ یہ بھی اسی نسل کے ہیں جس نسل کے ہمارے یہاں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ پانی کی سطح پر چھے سات گز تک دوڑ سکتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ ہندوستان کے جانوروں، پھولوں، پیڑ پودوں اور پھلوں کی ایک لمبی فہرست دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ یہاں کے رہنے والوں کا ذکر کرتا ہے۔

"ہندوستان کے ملک میں تفریح اور مسرّت کے ایسے سامان نہیں ہیں جن کے لیے اس کی تعریف کی جاسکے۔ یہاں کے رہنے والے حسین نہیں ہیں۔ مجلسی آداب اور حلقۂ احباب کی دل چسپ خوش گپیوں کا جیسے علم ہی نہیں ہے۔ ان میں نہ تو کوئی جوہر قابل ہے نہ ذہنی سوجھ بوجھ، نہ آداب و اطوار میں نرمی، نہ ہمدردی نہ دستکاری کے کاموں کا ڈھانچہ بنانے اور ان کو کام میں لانے کا سلیقہ، نہ نئی نئی ایجادیں کرنے کا مزاج، نہ نقشے اور عمارتیں بنانے کا ہنر۔ ان کے یہاں نہ تو اچھے گھوڑے ہیں نہ اچھا گوشت، نہ انگور نہ خربوزے، نہ اچھے پھل، نہ برف، نہ ٹھنڈا پانی، نہ بازاروں میں اچھا کھانا اور نہ روٹی، نہ حمام نہ مدرسے، نہ موم بتیاں، نہ مشعلیں۔ یہاں تک کہ شمعدان بھی نہیں ہے۔" اس بات پر یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ آخر ان کے یہاں ہے کیا؟ معلوم ہوتا ہے بابر نے یہ باتیں اس وقت لکھی ہوں گی جب وہ شاید یہاں سے بالکل اوب چکا ہوگا۔

یا یہ کہتا ہے:-

"ہندوستان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت بڑا ملک ہے اور یہاں سونے اور چاندی کی بھرمار ہے...... ہندوستان میں ایک آسانی یہ بھی ہے کہ یہاں طرح طرح کے پیشے اور تجارت کے کام کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اس کا کچھ شمار ہی نہیں۔ کسی کام یا دھندے کے لیے جب چاہو ایک انبوہ تیار ملے گا جن کے یہاں یہ کام پشتہا پشت سے ہوتا چلا آرہا ہے۔"

بابر کی تزک سے میں نے کچھ لمبے اقتباسات یہاں دیے ہیں۔ ایسی کتابوں سے ہم کو کسی شخص کا جتنا اندازہ ہوتا ہے اتنا اُس کے بارے میں کسی دوسرے تذکرے سے نہیں ہوتا۔

۱۵۳۰ء میں ۴۹ سال کی عمر میں بابر کی موت واقع ہوئی۔ اس کی موت کے بارے میں ایک کہانی مشہور ہے۔ اس کا بیٹا ہمایوں بیمار پڑا اور کہتے ہیں کہ اس کی محبت میں بابر خود اپنی زندگی اس شرط پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو گیا کہ اس کا بیٹا شفایاب ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ ہمایوں صحت یاب ہو گیا اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد بابر کی موت ہو گئی۔

بابر کی لاش کو لوگ کابل لے گئے، وہاں اُسی باغ میں اُسے دفن کیا گیا جو بابر کو بہت عزیز تھا۔ جن پھولوں کے لیے وہ ترستا تھا، بالآخر وہ انھیں کی آغوش میں جا پہنچا۔

اکبر

اپنی کامیاب سپہ سالاری اور فن سپہ گری کی مہارت کے بھروسے بابر نے شمالی ہندوستان کا بہت بڑا حصہ فتح کر لیا تھا۔ اُس نے دلّی کے افغان سلطان کو شکست دی اور بعد میں راجپوت تاریخ کے ایک مشہور جواں مرد چتوڑ کے جنگجو رانا سانگا کی رہنمائی میں لڑنے والے راجپوتوں کو ہرا دیا، جو زیادہ مشکل کام تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل کام وہ اپنے بیٹے ہمایوں کے لیے چھوڑ گیا۔ ہمایوں بہت تہذیب یافتہ اور عالم شخص تھا۔ لیکن اپنے باپ کی طرح سپہ گری میں دسترس نہیں رکھتا تھا۔ اس کی سلطنت میں جگہ جگہ افراتفری مچ گئی اور آخر کار ۱۵۴۰ء میں یعنی بابر کی موت کے دس سال بعد بہار کے شیر خاں نامی سردار نے اسے شکست دے کر ہندوستان سے باہر بھگا دیا۔ اس طرح یہ دوسرا مغل شہنشاہ ادھر ادھر بڑی مصیبتیں جھیلتا ہوا بھٹکتا پھرا۔ اسی افراتفری کے عالم میں راجپوتانے کے ریگستان میں نومبر ۱۵۴۲ء میں اس کی بیگم کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ریگستان میں پیدا —— ہونے والا یہ لڑکا بعد میں اکبر کے نام سے مشہور ہوا۔

ہمایوں بھاگ کر ایران پہنچا۔ وہاں کے بادشاہ نے اُسے پناہ دی۔ اس مُدّت میں شمالی ہندوستان میں شیر خاں کا دبدبہ خوب قائم ہوا۔ اُس نے شیر شاہ کے نام سے پانچ سال تک حکومت کی۔ اس قلیل مدّت میں ہی اس نے دکھا دیا کہ وہ کتنا قابل اور

ہوشیار شخص تھا۔ وہ ایک قابل منتظم تھا۔ اس کی حکومت ہندوستان کے لیے بہت شاندار اور سودمند ثابت ہوئی۔ جنگوں میں اپنی مصروفیتوں کے باوجود اُس نے کسانوں پر ٹیکس مقرر کرنے کے لیے لگان کا ایک اچھا طریقہ ڈھونڈ نکالنے کے لیے وقت نکال لیا۔ وہ سختی برتنے والا اور مستعد انسان تھا۔ ہندوستان کے تمام مغل حکمرانوں اور دوسرے شہنشاہوں میں بھی وہی سب سے زیادہ قابل اور اچھا حکمراں گزرا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہر مستعد اور کسی بھی مقابلے میں دوسرے آدمی کا دخل برداشت نہ کرنے والے حکمراں کا حشر ہوتا ہے شیر شاہ سارے نظامِ حکومت کا زندگی بھر تنہا کرتا دھرتا بنا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے بعد اتنی جلدی اس عظیم الشان سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

ہمایوں نے اس بدنظمی سے فائدہ اُٹھایا اور ۱۵۵۶ء میں وہ ایک فوج کے ساتھ ایران سے لوٹا۔ اس کو فتح نصیب ہوئی اور سولہ سال بعد وہ دوبارہ دلّی کے تخت پر آ بیٹھا۔ مگر کچھ زیادہ مدّت کے لیے نہیں۔ چھ مہینے بعد ہی وہ ایک زینے سے گر کر اِس جہان سے رحلت کر گیا۔

اکبر اُس وقت صرف تیرہ سال کا بچّہ تھا۔ اپنے دادا کی طرح اسے بھی جلدی تخت و تاج نصیب ہوا۔ بیرم خاں اس کا اتالیق اور سرپرست تھا۔ لیکن چار ہی سال میں اکبر اس سرپرستی سے اور دوسرے آدمیوں کے اشاروں پر چلنے سے تنگ آگیا اور اُس نے حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔

۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک یعنی تقریباً پچاس سال تک اکبر نے ہندوستان پر حکومت کی۔ یہ زمانہ یورپ میں نیدر لینڈس کی بغاوت کا اور انگلینڈ میں شیکسپیر کا زمانہ تھا۔ اکبر کا نام ہندوستان کی تاریخ میں جگمگا رہا ہے اور اکثر باتوں میں وہ ہمیں اشوک کی یاد دلاتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ عیسیٰ سے تین سو سال قبل کا ایک بودھ شہنشاہ اور عیسیٰ کے بعد سولھویں صدی کا ایک مسلم شہنشاہ دونوں ایک ہی طرح سے اور تقریباً ایک ہی آواز میں بول رہے ہیں۔ تعجب نہیں کہ یہ آواز خود ہندوستان کی اپنی آواز ہو جو اپنے دو عظیم سپوتوں کی زبان میں بول رہی ہو! اشوک کے بارے میں ہم اتنی ہی بات جانتے ہیں جتنی وہ پتھر دل

خود کندہ کرا گیا ہے۔ لیکن اکبر کے بارے میں ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اُس کے دربار کے دو ہمعصر مورخوں نے بہت طویل اور مفصّل تذکرے لکھے ہیں جو آج بھی ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو غیر ملکی اُس سے ملنے آئے تھے انھوں نے بھی کچھ تذکرے لکھے ہیں۔ ان میں جے سوئٹ لوگ خاص ہیں جنھوں نے اُسے عیسائی بنانے کی زوردار کوشش کی تھی۔

یہ بابر کی تیسری پُشت تھی۔ لیکن مغل ابھی اس ملک کے لیے اجنبی تھے۔ وہ غیر ملکی سمجھے جاتے تھے اور ان کا اقتدار فوجی طاقت کے سہارے قائم تھا۔ اکبر کی حکومت نے مغل خاندان کی جڑیں ہندوستان کی مٹی میں جمادیں اور مغل شاہی خاندان کو یہاں کی دھرتی کا لعل اور پوری طرح ہندوستانی مزاج والا بنا دیا۔ اسی کے دورِ حکومت میں یورپ میں مغل شہنشاہ مغلِ اعظم کے نام سے جانا جانے لگا۔ وہ اپنی مرضی کا پابند اور دُھن کا پکّا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت شہنشاہوں کے اختیارات پر پابندی لگانے کا کوئی ذکر تھا ہی نہیں۔ خوش قسمتی سے اکبر ایک دانش مند مطلق العنان بادشاہ تھا اور وہ ہندوستان کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے جی جان سے کوشاں رہتا تھا۔ ایک طرح سے اُسے ہندوستان میں قومیت کے نظریے کا بانی مانا جا سکتا ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ ملک میں قومیت کا نام و نشان نہ تھا اور مذہب کی دیواریں لوگوں کے درمیان حائل تھیں، اکبر نے جُدا جُدا مذہبوں کے دعووں پر ہندوستانی قومیت کے تصوّر کو جگہ دی۔ وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب تو نہیں ہوا مگر حیرت کی بات ہے کہ وہ کتنا آگے بڑھ گیا اور اس کی کوششیں اتنی زیادہ بارآور ثابت ہوئیں۔

مگر اس کے باوجود اکبر کو جو کچھ کامیابی نصیب ہوئی اس کا سہرا اُسی اکیلے کے سر ہی نہیں ہے۔ جب تک زمانہ موافق اور فضا سازگار نہ ہو اُس وقت تک کوئی بھی انسان اپنی عظیم کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ عظیم شخصیتیں خود اپنے لیے سازگار حالات پیدا کر کے زمانے کو جلدی بدل سکتی ہیں۔ لیکن شخصیت خود بھی اُس زمانے اور ماحول کی پروردہ ہوتی ہے۔ اسی طرح اکبر بھی ہندوستان کے اُس خاص زمانے اور ماحول کا پروردہ تھا۔ رامانند، کبیر اور گرونانک جیسے سدھارکوں اور مذہبی پیشواؤں کے بارے میں

لکھ آیا ہوں جنھوں نے ہندو اور مسلمان مذہب کے مشترک پہلوؤں کو اجاگر کر کے اور ان کے بہت سے رسم و رواج اور اوپری دکھاوے کی باتوں کی مذمت کر کے دونوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی کوشش کی تھی۔ اُس وقت اتحاد کا یہ جذبہ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اکبر اُس کا خاص محرک بن گیا۔

ایک سیاست داں کی حیثیت سے بھی وہ اس نتیجے پر پہنچا ہوگا کہ خود اُس کی اور ساری قوم کی قوت اور استحکام اسی اتحاد سے بڑھ سکتی ہے۔ وہ ایک بہت بہادر، جنگجو اور ہوشیار سپہ سالار تھا۔ اشوک کی طرح وہ جنگ سے نفرت نہیں کرتا تھا مگر شمشیر کے زور سے فتح حاصل کرنے کے بجائے وہ محبت کی طاقت سے فتح حاصل کرنے کو بہتر جانتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہی فتح زیادہ مستحکم اور دیرپا ہوتی ہے۔ اسی خیال کے تحت وہ ہندو سرداروں اور ہندو عوام کا اعتماد اور خلوص حاصل کرنے میں لگ گیا۔ اس نے غیر مسلموں سے جزیہ اور ہندوؤں کے مقدس مقامات پر یاتریوں کے ٹیکس معاف کر دیے۔ اُس نے خود اپنی شادی ایک اعلیٰ راجپوت خاندان کی لڑکی سے کی اور باہم ایسی شادیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اُس نے اپنی سلطنت کے اونچے سے اونچے عہدے پر راجپوتوں کو فائز کیا۔ اُس کے بہادر سپہ سالاروں اور قابل وزیروں اور صوبیداروں میں متعدد ہندو تھے۔ راجا مان سنگھ کو تو اس نے کچھ دنوں کے لیے کابل کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ دیکھا جائے تو راجپوتوں کا اور ہندو رعایا کا خلوص حاصل کرنے میں اکثر وہ اتنا آگے بڑھ جاتا تھا کہ مسلم عوام کے ساتھ بے انصافی تک ہو جاتی تھی۔ بہر حال وہ ہندوؤں کا خلوص حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور اس کی ملازمت کرنے اور اس کا احترام کرنے کے لیے چاروں طرف سے تقریباً سبھی راجپوت اکٹھے ہونے لگے۔ سوائے میواڑ کے رانا پرتاپ کے جس نے کبھی اپنا سر نہیں جھکایا۔ رانا پرتاپ نے اکبر کو نام کے لیے بھی اپنا شہنشاہ ماننے سے انکار کر دیا۔ میدانِ جنگ میں شکست کھا جانے پر بھی اُس نے اکبر کا مصاحب بن کر عیش و مسرت کی زندگی گزارنے سے جنگل میں چھپا چھپا پھرنا بہتر سمجھا۔ زندگی بھر یہ باغیرت راجپوت دہلی کے شہنشاہ سے لڑتا رہا اور اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا گوارہ نہیں

کیا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اُسے کچھ کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ اس جنگجو راجپوت کی یاد راجپوتانے کی ایک بیش بہا دولت ہے۔ اس کے نام کے ساتھ کتنی ہی کہانیاں منسوب ہیں۔

اس طرح اکبر نے راجپوتوں کو اپنی طرف ملا لیا۔ وہ عوام میں مقبول ہو گیا۔ وہ پارسیوں اور اپنے دربار میں آنے والے جے سوئیٹ پادریوں تک سے بہت خلوص برتتا تھا۔

میں نے اکبر کا موازنہ اشوک سے کیا ہے۔ لیکن بہت سی باتوں میں وہ اشوک سے بالکل مختلف تھا۔ وہ بڑا حوصلہ مند اور اولوالعزم شخص تھا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وہ اپنی سلطنت بڑھانے کی دُھن میں فتوحات پر فتوحات کرتا رہا۔ جے سوئیٹ لوگوں نے لکھا ہے کہ اُس میں زبردست فہم وادراک اور فیصلے کی زبردست قوت تھی۔ وہ ہوشیار اور بیدار مغز انسان تھا۔ معاملات کو دور اندیشی سے سمجھتا تھا اس کے علاوہ رحم دل، ملنسار اور مخلص انسان تھا۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں بڑے بڑے خطرات کو مول لے کر بھی کسی کام کو پورا کرنے کی ہمت تھی ..... وہ بہت سی چیزوں میں دلچسپی رکھتا تھا اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا خواہش مند رہتا تھا۔ اُسے نہ صرف فوجی اور سیاسی باتوں کی بلکہ بہت سے علوم وفنون کی بھی اچھی معلومات تھی۔ جو لوگ اُس کی ذات پر حملہ کرتے تھے ان پر بھی شہنشاہ کی معافی اور رحم دلی کی روشنی پڑتی رہتی تھی۔ اُسے غصہ بہت ہی کم آتا تھا مگر جب کبھی غصے میں آتا تو اس کے غیظ وغضب کا ٹھکانا نہ رہتا۔ لیکن یہ غصہ محض وقتی ہوتا تھا۔

یہ تذکرہ اُس کے کسی چاپلوس مصاحب کا نہیں ہے۔ بلکہ ایک غیر ملکی اجنبی کا ہے جسے اکبر کی شخصیت کا بغور مطالعہ کرنے کا کافی موقع ملا تھا۔

تن وتوش کے لحاظ سے بھی اکبر کافی طاقت ور اور پھرتیلا تھا۔ وہ جنگلی اور خونخوار درندوں کے شکار سے زیادہ کسی چیز کا شوق نہیں رکھتا تھا۔ ایک سپاہی کی حیثیت سے تو وہ اتنا بہادر تھا کہ اپنی جان کی بھی مطلق پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اُس کی

حیرت انگیز قوت کا اندازہ آگرے سے احمد آباد تک اس مشہور سفر سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے نو دن میں پورا کیا تھا۔ گجرات میں بغاوت ہو گئی تھی اور اکبر ایک چھوٹی سی ٹکڑی کے ساتھ اس زمانے میں راجپوتانے کے ریگستان کو عبور کر کے ساڑھے چار سو میل کا فاصلہ طے کرتا ہوا وہاں آ دھمکا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

لیکن ان خوبیوں کے علاوہ عظیم شخصیتوں میں ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔ ان میں ایک طرح کی کشش ہوتی ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اکبر کی شخصیت میں یہ کشش حد درجہ موجود تھی۔ جے سوئٹ لوگوں کے حیرت انگیز تذکروں کے مطابق اس کی جادو اثر اور لوگوں کو قابو میں کرنے والی آنکھیں "اس طرح جھلملاتی تھیں جس طرح سورج کی روشنی میں سمندر۔" پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ یہ شخص ہم کو آج تک عزیز اور محبوب ہے اور اس کی شاہانہ شان و شوکت اور جواں مردی ان لاکھوں انسانوں سے بہت اونچی دکھلائی پڑتی ہے جو محض شہنشاہ ہوئے ہیں۔

ایک فاتح کی حیثیت سے بھی اکبر کے کارنامے کچھ کم نہیں ہیں۔ اس نے سارے شمالی ہندوستان اور جنوب کے کچھ حصّے کو بھی فتح کر لیا تھا۔ اس نے گجرات، بنگال، اڑیسہ، کشمیر اور سندھ کو اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ وسطی اور جنوبی ہندوستان میں بھی اس کو فتح نصیب ہوئی۔ اس نے ان سے خراج وصول کیے۔ لیکن وسط ہندوستان کی مہارانی درگاوتی کو شکست دینا اس کی عظمت کے شایانِ شان نہیں ہے۔ درگاوتی ایک بہادر عورت اور انصاف پسند مہارانی تھی۔ اس نے اکبر کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن اولوالعزمی اور سامراج کی ہوس ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی مطلق پرواہ نہیں کرتی۔ جنوب میں اس کی فوجیں احمد نگر کی مشہور حکمراں چاند بی بی سے لڑیں۔ اس عورت میں غضب کی ہمت اور قابلیت تھی۔ اس نے جنگ میں جو مورچہ لیا اِس کا مغل سپاہیوں پر اتنا زبردست اثر پڑا کہ انھوں نے اس کے ساتھ مناسب شرائط پر صلح کر لی۔ بدقسمتی سے کچھ دِنوں بعد اس کے ہی کچھ ناراض سپاہیوں نے اُسے جان سے مار ڈالا۔

اکبر کی فوجوں نے چتوڑ کا بھی محاصرہ کیا۔ یہ رانا پرتاپ سے قبل کی بات ہے۔

جے مل نے بڑی بہادری سے چتوڑ کی حفاظت کی۔ اُس کے مارے جانے پر جوہر کی خوف ناک رسم ادا ہوئی۔ یعنی تمام عورتیں آگ میں جل کر خاک ہوگئیں اور چتوڑ فتح کرلیا گیا۔

اکبر نے اپنے گرد قابل اور ہوشیار مددگاروں اور مشیروں کا ایک حلقہ جمع کرلیا تھا جو اُس کے بہت وفا شعار ساتھی تھے۔ ان میں خاص فیضی اور ابوالفضل دو بھائی تھے۔ ان میں ایک بیر بل بھی تھے جن کے بارے میں بے شمار لطیفے اور کہانیاں مشہور ہیں۔ اکبر کا وزیر خزانہ ٹوڈر مل تھا۔ اسی نے لگان کے سرکاری طریقے کو بدلا تھا ان دنوں زمینداری کا رواج نہیں تھا۔ اور نہ زمیندار تھے نہ تعلقہ دار۔ حکومت کسانوں یا رعایا سے براہِ راست لگان وصول کرتی تھی۔

جے پور کا راجہ مان سنگھ اکبر کے سب سے اچھے سپہ سالاروں میں سے تھا۔ اکبر کے دربار میں ایک اور مشہور فن کار تان سین تھا۔ جسے آج ہندوستان کے سارے موسیقار اُستاد مانتے ہیں۔

شروع میں اکبر کا دارالسلطنت آگرہ تھا، جہاں اُس نے قلعہ بنوایا۔ اس کے بعد اس نے آگرے سے پندرہ میل دور فتح پور سیکری میں ایک نیا شہر بسایا۔ اُس نے یہ جگہ اس لیے پسند کی کہ یہاں شیخ سلیم چشتیؒ نام کے ایک مسلم صوفی رہتے تھے۔ یہاں اُس نے ایک عالی شان شہر بنوایا جو اُس وقت کے ایک انگریز سیّاح کے الفاظ میں لندن سے بھی زیادہ بڑا تھا اور یہی پندرہ سال سے بھی زیادہ اس کی حکومت کا پایۂ تخت رہا۔ بعد میں اس نے لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اکبر کا مصاحب اور وزیر ابوالفضل لکھتا ہے ——— "بادشاہ سلامت عالی شان عمارتوں کے نقشے سوچتے ہیں اور اپنے دل و دماغ کی سوجھ بوجھ کو اینٹ، پتھر کا جامہ پہنا دیتے ہیں"

فتح پور سیکری اور اس کی خوب صورت مسجد، اُس کا زبردست بلند دروازہ اور دوسری بہت سی خوب صورت عمارتیں آج بھی موجود ہیں۔ یہ شہر اُجڑ گیا ہے اور اس میں کسی طرح کی چہل پہل آج نہیں ہے لیکن اس کی شاہراہوں اور گلیوں میں اس کے

کھلے ہوئے صحنوں میں ایک مٹی ہوئی عالی شان سلطنت کا سایہ آج بھی چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔

موجودہ الہ آباد شہر بھی اکبر کا بسایا ہوا ہے۔ گر جگہ یہ بہت پرانی ہے۔ پریاگ تو یہاں رامائن کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ الہ آباد کا قلعہ اکبر کا بنوایا ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ اکبر ایک عظیم الشان سلطنت کو فتح کرنے اور اُسے منظم کرنے میں مصروف رہا ہوگا۔ لیکن اس کے اندر ایک اور حیرت انگیز بات نظر آتی ہے اور وہ ہے اس کی علم کی پیاس اور حق کی جستجو۔ جو کوئی کسی بھی موضوع پر روشنی ڈال سکتا تھا اسے بلایا جاتا تھا اور اس سے سوالات کیے جاتے تھے۔ مختلف مذہب کے لوگ "عبادت خانہ" میں اس کے چاروں طرف بیٹھتے تھے اور ہر ایک اُس شہنشاہِ اعظم کو اپنے مذہب میں داخل کرنے کی توقع رکھتا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ ایک دوسرے سے حجت و تکرار کر بیٹھتے تھے۔ اور اکبر بیٹھا ہوا مزے سے ان کے مباحث سنتا رہتا تھا۔ وہ اکثر سوالات کیا کرتا تھا معلوم ہوتا ہے اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ حق یا سچائی کا ٹھیکہ کسی خاص مذہب یا فرقے نے نہیں لے رکھا ہے۔ اور اس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ مذہب میں آفاقی رواداری کے اصول کو تسلیم کرتا ہے۔

اس کے زمانے کے مورخ بدایونی نے جو اکثر اس طرح کے اجتماعات میں شامل ہوتا رہا ہوگا، اکبر کے بارے میں دلچسپ حالات قلم بند کیے ہیں۔ بدایونی خود ایک کٹر مسلمان تھا۔ اکبر کی اِن حرکتوں کو وہ بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے :۔

"جہاں پناہ ہر ایک کے خیال کو سُنتے تھے۔ خاص طور سے ایسے لوگوں کے خیالات کو، جو مسلمان نہیں تھے اور ان میں سے جو باتیں ان کو اچھی لگتیں انھیں اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے اور جو ان کے مزاج کے خلاف اور ان کی خواہشات کے ناموافق ہوتیں ان سب کو ترک کر دیتے تھے۔ صغر سنی سے جواں سالی تک اور جواں سالی سے ضعیفی تک جہاں پناہ جدا جدا حالات میں مختلف مذہبی رسومات اور مختلف فرقہ وارانہ اعتقادات کے حامل رہے ہیں اور جو کچھ کتابوں میں مل سکتا ہے ان سب کا انتخاب ان کی یادگی

نظروں نے جو ان کا اپنا طرۂ امتیاز رہی ہے، بہت سلیقے سے کیا ہے اور تلاش و جستجو کے اُس جذبے کے تحت کیا ہے جو ہر اسلامی اصول کے خلاف ہے۔ اس طرح ان کے دل کے آئینہ پر کچھ اصولوں کی بنیاد پڑا اعتقادات کا ایک عکس پڑ گیا ہے ان پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان سب کے نتیجے کے طور پر ان کے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح یہ خیال نقش ہو گیا ہے کہ سبھی مذہبوں میں ہوش مند آدمی ہیں اور سب قوموں میں اعلیٰ قسم کے مفکر اور اعجاز و حشمت والے لوگ موجود ہیں۔ علم حقیقی کی کچھ نہ کچھ جھلک جب ہر جگہ مل سکتی ہے تو حق کسی ایک ہی مذہب تک کیسے محدود و محصور ہو سکتا ہے"۔

اُس زمانے میں یورپ میں مذہبی معاملات میں زبردست نفاق پھیلا ہوا تھا۔ انکویزیشن کا دَور دَورہ تھا اور کیتھولک اور کالوینسٹ دونوں ایک دوسرے کی طرف رواداری دکھانا گناہِ عظیم سمجھتے تھے۔

اکبر نے کئی سال تک مختلف مذہب کے عالموں سے اپنے مباحثے جاری رکھے۔ یہاں تک کہ سب اُس سے اُکتا گئے اور انھوں نے اکبر کو اپنے اپنے مذہب میں شامل کرنے کی اُمید چھوڑ دی۔ جب ہر مذہب میں حق کا عنصر موجود ہو تو ان میں سے وہ کسی ایک کو کیسے چُن سکتا تھا؟ جے سوئٹ لوگوں کی تحریر کے مطابق وہ کہا کرتا تھا ——— ہندو اپنے اصولوں کو سچا مانتے ہیں اور اسی طرح مسلمان اور عیسائی بھی مانتے ہیں! تو پھر ہم ان میں سے کس کو اختیار کریں؟ اکبر کا سوال بہت برمحل تھا، لیکن جے سوئٹ لوگ اس سے چڑتے تھے اور انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔"اس بادشاہ میں اس دہریے کی سی بے راہ روی کی کیفیت موجود ہے جو عقل کو اعتقاد کا غلام بنانے سے انکار کرتا ہے اور جس بات کی گہرائی تک اس کا کمزور دماغ نہ پہنچ سکے اُس سچائی کو نہ تسلیم کرتے ہوئے وہ ان باتوں کو اپنے فہم و ادراک پر چھوڑ کر مطمئن ہو جاتا ہے، جو فہم انسانی کی حدود سے بالاتر ہوتی ہیں"۔ اگر دہریت کی یہی تعریف ہو تو پھر جتنا زیادہ دہریہ ہوا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

اکبر کا مقصد کیا تھا۔ یہ بات واضح طور پر معلوم نہیں ہوتی ہے۔ کیا وہ اس سوال کو

خالصتاً سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ سب کے لیے ایک قومیت کی بنیاد ڈھونڈ نکالنے کے ارادے سے کہیں وہ مختلف مذہبوں کو ایک ہی راستے پر ڈالنا تو نہیں چاہتا تھا؟ کیا اُس کے جذبات اور محرکات مذہبی تھے؟ میں نہیں جانتا۔ لیکن مجھے یہ خیال زیادہ اچھا ہے کہ اس کے یہ اقدامات مذہب سے زیادہ سیاسی نوعیت کے تھے۔ اس کا مقصد خواہ کچھ رہا ہو، اُس نے سچ مچ ایک نئے مذہب "دینِ الٰہی" کا اعلان کر دیا جس کا وہ خود بانی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دوسری باتوں کی طرح مذہبی معاملوں میں بھی اس کی برتری تسلیم کی جائے۔ اس میں قدم بوسی وغیرہ نفرت پیدا کرنے والی باتیں موجود تھیں۔ یہ نیا مذہب چلا نہیں۔ ہوا یہ کہ اس نے مسلمانوں کو ناراض کر دیا۔

اکبر مطلق العنانیت کی ایک زندہ تصویر تھا۔ پھر بھی یہ سوچ کر لطف آتا ہے کہ اُس پر وسیع سیاسی خیالوں کا کیا اثر ہوا ہوتا۔ اگر وہ مذہب کی آزادی کا احترام کرتا تھا تو عوام کو سیاسی حیثیت سے زیادہ آزادی کیوں نہیں دیتا؟ سائنس کی طرف وہ خوب متوجہ ہوا ہوتا۔ افسوس ہے کہ یہ رجحانات جنھوں نے دور دراز یورپ کے ملکوں کے کچھ لوگوں کو بے چین کرنا شروع کر دیا تھا ہندوستان میں ابھی رائج نہیں ہوئے تھے۔ چھاپے خانے کا بھی اس وقت استعمال ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس لیے تعلیم کا دائرہ بہت محدود تھا۔ لوگوں کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ اکبر ناخواندہ تھا یعنی وہ لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ مگر اس کے تعلیم یافتہ ہونے میں شبہ نہیں ہے۔ وہ کتابیں پڑھوا کر سُننے کا بہت شوقین تھا۔ اُس کے حکم سے بہت سی سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

یہ بھی انوکھی بات ہے کہ ہندو بیواؤں کے ستی ہونے کی رسم کے خلاف اس نے احکامات جاری کیے تھے اور جنگی قیدیوں کو غلام بنائے جانے کی ممانعت کر دی تھی۔

چونسٹھ سال کی عمر میں تقریباً پچاس سال حکومت کرنے کے بعد ۱۶۰۵ء میں اکبر کا انتقال ہوا۔ آگرے کے پاس سکندرہ میں ایک خوب صورت مقبرے میں اُسے سپردِ خاک کیا گیا۔

اکبر کے دورِ حکومت میں شمالی ہندوستان میں اور ایک شخص گزرا ہے، اس کا

نام اُتر پردیش کے ہر ایک گاؤں والے کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ اُس نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ بنارس میں گزارا تھا۔ وہ شمالی ہندوستان میں آج بھی اتنا مقبول ہے کہ اکبر یا کسی اور بادشاہ کو بھی اتنی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ میرا اشارہ تلسی داس کی طرف ہے جنھوں نے ہندی میں رام چرِت مانس یا راماین لکھی ہے۔

پُرتگالی پادریوں کی تحریروں سے ایک دو اقتباسات یہاں اور دینے کی میں اپنی زبردست خواہش کو روک نہیں سکتا ہوں۔ ان کی رائے درباری مصاحبوں کے خیالات سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جب اکبر نے عیسائی مذہب قبول نہیں کیا تو وہ اُس کی طرف سے کافی بدظن بھی ہو گئے تھے مگر پھر بھی وہ لکھتے ہیں کہ —— "وہ دراصل ایک عظیم الشّان شہنشاہ تھا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ایک اچھا حکمراں وہی ہو سکتا ہے، جس کی رعایا اُسے ایک ہی ساتھ فرماں برداری، عزّت، محبّت اور خوف کی نظر سے دیکھے۔ یہ بادشاہ ہر ایک کو عزیز تھا۔ بڑے لوگوں کے لیے سخت چھوٹوں کے لیے مہربان اور سب لوگوں کو خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں جانے پہچانے ہوں یا اجنبی، عیسائی ہوں یا مسلمان یا ہندو، انصاف کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس لیے ہر آدمی یہی سمجھتا تھا کہ بادشاہ اُس کے حق میں رائے رکھتا ہے۔" جے سوئٹ لوگ کہتے ہیں کہ —— "ابھی وہ سلطنت کے معاملوں میں مصروف ہے یا رعایا کو مجرا دے رہا ہے تو دوسرے ہی لمحے وہ اونٹوں کے بال تراشتا ہوا یا پتھر توڑتا ہوا یا لکڑی تراشتا ہوا یا لوہا کوٹتا ہوا نظر آتا تھا۔ اور ان سب کاموں کو وہ اتنی ہوشیاری سے کرتا تھا جیسے وہ ان میں سے ہر کام کا ماہر ہو۔ ایک طاقت ور اور مطلق العنان شہنشاہ ہوتے ہوئے بھی وہ جسمانی محنت کو اپنے لیے کسرِ شان نہیں سمجھتا تھا جیسا کہ آج کل کے کچھ لوگ خیال کرتے ہیں۔"

آگے چل کر یہ بتلایا گیا ہے کہ "وہ بہت کم خوراک تھا اور سال میں صرف تین یا چار مہینے ہی گوشت کھاتا تھا —— سونے کے لیے وہ بہت مشکل سے رات کے تین گھنٹے نکال پاتا تھا...... اُس کی یادداشت غضب کی تھی۔ اُس کے ہزاروں ہاتھی تھے مگر

وہ ان میں سے ہر ایک کو نام سے جانتا تھا۔ اپنے گھوڑوں، ہرنوں اور کبوتروں تک کے نام اُسے یاد تھے۔ اس غضب کی یادداشت اور قوتِ حافظہ کے بارے میں کوئی مشکل ہی یقین کرے گا، ہو سکتا ہے کہ اس بیان میں کسی قدر مبالغے سے کام لیا گیا ہو، مگر اس میں شک کی قطعی گنجائش نہیں ہے کہ وہ عجیب و غریب ذہن و دماغ کا مالک تھا۔ اس کے باوجود کہ اُسے لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا وہ سلطنت میں ہونے والی سبھی باتوں سے باخبر رہتا تھا اور "اُس کے حصولِ علم کی پیاس" ایسی تھی کہ وہ سب باتیں ایک ساتھ سیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ جیسے کوئی فاقہ زدہ انسان کھانے پر یک بارگی ٹوٹ پڑتا ہے۔"

اکبر اتنی ساری خوبیوں کا مالک تھا۔ لیکن ان کے باوجود وہ ایک مطلق العنان اور اپنی مرضی کا آپ پابند تھا۔ حالاں کہ اس نے اپنی رعایا کے تحفّظ کا بہت کچھ سامان کر دیا تھا۔ اور کسانوں پر ٹیکس کا بوجھ بھی ہلکا کر دیا تھا۔ لیکن تعلیم کے ذریعے عوام کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی طرف اس کا ذہن نہیں گیا۔ وہ دَور ہر جگہ مطلق العنانی کا دَور تھا مگر دوسرے مطلق العنان بادشاہوں کے مقابلے میں شہنشاہ اکبر اور اس کی شخصیت بہت درخشندہ ہے۔

اکبر کے جانشین

اکبر حالاں کہ بابر کی تیسری پشت میں تھا مگر اصلاً ہندوستان میں مغل شہنشاہیت کی بنیاد ڈالنے والا یہی شخص تھا۔ چین میں قبلائی خاں کے یوآن خاندان کی طرح اکبر کے بعد مغل شہنشاہوں کا خاندان پوری طرح ہندوستانی بن گیا۔ اکبر نے اپنی سلطنت کو مضبوط بنانے کے لیے جو بڑے بڑے کام انجام دیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا شاہی خاندان اُس کی موت کے سو سال بعد تک حکومت کرتا رہا۔

اکبر کے بعد تین اور قابل شہنشاہ ہوئے۔ لیکن ان میں سے کسی میں کوئی بہت غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جب کوئی بادشاہ مرتا تو اُس کے بیٹوں میں تخت و تاج کے لیے بہت شرمناک طریقے پر چھینا جھپٹی چلتی رہتی۔ شاہی محلوں میں سازشیں اور جانشینی کے لیے خانہ جنگیاں ہوا کرتی تھیں۔ بیٹوں کی باپ سے بغاوت، بھائی کی بھائی سے لڑائی، قتل و غارت گری، رشتہ داروں کی آنکھیں پھڑوانا۔ غرض یہ کہ مطلق العنان شہنشاہیت کے ساتھ چلنے والی ہر طرح کی ذلیل سے ذلیل حرکتیں ہوتی تھیں۔ شان و شوکت اور جاہ و جلال کا تو پوچھنا ہی کیا۔ شاید مغل شہنشاہ اُس زمانے کے تمام شہنشاہوں میں سب سے زیادہ جاہ و حشم والے تھے، لیکن اکثر قحط و خشک سالی اور وبائیں پھیل جاتی تھیں اور بے شمار انسان ان کی نذر ہو جاتے تھے، جب کہ دوسری طرف شاہی دربار دادِ عیش دیتا رہتا تھا۔

اکبر کے زمانے کی مذہبی رواداری اس کے بیٹے جہانگیر کے زمانے میں بھی قائم رہی، لیکن یہ رواداری آہستہ آہستہ مٹتی بھی گئی۔ اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ کچھ زیادتیاں بھی ہونے لگیں۔ بعد میں اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں مندروں کو توڑ کر اور جزیہ دوبارہ رائج کر کے ہندوؤں کو جان بوجھ کر ستانے کی کوشش کی گئی۔ سلطنت کی جو بنیاد اکبر نے اتنی محنت اور جفاکشی سے ڈالی تھی اس کی ایک ایک اینٹ اس طرح کھود کھود کر نکال ڈالی گئی کہ یہ عظیم الشان سلطنت بالکل ڈھے گئی۔

اکبر کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا جو اس کی راجپوت ملکہ کا لڑکا تھا۔ اُس نے کسی حد تک اپنے باپ کی روایات کو برقرار رکھا، لیکن شاید سلطنت کے کاموں سے زیادہ اُسے فنونِ لطیفہ اور مصوری اور پھولوں اور باغوں سے رغبت تھی۔ اُس کے یہاں خوب صورت تصویر محل تھا۔ وہ ہر سال کشمیر جاتا تھا اور میرے خیال میں سری نگر کے پاس شالیمار اور نشاط نام کے مشہور باغ اسی نے تعمیر کرائے تھے۔ جہانگیر کی بیگم ـــــ یا یوں کہیے اُس کی بہت سی بیگمات میں سے ایک حسینۂ عالم نورجہاں تھی جس کے ہاتھوں میں پسِ پردہ حکومت کی اصل باگ ڈور تھی۔ اعتمادُ الدّولہ کا مقبرہ جہانگیر کے عہدِ حکومت میں ہی تعمیر ہوا تھا۔ جب کبھی میں آگرے جاتا ہوں تو فنِ تعمیر کے اس بیش بہا نمونے کو ضرور دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ اس کے حُسن اور دل کشی سے اپنی آنکھوں کی پیاس بُجھا سکوں۔

جہانگیر کے بعد اس کا بیٹا شاہجہاں تخت نشین ہوا اور اس نے تیس۳۰ سال یعنی ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ء تک حکومت کی، وہ فرانس کے چودھویں لوئی کا ہمعصر تھا۔ اس کے دَورِ حکومت میں مغلوں کی شان و شوکت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی اور وہیں سے اُس کے زوال کے آثار بھی صاف نظر آنے لگے تھے۔ بادشاہ کے لیے بیش بہا ہیروں جواہرات سے بنا ہوا مشہور و معروف تختِ طاؤس بنایا گیا۔ پھر آگرے میں جمنا کے کنارے حسن کا وہ خواب تعمیر ہوا جسے تاج محل کہتے ہیں۔ یہ اُس کی محبوب ملکہ ممتاز محل کا مقبرہ ہے۔ شاہجہاں نے بہت سے ایسے کام کیے جن سے اُس کی

شان اور نیک نامی کو دھکا لگتا ہے۔ وہ مذہب کے معاملے میں بہت طرفدار تھا اور جب جنوب میں گجرات میں خوف ناک قحط پڑا تو اُس نے قحط زدوں کی امداد کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ اس کی رعایا کی اس بدبختی اور غربت و افلاس کے مقابلے میں اس کی دولت و حشمت بہت کوتاہ نظر آتی ہے۔ پھر بھی سنگ مرمر اور سنگ و خشت کے اندر حسن و دل کشی کے جو جادو وہ چھوڑ گیا ہے ان کی وجہ سے اُس کی بہت سی باتیں بھلائی جا سکتی ہیں۔ اس کے عہدِ حکومت میں مغل فنِ تعمیر اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ تاج کے علاوہ اس نے آگرے کی موتی مسجد، دلّی کی عظیم الشان جامع مسجد، لال قلعہ اور لال قلعے کے اندر دیوانِ عام اور دیوانِ خاص بنوائے۔ ان عمارتوں میں اعلیٰ درجے کی سادگی ہے۔ ان میں سے کچھ تو بہت ہی عظیم الشان، سُبک اور دل کش ہیں۔ اور ان کا حسن، جنّت کی حوروں کے ماورائی حُسن سے سرشار ہے۔

لیکن اس ماورائی حسن کے پیچھے غربت و افلاس کی ماری ہوئی وہ جنتا تھی جو ان خوب صورت محلوں کی قیمت چکاتی تھی۔ مگر جس کے بیشتر آدمیوں کے رہنے کے لیے مٹّی کے جھونپڑے بھی نہیں تھے۔ مطلق العنانیت اور زور و زبردستی کی حکومت کا بول بالا تھا۔ شہنشاہ اُس کے نائب اور صوبیدار اگر کسی سے ناخوش ہو جاتے تو اُس پر قہر نازل ہو جاتا تھا۔ درباری سازشوں کا دَور دَورہ تھا۔ اکبر کی رحم دلی، رواداری اور نظامِ حکومت کی سلیقہ مندی قصّۂ پارینہ بن چکی تھیں۔ حالات و واقعات خود بخود تباہی و بربادی کی طرف لیے جا رہے تھے۔

اس کے بعد آخری مغل شہنشاہ اورنگ زیب تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنی حکومت کی بسم اللہ اپنے باپ کو قید میں ڈال کر کی۔ اس نے ۱۶۵۹ء سے ۱۷۰۷ء تک یعنی اڑتالیس سال تک حکومت کی۔ اپنے دادا جہانگیر کی طرح وہ نہ تو ادب اور فنونِ لطیفہ سے دل چسپی رکھتا تھا۔ اور نہ اپنے باپ شاہجہاں کی طرح فنِ تعمیر سے۔ وہ انتہائی سادگی پسند فقیر منش اور کٹّر مسلمان تھا اور اپنے مذہب کے سوا دوسرے کسی مذہب کا روادار نہیں تھا۔ دربار کی شان و شوکت تو قائم رہی مگر اپنی شخصی زندگی میں اورنگ زیب

نہایت سادہ مزاج اور فقیر منش آدمی تھا۔ اس نے بالارادہ ہندوؤں کو ستانے کی پالیسی اختیار کی اور اکبر کی 'صلح کل' کی پالیسی اور دوستانہ سلوک سے سب کو ملا کر رکھنے کی حکمتِ عملی کو اُلٹ دیا۔ اس طرح اس نے اس بنیاد کو ہی اکھاڑ پھینکا جس پر مغل سلطنت قائم تھی۔ اس نے ہندوؤں پر دوبارہ جزیہ لگا دیا، جہاں تک ہو سکا ہندوؤں سے تمام عہدے چھین لیے۔ جن راجپوت سرداروں نے اکبر کے وقت میں شاہی خاندان کی مدد کی تھی، اُنھیں کو اُس نے ناراض کر کے راجپوتوں سے لڑائی مول لے لی۔ اُس نے ہزاروں مندروں کو مسمار کر ڈالا۔ اِس طرح بہت سی پُرانی خوب صورت عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ جہاں ایک طرف جنوب میں اس کی سلطنت پھیل رہی تھی، بیجاپور اور گولکنڈہ اس کے قبضے میں آچکے تھے اور دور جنوب سے اُسے خراج ملنے لگا تھا وہاں دوسری طرف اس سلطنت کی بنیادیں ڈھیلی پڑکر دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ چاروں طرف دشمن پیدا ہو رہے تھے۔ جزیہ کی مخالفت میں ہندوؤں کی طرف سے جو عریضہ پیش کیا گیا تھا اُس میں لکھا تھا کہ "یہ ٹیکس" انصاف کے خلاف ہے۔ اسی طرح یہ اچھی پالیسی کے بھی خلاف ہے، کیوں کہ یہ ملک کو اور غریب بنا دے گا اس کے علاوہ یہ بالکل نئی بات ہے اور ہندوستان کے قانونوں کے خلاف ہے"۔۔۔۔ سلطنت کی جو حالت ہو رہی تھی اُس کے بارے میں اِس میں لکھا تھا کہ: "جہاں پناہ کی سلطنت میں بہت سے لوگ حکومت کے خلاف ہو گئے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سلطنت کے اور بھی علاقے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ کیوں کہ سب جگہ بے روک ٹوک لوٹ مار اور بربادی کا بازار گرم ہو رہا ہے۔ آپ کی رعایا پیروں تلے روندی جاتی ہے۔ آپ کی سلطنت کا ہر ایک صوبہ غریب ہوتا جا رہا ہے۔ آبادی کم ہو رہی ہے اور مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں"۔

عام لوگوں میں پھیلی ہوئی یہ تباہی اُس بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ تھی جو اگلے پچاس ساٹھ سال کے اندر ہندوستان میں رونما ہونے والی تھی۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد عظیم الشان مغل سلطنت کی ایک دم اور مکمل تباہی اسی کا نتیجہ تھی۔ بڑے بڑے انقلابات اور بڑی بڑی تحریکوں کے پس پُشت اقتصادی اسباب ہوا کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ

یورپ اور چین کی بڑی بڑی سلطنتوں کے خاتمے سے پہلے کیسی اقتصادی بربادی ہوئی۔ اور بعد میں انقلاب ہوا۔ یہی حال ہندوستان میں ہوا۔

دوسری تمام سلطنتوں کی طرح مغل سلطنت کا زوال بھی اس کی داخلی کمزوریوں کا نتیجہ تھا۔ اس کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ ہندوؤں میں بغاوت کی نئی تڑپ پیدا ہو رہی تھی جو اورنگ زیب کی پالیسی کی وجہ سے ایک دم اُبل پڑی۔ اس نے سلطنت کے زوال کے اس عمل کو ذرا اور تیز کر دیا۔ لیکن ایک طرح کی یہ مذہبی ہندو قومیت اورنگ زیب کی حکومت سے پہلے ہی زور پکڑ چکی تھی اور ممکن ہے کہ اورنگ زیب کچھ کچھ اسی کی وجہ سے اتنی طرف داری اور ظلم و تشدد پر اُتر آیا ہو۔ مرہٹے اور سکھ وغیرہ اس ہندو قومیت کی بیداری کے نشان تھے۔ بالآخر انھوں نے مغل سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا۔ لیکن اِس حاصل کی ہوئی دولت سے وہ کچھ فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ جس وقت یہ لوگ مالِ غنیمت کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے، انگریز خاموشی اور چالاکی کے ساتھ گھس آئے اور اُسے ہتھیا بیٹھے۔

جب مغل شہنشاہ فوج کے ساتھ کوچ کرتا تھا تو ان کا شاہی لشکر کس طرح کا ہوتا تھا؟ وہ ایک بڑا زبردست لشکر ہوتا تھا جس کا دائرہ تقریباً تیس میل اور آبادی پانچ لاکھ ہوتی تھی۔ اس آبادی میں شہنشاہ کے ساتھ چلنے والی فوج تو ہوتی ہی تھی۔ اس کے علاوہ اس بڑے سے چلتے پھرتے شہر میں لاکھوں دوسرے آدمی اور سینکڑوں بازار ہوتے تھے۔ انھیں چلتے پھرتے لشکروں میں "اردو" یعنی لشکر کی زبان کا ارتقاء ہوا۔

مغل دورِ حکومت کی مصوری کے بہت سے نمونے آج بھی ملتے ہیں۔ یہ بہت باریک اور نفیس مصوری کے نمونے ہیں۔ شہنشاہوں کی تصویروں کا تو ایک پورا تصویر محل ہی ملتا ہے۔ یہ تصویریں بابر سے لے کر اورنگ زیب تک تمام شہنشاہوں کی شخصیت کو نہایت خوبی سے اُجاگر کرتی ہیں۔

مغل شہنشاہ دن میں کم سے کم دو بار جھروکے سے لوگوں کو درشن دیا کرتے تھے۔

اور عرضیاں لیا کرتے۔ جب ۱۹۱۱ء میں انگریز شہنشاہ جارج پنجم دلّی میں تاج پوشی کے دربار کے لیے ہندوستان آیا تو اُس وقت بھی اس طرح کا اہتمام کیا گیا تھا۔

میں نے ابھی تک یہ نہیں بتلایا کہ بعد کے مغل شہنشاہوں کا غیر ملکیوں کے ساتھ کیا سلوک تھا۔ اکبر کے دربار میں پُرتگالی پادریوں پر خاص چشمِ عنایت ہوا کرتی تھی اور یورپ کی دُنیا کے ساتھ اکبر کے جو کچھ بھی تعلقات تھے، وہ اُنھیں پادریوں کے ذریعے قائم تھے۔ اکبر ان کو یورپ کی سب سے طاقت ور قوم سمجھتا تھا کیوں کہ سمندروں پر ان کا اقتدار تھا۔ انگریزوں کا اُس وقت پتہ بھی نہ تھا۔ اکبر کی گوا لینے کی بڑی خواہش تھی اور اس نے اس پر حملہ بھی کیا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔ مغل فوجی بحری سفر کو پسند نہیں کرتے تھے اور بحری طاقتوں کے آگے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کیوں کہ اس وقت مشرقی بنگال میں جہاز بنانے کا کام اپنے عروج پر تھا۔ لیکن یہ جہاز بیشتر مال ڈھونے کے کام آتے تھے۔ سمندر پر مقابلہ نہ کرنے کی یہ کمزوری مغل سلطنت کی تباہی کا ایک سبب بتائی جاتی ہے۔ اب بحری طاقتوں کی برتری کا دور شروع ہو گیا تھا۔

جب انگریزوں نے مغل دربار میں جانے کی کوشش کی تو پُرتگالیوں کی ان سے رقابت ہوئی اور اُنھوں نے جہانگیر کے کان بھرنے شروع کیے۔ لیکن انگلینڈ کے جیمس اوّل کا سفیر سر ٹامس رو ۱۶۱۵ء میں کسی طرح جہانگیر کے دربار میں جا پہنچا۔ اُس نے شہنشاہ سے بہت سی سہولتیں حاصل کرلیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کی داغ بیل ڈال دی۔ اسی درمیان انگریزی بیڑوں نے ہندوستانی سمندر پر پُرتگالی بیڑوں کو شکست دے دی۔ انگلینڈ کا ستارہ عروج پر تھا۔ اور پُرتگال کا ستارہ مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔ ڈچوں اور انگریزوں نے آہستہ آہستہ پُرتگالیوں کو مشرقی سمندروں سے باہر نکال دیا۔ ۱۶۲۹ء میں ہگلی میں شاہجہاں اور پُرتگالیوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ پُرتگالی باقاعدہ غلاموں کی تجارت کرتے تھے اور لوگوں کو زبردستی عیسائی بنا رہے تھے۔ پُرتگالیوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن مغلوں نے ہگلی پر قبضہ جما لیا۔ پُرتگال جیسا چھوٹا سا ملک بار بار کی اِس لڑائی سے تنگ آگیا۔ اُس نے سامراج پھیلانے

اس مقابلے سے پیچھا چھڑالیا، لیکن وہ گوا اور دوسری کئی نوآبادیوں سے چپکا رہا۔
اسی دوران انگریزوں نے مدراس اور سورت کے پاس کے ساحلی علاقوں کے شہروں میں کارخانے کھول دیے۔ ۱۶۳۹ء میں انھوں نے ہی مدراس شہر کی بنیاد ڈالی تھی۔ ۱۶۶۲ء میں انگلینڈ کے شہنشاہ چارلس دوم نے پرتگال کی کیتھرائن آف برگنیزا کے ساتھ شادی کی اور بمبئی کا جزیرہ نما اُسے جہیز میں ملا۔ کچھ دنوں بعد اُس نے اِسے بہت سستے دام میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ واقعہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت کا ہے۔ پرتگالیوں پر فتح پانے کے نشے میں سرشار ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ سوچ کر کہ مغل سلطنت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ ۱۶۸۵ء میں ہندوستان میں زبردستی اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کی لیکن اسے سخت نقصان اُٹھانا پڑا۔ انگلینڈ سے جنگی جہاز دوڑے ہوئے آئے اور اورنگ زیب کی حکومت پر مشرق میں بنگال پر اور مغرب میں سورت پر حملے کیے گئے۔ لیکن ابھی مغلوں میں دم خم موجود تھا انھوں نے انگریزوں کو بُری طرح پسپا کر دیا۔ انگریزوں نے اس سے سبق سیکھا اور آئندہ محتاط ہو گئے۔ اورنگ زیب کی موت پر بھی جب مغل طاقت کا شیرازہ بکھرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا وہ کئی سال بعد تک کوئی بڑا حملہ کرنے میں پس و پیش کرتے رہے۔ ۱۶۹۰ء میں جاب چارنک نے کلکتہ شہر کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح مدراس، بمبئی اور کلکتہ ان تینوں شہروں کی بنیاد انگریزوں نے ڈالی اور شروع شروع میں یہ شہر انگریزوں کی کوششوں سے ہی بڑھے۔
اب فرانس نے بھی ہندوستان میں قدم رکھا۔ تجارت کی ایک فرانسیسی کمپنی قائم ہوئی۔ ۱۶۶۸ء میں اس کمپنی نے سورت اور کچھ دوسرے مقامات میں کارخانے کھولے۔ کچھ سال بعد اُس نے پانڈیچری شہر خرید لیا۔ جو مشرقی ساحل پر سب سے اہم تجارتی بندرگاہ بن گیا۔
۱۷۰۷ء میں ۹۰ سال کی عمر میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ اس کی چھوڑی ہوئی شاندار مملکت، یعنی ہندوستان کو ہتھیانے کے لیے کشمکش شروع ہو گئی ایک طرف آپ ہی کی نااہل اولاد اور اُس کے کچھ بڑے بڑے صوبیدار تھے، اُدھر مرہٹے اور سکھ تھے۔ دوسری طرف شمال مغرب کی سرحد پار کے لوگ دانت گڑائے ہوئے تھے اور سمندر پار کی دو بڑی قومیں انگریز اور فرانسیسی تھے۔ بیچارے ہندوستان والوں کی فکر کسے ہوتی۔

شیواجی

اورنگ زیب کی موت کے کچھ ہی دنوں بعد سکھوں نے بغاوت کی اسے تو دبا دیا گیا، لیکن سکھ لوگ اپنی طاقت بڑھاتے رہے اور پنجاب میں اپنی حالت کو مضبوط بناتے رہے۔

یہ سب بغاوتیں تو دِقّت میں ڈالنے والی تھیں ہی مگر مغل سلطنت کو اصل خطرہ جنوب مغرب میں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے تھا۔ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں ہی شاہ جی بھونسلے نام کے ایک مرہٹے سردار نے سر اُٹھایا تھا۔ وہ پہلے تو احمد نگر کی ریاست میں اور بعد میں بیجاپور کی ریاست میں حاکم رہا تھا۔ لیکن مرہٹوں کی شہرت کو چار چاند لگانے اور مغل سلطنت کو تھرا دینے والا کوئی تھا تو وہ اس کا لڑکا شیواجی تھا جس کا جنم ۱۶۲۷ء میں ہوا تھا۔ وہ اُنیس ۱۹ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اُس نے لوٹ مار شروع کر دی اور پونا کے پاس پہلا قلعہ جیت لیا۔ وہ ایک بہادر سپہ سالار چھاپہ ماروں کا قابل سردار اور بڑے بڑے خطرات میں ہمت سے کام لینے والا شخص تھا۔ اُس نے بہادر اور طاقت ور پہاڑیوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا اور اورنگ زیب کے سپہ سالاروں کو خوب پریشان کیا۔ ۱۶۶۵ء میں اُس نے اچانک سورت پر دھاوا بول دیا۔ جہاں انگریزوں کا کارخانہ تھا۔ اور شہر کو لوٹ لیا۔ کچھ لوگوں کی باتوں میں آکر وہ آگرے میں اورنگ زیب کے دربار میں بھی گیا۔ لیکن جب اُس کے ساتھ ایک خود مختار راجا کا سا سلوک نہیں کیا گیا تو اُس نے اپنی

ہتک محسوس کی۔ اُسے وہاں قید کر لیا گیا مگر وہ بھاگ نکلا۔ پھر بھی اورنگ زیب نے راجا کا خطاب دے کر اُسے اپنی طرف ملا لینے کی کوشش کی۔

لیکن شیواجی نے پھر لڑائی چھیڑ دی اور جنوب کے مغل حاکم تو اُس سے اتنا ڈر گئے کہ وہ اپنی حفاظت کے لیے اُسے نذرانے دینے لگے۔ یہی وہ چیز تھی جو تاریخ میں "چوتھ" کے نام سے مشہور ہے یعنی لگان کا چوتھا حصّہ، جسے مرہٹے جہاں جاتے وہاں کے حاکموں سے وصول کرتے تھے۔ اس طرح مرہٹوں کی طاقت بڑھتی گئی اور دلّی کی سلطنت کمزور ہوتی گئی۔ ۱۶۷۴ء میں شیواجی نے رائے گڑھ میں بڑے دھوم دھام سے تخت نشینی کا جشن منایا۔ ۱۶۸۰ء میں اس کی موت واقع ہوئی اُس وقت تک وہ برابر فتح پر فتح حاصل کرتا رہا۔

مرہٹوں کے دیش کے مرکزی شہر پونا میں کچھ وقت گزارنے پر بہت آسانی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہاں کے لوگ شیواجی سے کتنی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔ مذہبی رنگ میں جس قومی بیداری کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں، یہ اُسی کا نشان تھی۔ اقتصادی گراوٹ اور عوام کی بدحالی نے اس کے لیے زمین ہموار کر دی اور رام داس اور تکارام نام کے دو مرہٹے بھگت شاعروں نے اپنے گیتوں اور بھجنوں سے اس کی آبیاری کی۔ اس طرح مرہٹوں میں بیداری اور اتحاد کا جذبہ پیدا ہوا اور ٹھیک اسی وقت ان کی رہنمائی کر کے فتح حاصل کرنے والا ایک جنگجو مردِ میدان پیدا ہو گیا۔

کلائیو اور ہیسٹنگز

اٹھارہویں صدی میں یورپ میں انگلینڈ اور فرانس کے درمیان اکثر و بیشتر لڑائیاں چھڑی رہتی تھیں۔ ان ملکوں کی نمائندگی کرنے والے بھی ہندوستان میں باہم ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ یورپ میں دونوں ملکوں میں باقاعدہ صلح ہوجانے کے بعد بھی کبھی کبھی ہندوستان میں ان کی لڑائیاں جاری رہتی تھیں۔ دونوں طرف لوٹ کھسوٹ کرکے مال ہڑپنے والے لوگ تھے جن کی سب سے بڑی خواہش تھی دولت اور اقتدار حاصل کرنا۔ اس لیے ان کے درمیان زبردست مقابلے کا ہونا یقینی تھا فرانسیسیوں میں اس وقت سب سے زوردار آدمی ڈوپلے تھا اور انگریزوں میں کلائیو۔ ڈوپلے نے دو ریاستوں کے آپسی جھگڑوں میں دخل اندازی کرنے کا فائدہ مند کھیل شروع کیا۔ پہلے تو وہ اپنے تربیت یافتہ فوجی سپاہی کرائے پر دے دیتا اور بعد میں خود ریاست ہڑپ کرجاتا۔ فرانسیسیوں کا اثر بڑھنے لگا۔ لیکن انگریزوں نے بھی بہت جلدی انھیں طریقوں کو اختیار کرنا شروع کیا اور وہ ان سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ دونوں بھوکے گدھوں کی طرح ریاستوں میں پھوٹ اور انتشار کی تاک میں رہتے تھے اور اس میں انھیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جنوب میں جب کبھی جانشینی کے بارے میں تکرار ہوتی تو اکثر انگریز ایک دعوے دار کی اور فرانسیسی دوسرے کی طرف داری کرتے دکھائی پڑتے تھے۔ پندرہ سال کی رسہ کشی (۱۷۴۶ء سے ۱۷۶۱ء) کے بعد انگلینڈ نے

فرانس پر فتح حاصل کرلی۔ ہندوستان میں ان حوصلہ مند انگریزوں کو اپنی کارگزاریوں کے لیے اپنے ملک کی پوری حمایت حاصل تھی۔ لیکن ڈوپلے اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ملک سے ایسی کوئی مدد نہیں ملی۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کی پُشت پر انگریز تاجر اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصّے دار تھے۔ اور وہ پارلیمنٹ اور حکومت میں اثر رکھتے تھے۔ لیکن فرانسیسیوں کو حکومت سے اس طرح کی مدد نہیں مل رہی تھی۔ پندرھواں لوئی فرانس کا شہنشاہ تھا جو بہت مزے میں خود کو تباہی کی طرف لیے جا رہا تھا۔ بحری راستوں پر انگریزوں کے قبضے نے بھی ان کو بہت مدد پہنچائی۔ انگریز اور فرانسیسی دونوں ہی ہندوستانی سپاہیوں کو فوجی تربیت دیتے تھے اور کیوں کہ ان سپاہیوں کے پاس ملکی سپاہیوں سے بہتر اسلحے ہوتے تھے اور ان کی تنظیم بھی ان سے بہتر ہوتی تھی اس لیے ان کی بڑی مانگ رہتی تھی۔

پس انگریزوں نے ہندوستان میں فرانسیسیوں کو شکست دے دی اور چندرنگر اور پانڈیچری کے فرانسیسی شہروں کو بالکل تباہ و برباد کرڈالا۔ یہ بربادی ایسی ہوئی کہ دونوں شہروں میں ایک بھی مکان صحیح سلامت نہیں بچا۔ اس وقت سے ہندوستان کی سرزمین سے فرانسیسیوں کے غائب ہونے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

اس زمانے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ کا میدان صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھا۔ ہندوستان کے علاوہ کیناڈا اور دوسرے مقامات میں بھی ان کی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ کیناڈا میں بھی انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد امریکا کی نوآبادیوں سے انگلینڈ کو ہاتھ دھونا پڑا اور فرانس نے ان نوآبادیوں کو مدد دے کر انگلینڈ سے اپنا بدلہ لے لیا۔

فرانسیسیوں کو نکال باہر کرنے کے بعد انگریزوں کے راستے میں اور کیا رُکاوٹیں رہ گئی تھیں! مغربی وسط ہندوستان اور کسی حد تک شمال میں بھی مرہٹوں کا اقتدار تھا۔ حیدرآباد کا نظام بھی تھا، مگر اُس کی کچھ بہت بڑی حیثیت نہیں تھی۔ جنوب میں البتہ ایک طاقت درمقابلے پر اُبھر رہا تھا وہ تھا حیدرعلی۔ حیدرعلی وجے نگر کی

پرانی ریاست کے کچھ بچے ہوئے حصوں کا جہاں آج کل کی میسور ریاست ہے، حکمراں بن بیٹھا۔ مشرق میں بنگال، سراج الدولہ نام کے ایک بالکل ہی نکمے آدمی کے قبضے میں تھا۔ دلی کی سلطنت جیسا ہم پہلے کہہ آئے ہیں بس ایک خیالی سلطنت رہ گئی تھی لیکن سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ ۱۷۵۶ء تک یعنی نادر شاہ کے حملے کے بہت بعد تک جس نے مرکزی حکومت کے سارے تنک کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا انگریز دلی سلطنت سے اپنی ماتحتی ظاہر کرتے ہوئے، اس کو نذرانے پیش کرتے رہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ اورنگ زیب کے وقت میں ایک بار انگریزوں نے بنگال میں سر اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ بری طرح پسپا ہوئے، اور اس شکست نے ان کا دماغ ٹھکانے لگا دیا۔ وہ دوبارہ ہمت کرنے کے لیے بہت دنوں تک اونچ نیچ سوچتے رہے، حالاں کہ شمال کی حالت اتنی ابتر ہو چلی تھی کہ وہاں کسی بھی دلیر اور حوصلہ مند آدمی کے لیے اپنی حوصلہ مندی کی آزمائش کا بہترین موقع تھا۔

کلائیو نام کا ایک انگریز، جس کی ایک عظیم الشان سامراج کے معمار کی حیثیت سے انگریز تعریفیں کرتے ہیں، ایسا ہی حوصلہ مند شخص تھا۔ اپنی شخصیت اور اپنے کارناموں سے وہ اس بات کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے کہ سامراج کس طرح قائم کیے جاتے ہیں۔ وہ بڑا دلیر، خود غرض اور حد درجے کا لالچی انسان تھا۔ اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے وہ ہر طرح کی جعل سازی اور دغابازی کے لیے تیار رہتا تھا۔ بنگال کا نواب سراج الدولہ جو انگریزوں کی بہت سی حرکتوں سے تنگ آ چکا تھا، اپنے دارالسلطنت مرشد آباد سے چل کر کلکتے آ دھمکا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ دلوں کو دہلا دینے والا کال کوٹھری کا واقعہ اسی وقت کا بتایا جاتا ہے۔ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نواب کے حاکموں نے ایک بہت ہی تنگ و تاریک اور ہر طرف سے بند اور گھٹی ہوئی کوٹھری میں بہت سے انگریزوں کو ایک ساتھ بند کر دیا۔ جس میں سے بہت سے دم گھٹ جانے سے مر گئے۔ یہ حرکت، اس میں شک نہیں کہ بہت وحشیانہ ہے لیکن اس سارے قصے کی بنیاد ایک ایسے بیان پر ہے جو بہت معتبر نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک

فرضی داستان ہے۔۔

نواب نے کلکتے پر قبضہ کر کے جو کامیابی حاصل کی؛ اس کا بدلہ کلائیو نے لے لیا۔ سامراج کے اس معمار نے نواب کے وزیر میر جعفر علی کو رشوت دے کر بغاوت کے لیے اُکسایا اور اس طرح اپنا اُلّو سیدھا کیا۔ اس سلسلے میں ایک جعلی دستاویز کا قصہ بھی آتا ہے جو کافی طویل ہے۔ جعل سازی اور دغابازی سے کام لے کر کلائیو نے اپنا راستہ صاف کرلیا اور ۱۷۵۷ء میں نواب کو پلاسی کی جنگ میں شکست دے دی۔ جیسی جنگیں آج ہوا کرتی ہیں ان کے مقابلے میں یہ جنگ بہت مختصر تھی۔ اس میں تو کلائیو نے دراصل اپنی سازشوں کے ذریعے جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی قریب قریب میدان مار رکھا تھا۔ لیکن اس چھوٹی سی لڑائی کا نتیجہ بہت بڑا نکلا۔ اس نے بنگال کی قسمت کا فیصلہ کردیا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی شروعات بھی اکثر لوگ پلاسی کی جنگ سے ہی مانتے ہیں۔ فریب اور جعل سازی کی ان کریہہ بنیادوں پر ہندوستان میں برطانوی سامراج کی تشکیل ہوئی۔ مگر سب ہی سامراجوں اور سامراج کے معماروں کی قریب قریب ایک ہی جیسی کہانی ہوتی ہے۔

قسمت کے کھیل کے اس نئے انقلاب نے بنگال کے فریبی اور لالچی انگریزوں کا دماغ آسمان پر چڑھادیا۔ وہ بنگال کے مالک بن بیٹھے اور ان کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ رہا۔ بس پھر کیا تھا کلائیو کی چابک دست رہنمائی میں انھوں نے بنگال کے خزانے پر ہاتھ مارنا شروع کیا اور اُسے بالکل خالی کردیا۔ کلائیو نے چالیس لاکھ نقد روپے اپنی نذر کیے اور اسی پر اکتفا نہ کر کے کئی لاکھ روپے سال کی آمدنی والی ایک بہت بڑی جاگیر بھی ہتھیالی۔ باقی تمام انگریزوں نے بھی اسی طرح اپنے ہر جائز دصول کیے۔ دولت لوٹنے کے لیے بہت شرمناک حرکتیں بھی سرزد ہوئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین نے تو اپنی لالچ اور بے غیرتی کی انتہا کردی۔ انگریز ایک طرح سے بنگال میں نواب بنانے کے ٹھیکیدار بن گئے۔ وہ اپنی مرضی کے موافق جب چاہتے کسی کو نواب بنادیتے۔ نواب بنانے کی ٹھیکیداری میں رشوت اور نذرانوں کا بازار خوب گرم تھا۔ نظم ونسق کی

ذمّے داری اُن پر نہ تھی، یہ تو بے چارے انھی چند روزہ نوابوں کا منصب تھا۔ ان کا کام بس اتنا تھا کہ جلد سے جلد دولت اکٹھی کرلیں۔ کچھ سال بعد ۱۷۶۴ء میں انگریزوں نے بکسر میں ایک اور جنگ فتح کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلّی کا نام نہاد شہنشاہ بھی ان کی اماں میں آگیا۔ انھوں نے اُسے پنشن دے دی۔ اب بنگال اور بہار میں تنہا انگریزوں کا اقتدار ہوگیا۔ ملک سے جو بے شمار دولت وہ لوٹ رہے تھے انھیں صرف اتنے ہی سے اطمینان نہ ہوا اور انھوں نے دولت جمع کرنے کے نئے نئے طریقے ڈھونڈنے شروع کیے۔ ملک کی اندرونی تجارت سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ مگر اب وہ خراج ادا کیے بغیر ہی، جو دیسی مال کے تاجروں کے لیے ادا کرنا ضروری تھا، تجارت کرنے پر اتر آئے۔ ہندوستان کی صنّاعی اور تجارت پر انگریزوں کی یہ پہلی چوٹ تھی۔

شمالی ہند میں انگریزوں کی حالت اب ایسی ہوگئی تھی کہ ساری طاقت اور دولت تو ان کے ہاتھ میں تھی لیکن کوئی ذمّے داری ان پر نہیں تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر لُٹیروں کو بھلا یہ جاننے کی کیا ضرورت تھی کہ ایمان داری کی تجارت، بے ایمانی کی تجارت اور کھلّم کھلّا لوٹ مار کے درمیان کیا فرق ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندوستان سے مالا مال ہو کر لوٹتے تھے اور اپنے ملک میں "لارڈ" (نواب) کا لقب پاتے تھے۔

سیاسی خطرات اور افراتفری، بارش کی کمی اور انگریزوں کے جعل اور فریب سے اقتدار بڑھانے کی پالیسی وغیرہ ان سب کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۷۰ء میں بنگال اور بہار میں زبردست قحط پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ ان صوبوں کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی اسی کی نذر ہوگئی۔ لاکھوں آدمی بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان بحق ہوگئے۔ ایک کے بعد ایک علاقہ اُجاڑ ہوتا چلا گیا اور بستیوں کی جگہ جنگل دکھائی دینے لگے۔ جنھوں نے زرخیز کھیتوں اور گاؤں کو ڈھک لیا۔ بھوک سے مرنے والوں کی مدد کے لیے کسی نے کچھ نہ کیا۔ نواب کے پاس نہ تو طاقت تھی اور نہ اقتدار اور نہ ان کاموں میں اُسے کوئی دلچسپی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس اقتدار اور طاقت تو تھی مگر وہ کوئی ذمّے داری لینے یا مدد کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی تھی۔ اس کا کام تو دولت اکٹھی کرنا اور مال گذاری وصول کرنا تھا۔

اور یہ کام اس نے اِس قابلیت اور خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ اس زبردست قحط اور ایک تہائی آبادی کے خاتمے کے باوجود باقی ماندہ لوگوں سے پوری رقم وصول کر لی گئی۔ قحط کے زمانے میں تو انھوں نے واجب مال گزاری سے بھی زیادہ رقم وصول کی اور سرکاری رپورٹوں کے مطابق یہ کام انھوں نے "زور زبردستی کے ساتھ کیا"۔ اس آفتِ ناگہانی کے چنگل سے بچے ہوئے بھوک سے ادھ مرے لوگوں کے ساتھ جس زبردستی سے پیش آیا گیا اس کے تصور سے ہی دل کانپ اُٹھتا ہے۔

بنگال جیتنے اور فرانسیسیوں پر فتح حاصل ہو جانے پر بھی جنوب میں انگریزوں کو بہت دِقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آخری فتح نصیب ہونے سے پہلے انھیں کئی بار شکست اور بدنامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میسور کا حیدرعلی ان کا بہت کٹر دشمن تھا۔ وہ ایک قابل سپہ سالار تھا۔ اس نے انگریز فوجوں کو بار بار شکست دی۔ ۱۷۶۹ء میں ٹھیک مدراس کے قلعے کے نیچے اُس نے اپنی شرائط پر انگریزوں سے معاہدہ نامہ لکھوا لیا۔ دس سال بعد اُسے پھر کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ اُس کی موت کے بعد اُس کا بیٹا سلطان ٹیپو انگریزوں کی راہ کا کانٹا بن گیا۔ ٹیپو کو پوری طرح شکست دینے میں میسور کی دو جنگیں اور ہوئیں اور اس میں کئی سال لگ گئے۔ پھر موجودہ میسور[1] کے مہاراجا کا ایک جدِاعلیٰ انگریزوں کے زیرِ نگیں تخت پر بٹھا دیا گیا۔

۱۷۸۲ء میں جنوب میں مرہٹوں نے بھی انگریزوں کو شکست دی۔ شمال میں گوالیار کے سندھیا کا دبدبہ تھا اور دلّی کا بے چارہ بدقسمت بادشاہ اس کی مٹھی میں تھا۔

اسی دوران انگلینڈ سے وارن ہیسٹنگز بھیجا گیا۔ وہ یہاں کا پہلا گورنر جنرل ہوا۔ برطانوی پارلیمنٹ اب ہندوستان کے معاملات میں دل چسپی لینے لگی۔ ہیسٹنگز ہندوستان کے انگریز حکمرانوں میں سب سے بڑا مانا جاتا ہے لیکن اُس کے دورِ حکمرانی میں بھی سرکاری انتظام میں بہت پراگندگی تھی۔ ہیسٹنگز کے ناجائز طریقے سے روپیہ اینٹھنے کے قصے

---

[1] آزادی سے پہلے کی میسور ریاست

مشہور ہو چکے ہیں۔ جب ہیسٹنگز انگلینڈ واپس گیا تو پارلیمنٹ میں اس پر ہندوستان میں بدنظمی پھیلانے کا الزام لگایا گیا لیکن بہت دن مقدمہ چلنے کے بعد وہ بری ہو گیا اس سے پہلے پارلیمنٹ نے کلائیو کی لعنت ملامت کی تھی اور اس نے تو سچ مچ خودکشی ہی کر ڈالی۔ اس طرح ان لوگوں کی لعنت ملامت کر کے یا ان پر مقدمہ چلا کر برطانیہ نے تو اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیا، لیکن دل ہی دل میں وہ ان کی قدر بھی کرتا تھا اور ان کی پالیسیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ کلائیو اور ہیسٹنگز لعنت ملامت کا نشانہ ضرور بنے مگر یہ لوگ سامراج کے معماروں کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتے ہیں اور جب تک دوسری قوموں کو غلام بنا کر اس پر زبردستی حکومتیں تسلط کر کے ان کی لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس وقت تک ایسے لوگ برابر سامنے آتے رہیں گے اور قدر و منزلت کے مستحق بنیں گے۔ لوٹ کھسوٹ کے طریقے مختلف دور میں بدلتے ضرور رہے ہیں، مگر ان کی بنیاد میں ہمیشہ ایک جیسا جذبہ ہی کارفرما رہتا ہے۔

ہیسٹنگز نے ہندوستانی راجاؤں اور نوابوں کو انگریزوں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنانے کی پالیسی کی ابتدا کی۔

ہندوستان میں جیسے جیسے برطانوی سامراج جمتا گیا ویسے ہی ویسے مرہٹوں، افغانوں، سکھوں، برمیوں وغیرہ سے بہت سی جنگیں ہوئیں۔ ان جنگوں کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لڑائیاں گو کہ انگلینڈ کے مفاد کی خاطر لڑی جاتی تھیں مگر ان کا خرچ ہندوستان کے سر پڑتا تھا۔ انگلینڈ یا انگلینڈ والوں پر اس کا کوئی بار نہیں پڑتا تھا۔ وہ تو اطمینان سے لطف اٹھا رہے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس وقت ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی نام کی ایک تجارتی کمپنی حکومت کر رہی تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ کے اختیارات بڑھتے جا رہے تھے لیکن ہندوستان کی قسمت زیادہ تر تاجر لٹیروں کے ایک گروہ کے ہاتھوں میں تھی۔ انتظام حکومت کی حیثیت بھی محض تاجرانہ تھی۔ تجارت کیا تھی ڈاکہ اور لوٹ مار تھی۔ اس وقت تجارت اور لوٹ کے درمیان کسی قسم کا امتیاز کرنا مشکل تھا۔ کمپنی اپنے حصے داروں میں منافع کی بڑی بڑی رقمیں تقسیم کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے ایجنٹ ہندوستان میں اپنے لیے اچھی رقم بنا لیتے تھے کمپنی کے ملازمین تجارتی ٹھیکے بھی لے لیتے تھے اور اس طرح بہت کم مدت میں بے شمار دولت بٹور لیتے تھے ہندوستان میں کمپنی اسی طرح اپنی حکومت چلا رہی تھی۔

منچو حکمراں

۱۶۵۰ء کے بعد سارے چین میں منچوؤں کے قدم مضبوطی کے ساتھ جم گئے۔ ان نیم غیر ملکیوں کے ماتحت چین بہت طاقت ور ہو گیا اور دوسرے ملکوں پر حملے تک کرنے لگا۔ منچو ایک نئی طاقت لے کر آئے اور جہاں ایک طرف وہ چین کے اندرونی اور خانگی معاملات میں کم سے کم دخل انداز ہوتے تھے، وہاں وہ اپنی زائد اور فاضل طاقت شمال مغرب کی طرف اپنی سلطنت پھیلانے میں صرف کر رہے تھے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک شاہی خاندان شروع میں کچھ لائق حکمراں پیدا کرتا ہے اور بعد میں نالائق حکمرانوں کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح منچوؤں میں بھی کچھ غیر معمولی قابلیت والے حکمراں اور سیاست داں پیدا ہوئے۔ کانگ ہی دوسرا شہنشاہ ہوا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس وقت اس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ اکسٹھ سال کی عمر تک وہ دنیا کی ایک ایسی سلطنت کا حکمراں رہا، جو اپنے زمانے تمام سلطنتوں میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ گنجان آباد تھی۔ لیکن تاریخ میں اس شہنشاہ کو جو بلند مرتبہ حاصل ہے وہ اس کی سلطنت کی وسعت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی ذاتی سیاسی سوجھ بوجھ اور ادبی ذوق کی وجہ سے ہے۔ ۱۶۶۱ء سے ۱۷۲۲ء تک یعنی ۵۴ سال وہ حکمراں رہا۔ وہ فرانس کے شہنشاہ چودھویں لوئی کا ہمعصر تھا ان دونوں نے بہت ہی لمبے عرصے تک حکومت کی اور ریکارڈ قائم کرنے کی اس دوڑ میں ۷۲ سال

تک حکومت کرکے لوئی نے بازی مارلی۔ ان دونوں کا موازنہ بہت دل چسپ ہے۔ لیکن یہ مقابلہ ہر طرح سے لوئی کو نیچا دکھانے والا ہے۔ اس نے اپنے ملک کو تباہ و برباد کر ڈالا اور قرضوں کے بارے اُسے بالکل دیوالیہ بنا دیا۔ مذہبی معاملات میں بھی وہ بہت متعصبانہ ذہنیت رکھتا تھا۔ کانگ ہی کنفیوشس کا معتقد تھا، لیکن وہ دوسرے مذہبوں کے ساتھ رواداری سے کام لیتا تھا۔ اُس کے دورِ حکومت میں اور پہلے چار منچو شہنشاہوں کے دورِ حکومت میں بھی قدیم منگ تہذیب کو کسی طرح کی ٹھیس نہیں پہنچائی گئی۔ چین میں اُس کی عظمت نہ صرف اسی طرح بنی رہی بلکہ بعض معنوں میں اُس نے اور بھی ترقی کی۔ صنعت و حرفت، علم و فن اور ادب و تمدن اسی طرح پھلتا پھولتا رہا۔ منگ شہنشاہوں کے زمانے کے چینی مٹی کے لاجواب برتنوں کا بننا جاری رہا۔ رنگین چھپائی کی دریافت ہوئی اور تانبے پر کندہ کاری کا کام جے سوئٹ لوگوں سے سیکھا گیا۔

منچو شہنشاہوں کی کامیاب حکمتِ عملی کا راز اس بات میں مضمر تھا کہ وہ چین کی تہذیب میں پوری طرح غرق ہو گئے تھے۔ کانگ ہی ایک غیر معمولی اور عجوبۂ روزگار شخصیت کا حامل تھا، وہ فلسفہ اور ادب کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کرتا تھا۔ تہذیبی قدروں کا اُسے بے حد پاس تھا اور اسی کے ساتھ وہ ایک کامیاب سپہ سالار بھی تھا۔ اور فتوحات کا بہت شوقین تھا۔ وہ فن و ادب کا کوئی نیا نیا شوقین یا اُس سے محض ظاہری لگاؤ رکھنے والا شخص نہیں تھا۔ علم و ادب سے اس کی گہری دل چسپی کا کچھ اندازہ اُس کے ادبی کارناموں میں سے مندرجہ ذیل تین تصنیفات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے، جو اُس کے مشورے اور بیشتر خود اسی کی نگرانی میں تیار ہوئی تھیں۔

چینی زبان میں الفاظ نہیں بلکہ تصویریں ہوتی ہیں۔ کانگ ہی نے چینی زبان کی لغت تیار کروائی۔ یہ ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔ جس میں چالیس ہزار سے زیادہ تصویریں تھیں۔ اور ان کے استعمال بتانے والے کتنے ہی فقرے اور جملے اُس میں موجود تھے۔ آج بھی اس کی ہم پلہ کوئی دوسری کتاب موجود نہیں ہے۔

کانگ ہی کی حوصلہ مندی نے ہمیں ایک اور تصنیف بخشی ہے۔ یہ ایک بہت ضخیم مصور

انسائیکلو پیڈیا ہے۔ کئی سو جلدوں میں تکمیل پانے والی یہ ایک بے مثل تصنیف ہے یہ کتاب ایک مکمل کتب خانہ ہے۔ جس میں ہر موضوع پر لکھا گیا ہے۔ کانگ ہی کے انتقال کے بعد یہ کتاب تانبے کے چھاپوں سے چھاپی گئی۔

جس تیسری تصنیف کا میں یہاں ذکر کروں گا وہ بھی سارے چین کے ادبی کارناموں کا نچوڑ یعنی ایک ایسا گنجینہ جس میں متعدد الفاظ اور کتابوں کے اقتباسات شامل کیے گئے تھے اور ان کا باہم موازنہ بھی کیا گیا تھا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی کام تھا۔ کیوں کہ اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ سارے چینی ادب کو کھنگالا جائے۔ متعدد شاعروں، مورخوں اور مضمون نگاروں کی تصنیفات کے پورے پورے اقتباسات تک اس میں شامل ہیں۔

کانگ ہی نے اور بھی کتنے ہی ادبی کارنامے انجام دیے۔ لیکن کسی بھی شخص کو متاثر کرنے کے لیے یہ تین ہی کافی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے بھی مقابلے کی کوئی جامع تصنیف میری نظر سے نہیں گزری۔ سوائے آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے جسے تیار کرنے میں کتنے ہی عالموں نے پچاس سال سے زیادہ عرق ریزی کی ہے۔

کانگ ہی کا کچھ رجحان عیسائی مذہب اور عیسائی مشنریوں کی طرف تھا۔ وہ بیرونی ممالک کے ساتھ تجارت کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اس کے لیے اس نے چین کے سارے بندرگاہ کھول دیے تھے۔ لیکن اُسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ یورپ والے بدمعاشیاں کرتے ہیں اور ان پر پابندی رکھنے کی ضرورت ہے۔ اُسے یہ شبہ ہو گیا، اور اس کے لیے اس کے پاس کافی ثبوت بھی موجود تھا، کہ مشنری لوگ چین کو فتح کر لینے کے لیے اپنی اپنی حکومتوں کی سامراجی طاقتوں کے ساتھ ساز باز کر رہے ہیں۔ اس بات سے اُسے عیسائی مذہب کی طرف سے رواداری اور فراخ دلی کا رویّہ ترک کرنا پڑا۔ بعد میں کینٹن کے چینی فوجی افسر سے جو رپورٹ ملی اس سے اس کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اس رپورٹ میں بتلایا گیا تھا کہ فلیپین اور جاپان میں یورپ کی حکومتوں اور ان کے تاجروں اور مشنریوں کے درمیان کتنا گہرا تعلق تھا۔ اس لیے اس افسر نے یہ سفارش کی تھی کہ بیرونی حملوں اور غیر ملکیوں کی سازشوں سے سلطنت کو بچانے کے لیے غیر ملکی تجارت پر پابندی لگائی

جائے اور عیسائی مذہب کی تبلیغی سرگرمیاں بند کر دی جائیں۔

اس رپورٹ کو چین کی بڑی مجلس نے منظور کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ کانگ ہی نے اس کے مطابق کارروائی کر کے غیر ملکی تجارت اور مشنریوں کے تبلیغی کام پر سخت پابندیاں لگانے کا حکم جاری کر دیا۔

سائبیریا کا لق و دق میدان چین کی سرحدوں کو مغربی ملک روس سے ملاتا تھا۔ سنہرے قبیلے کے منگولوں کو نکال باہر کر کے روس بھی ایک طاقت ور مرکزی حکومت بن گیا تھا اور مشرق میں سائبیریا کے میدانوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ دونوں سامراج اب سائبیریا میں آکر ملتے ہیں۔

ایشیا میں منگولوں کا تیزی کے ساتھ زوال ہو کر برباد ہو جانا تاریخ کا ایک عجیب و غریب واقعہ ہے۔ منگول سامراج کے تباہ و برباد ہو جانے کے بعد تقریباً دو سو سال تک ایشیا سے ہو کر گزرنے والے خشکی کے تمام راستے بند رہے۔ سولھویں صدی کے نصف آخر میں روس والوں نے خشکی کے راستے چین میں سفیر بھیجے۔ انھوں نے مِنگ شہنشاہوں سے سیاسی تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ تھوڑے دنوں بعد یرمک نام کے ایک روسی ڈاکو نے قزاقوں کا ایک گروہ اپنے ساتھ لے کر یورال پہاڑ کو پار کیا اور سبیر کی چھوٹی سی ریاست فتح کر لی۔ سائبیریا لفظ اسی ریاست کے نام سے نکلا ہے۔

یہ واقعہ ۱۵۸۱ء کا ہے۔ اس دن سے روسی لوگ مشرق کی طرف برابر آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ تقریباً پچاس سال کے اندر اندر وہ بحرالکاہل تک پہنچ گئے۔ جلد ہی آمور کی وادی میں ان کی چینیوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ دونوں میں لڑائی ہوئی جس میں روس والوں کو شکست کھانی پڑی۔ ۱۶۸۹ء میں دونوں ملکوں میں نرچنسک کا معاہدہ ہوا۔ سرحدیں مقرر کر دی گئیں اور تجارتی معاہدہ بھی ہو گیا۔ یورپ کے ملک کے ساتھ چین والوں کا یہ پہلا معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کی رو سے روس کا آگے بڑھنا رک گیا، لیکن کارروانوں کی تجارت میں بڑی ترقی ہوئی۔ اس

زمانے میں پیٹر اعظم روس کا زار تھا۔ وہ چین سے قریبی تعلقات قائم کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے کانگ ہی کے پاس دو بار سفیر بھیجے اور بعد میں چین کے دربار میں مستقل ایلچی مقرر کر دیا۔

چین میں تو بہت قدیم زمانے سے ہی باہر کے ملکوں سے سفیر آتے رہتے تھے۔ شاید رومن شہنشاہ مارکس آریلئس انٹونینس نے دوسری صدی عیسوی میں سفیروں کا ایک وفد چین بھیجا تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جب ۱۶۵۶ء میں ہالینڈ اور روس کے سفیروں کا وفد چین کے دربار میں پہنچا تو وہاں انھوں نے مغل شہنشاہ کے ایلچی دیکھے۔ یہ ایلچی یقیناً شاہجہاں کے بھیجے ہوئے ہوں گے۔

شیَن لُنگ

کانگ ہی کا پوتا شیَن لُنگ چوتھا شہنشاہ ہوا۔ اس نے بھی ۱۷۳۶ء تا ۱۷۹۶ء یعنی ساٹھ سال کے لمبے عرصے تک حکومت کی۔ دوسری باتوں میں بھی یہ اپنے دادا ہی کی طرح تھا۔ اس کی بھی خاص دلچسپی علم وادب اور سلطنت کی توسیع میں تھی۔ اس نے ایسی بہت سی ادبی تصنیفات کی بڑے پیمانے پر کھوج کروالی، جسے وہ محفوظ کرنے کے قابل سمجھتا تھا۔ ایسی کتابوں کو جمع کیا گیا اور بہت تفصیل کے ساتھ ان کی فہرست مرتب کی گئی۔ اس کے لیے 'فہرست' لفظ کا استعمال کچھ بہت موزوں نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر کتاب کے بارے میں جتنی باتیں بھی معلوم ہوسکیں وہ سب اس میں قلم بند کردی گئیں اور اس کے ساتھ ان پر تنقیدی نوٹ بھی شامل کردیے گئے۔ شاہی کتب خانے کی یہ فہرستِ تفصیلات چار حصوں پر مشتمل تھی ــــ کنفیوشس اور مذہبیات، تاریخ، فلسفہ اور عام ادبیات۔ کہا جاتا ہے کہ دُنیا میں اس کے جوڑ کی کوئی اور کتاب نہیں ہے۔

اُس زمانے میں چینی ناولوں، مختصر کہانیوں اور ڈراموں کی تشکیل ہونا شروع ہوئی اور یہ ادب بہت اونچے درجے کو پہنچ گیا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان دنوں انگلینڈ میں بھی ناولوں کی تشکیل ہو رہی تھی۔ چینی کے برتنوں اور چینی صناعی کے اور دوسرے نمونوں کی یورپ میں مانگ تھی، اور ان کی تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔ چاء کی تجارت کی

ابتدا اور بھی دل چسپ ہے۔ یہ تجارت پہلے منچو شہنشاہ کے زمانے میں شروع ہوئی انگلینڈ میں چاء شاید چارلس دوم کے زمانے میں پہنچی تھی۔ انگریزی کے مشہور ڈائری نویس سیمول پے پیر کی ڈائری میں سنہ ۱۶۶۰ء سے پہلے ٹی (چاء) پینے کا ذکر آیا ہے۔ چاء کی تجارت میں بہت زبردست ترقی ہوئی اور دو سو سال بعد سنہ ۱۸۶۰ء میں اکیلے فوچو نام کے چینی بندرگاہ سے ایک موسم میں دس کروڑ پونڈ چاء باہر بھیجی گئی۔ بعد میں دوسرے مقامات میں بھی چاء کی کاشت ہونے لگی۔ اور اب تو ہندوستان اور لنکا میں بھی چاء کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔

شیئن لُنگ نے وسط ایشیا میں ترکستان کو فتح کر کے اور تبت پر قبضہ جما کر اپنی سلطنت پھیلائی۔ کچھ سال بعد سنہ ۱۷۹۰ء میں نیپال کے گورکھوں نے تبت پر چڑھائی کی اس پر شیئن لُنگ نے نہ صرف گورکھوں کو تبت سے مار بھگایا بلکہ ہمالیہ کے اوپر سے ہو کر نیپال تک ان کا پیچھا کیا اور نیپال کو چین کی ماتحت ریاست بننے پر مجبور کر دیا۔ نیپال پر یہ فتح ایک معرکتہ الآرا کامیابی ہے۔ چین کی فوجوں کا تبت اور پھر ہمالیہ کو پار کرنا اور گورکھوں جیسی جنگ جو قوم کو، خاص طور سے ان کے ہی ملک میں شکست دینا حیرت کی بات ہے۔ صرف بائیس سال بعد سنہ ۱۸۱۴ء میں ایسا واقعہ پیش آیا کہ ہندوستان کے انگریز حکمرانوں کا نیپال سے جھگڑا ہو گیا۔ انھوں نے نیپال کو ایک فوج بھیجی، لیکن اُسے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا حالاں کہ اُسے ہمالیہ کو پار نہیں کرنا تھا۔

شیئن لُنگ کے دورِ حکومت کے آخری سال یعنی سنہ ۱۷۹۶ء میں جو علاقے براہ راست اُس کی سلطنت میں تھے۔ اِس میں منچوریا، منگولیا، تبت اور ترکستان شامل تھے۔ کوریا، انام، سیام اور برما اُس کے اقتدار کو ماننے والی ماتحت ریاستیں تھیں۔ لیکن ملکی فتوحات اور فوجی شہرت کی خواہش بہت مہنگا کھیل ہے ان پر بہت زیادہ روپیہ خرچ ہوتا ہے اور ٹیکسوں کا بار بڑھتا جاتا ہے۔ ٹیکسوں کا بار سب سے زیادہ غریبوں پر پڑتا ہے۔ اس وقت اقتصادی تبدیلیاں بھی رونما ہو رہی تھیں۔ جس سے بے چینی کی آگ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ سارے ملک میں حکومت کے خلاف خفیہ انجمنیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سے

کچھ کے نام بھی کافی دل چسپ تھے "سفید کنول کمیٹی"، "حلالی انصاف کمیٹی"، "سفید پنکھ کمیٹی"، "دنیا اور جنت کمیٹی"، وغیرہ وغیرہ۔

اس دوران ہر طرح کی پابندیوں کے باوجود غیر ملکی تجارت کو کافی فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ ان پابندیوں کی وجہ سے غیر ملکی تاجروں میں بہت بے اطمینانی کی کیفیت تھی۔ تجارت کا سب سے بڑا حصہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں تھا۔ جس نے کینٹن تک پیر پھیلا رکھے تھے۔ اس لیے پابندیاں سب سے زیادہ اسی کو بُری معلوم ہوتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مشہور و معروف صنعتی انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ انگلینڈ اس کا سربراہ تھا۔ دوخانی انجن ایجاد ہو چکا تھا اور پیداوار بڑھ رہی تھی۔ خاص طور سے سوتی سامان بہت تیار ہو رہا تھا۔ ملکی ضرورتوں سے زائد جو سامان تیار ہو رہا تھا اس کی نکاسی بھی ضروری تھی۔ اس لیے نئی نئی منڈیاں تلاش کی جاتی تھیں۔ انگلینڈ بہت خوش قسمت تھا کہ ایسے وقت میں ہندوستان اُس کے قبضے میں تھا۔ جہاں وہ اپنے مال کی زبردستی نکاسی کا انتظام کر سکتا تھا اور ایسا اس نے کیا بھی۔ لیکن وہ چین کی تجارت کو بھی ہتھیانا چاہتا تھا۔

۱۷۹۲ء میں برطانوی سرکار نے لارڈ میکارٹنی کی رہنمائی میں ایک وفد چین بھیجا اس وقت جارج سوئم انگلینڈ کا تاجدار تھا۔ شین لنگ نے وفد کو دربار میں ملاقات کا شرف بخشا اور دونوں طرف سے نذرانے اور تحائف پیش اور قبول کیے گئے۔ لیکن شہنشاہ نے تجارت پر لگائی ہوئی پابندیوں میں کسی بھی طرح کی ڈھیل کرنے سے انکار کر دیا۔ شین لنگ نے جو تحریر جارج سوئم کو جواب میں بھیجی تھی وہ بہت دل چسپ دستاویز ہے اس میں سے چند اقتباسات میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

"اے شہنشاہ تو بہت سے سمندروں کی سرحدوں کے پار رہتا ہے، پھر بھی ہماری تہذیب و تمدن سے کچھ فائدہ اُٹھانے کی پُر خلوص نیت سے تو نے سفیروں کا جو وفد بھیجا ہے وہ باعزت تیری عرضی لے کر آیا ہے۔ اپنی عقیدت کا ثبوت دینے کے لیے تو نے اپنے ملک کی مصنوعات بھی نذرانے میں بھیجی ہیں۔ میں نے تیری عرضی کو

پڑھا۔ اس کی عبارت اُس خلوص اور عقیدت کی مظہر ہے جو تجھے مجھ سے ہے۔ یہ قابلِ ستائش بات ہے۔

"ساری دنیا کا حکمراں ہونے کے باوجود میری نگاہ میں صرف ایک ہی مقصد ہے۔ یعنی ایک مثالی نظم و نسق قائم رکھنا اور حکومت کی طرف سے اپنے فرائضِ منصبی کی تکمیل کرنا۔ عجیب و غریب اور بیش قیمت چیزوں میں مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے..... تیرے ملک کی بنی ہوئی چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اے بادشاہ تجھے مناسب ہے کہ میرے جذبات کی قدر کر اور آئندہ اس سے بھی زیادہ عقیدت مندی اور وفاداری دکھا تاکہ تو سدا ہمارے تخت و تاج کی امان میں رہ کر اپنے ملک کے لیے امن اور چین حاصل کرے..... ڈر سے کانپتے ہوئے حکم کی تعمیل کر کسی طرح کی کوتاہی مت دکھا۔"

جارج سوئم اور اُس کے وزراء نے جب یہ جواب پڑھا ہوگا تو وہ سکتے میں آگئے ہوں گے۔ لیکن جس اعلیٰ تہذیب و تمدن پر کامل یقین اور جس طاقت کی برتری کے احساس کی جھلک اس تحریر میں ملتی ہے، اس کی بنیاد اصل میں بہت مضبوط نہ تھی۔ منچو حکومت باہر سے بہت مستحکم دکھائی دیتی تھی، اور شین لنگ کے دورِ حکومت میں وہ بہت مضبوط تھی بھی، لیکن بدلتا ہوا اقتصادی نظام اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا تھا۔ جن خفیہ کمیٹیوں کا میں ذکر کر چکا ہوں وہ اسی بے اطمینانی کا پتہ دیتی ہیں۔ اصل دِقت یہ تھی کہ ملک کو ان اقتصادی تبدیلیوں کے مطابق ڈھالا نہیں جا رہا تھا۔ دوسری طرف مغرب کے ملک اس نئے نظام کے سربراہ تھے۔ وہ بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے اور دن بدن طاقت پکڑتے جاتے تھے۔ شہنشاہ شین لنگ نے انگلینڈ کے جارج سوئم کو جو تکبر آمیز جواب بھیجا تھا اس کے بعد ستر سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ انگلینڈ اور فرانس نے چین کو نیچا دکھا دیا اور اس کے غرور اور تکبر کو خاک میں ملا دیا۔

نپولین

نپولین کس طرح کا آدمی تھا ؟ کیا اس کا شمار بھی دنیا کی عظیم شخصیتوں میں کیا جانا چاہیے یا جیسا کہ ایچ ؛ جی ۔ ویلس وغیرہ کہتے ہیں کہ وہ ایک بہت بڑا تخریب پسند انسان تھا جس نے یورپ کو اور اس کی تہذیب کو بہت بھاری صدمہ پہنچایا ہے ؟ شاید ان دونوں ہی باتوں میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے یا یوں کہیے کہ دونوں ہی میں سچائی کا کچھ نہ کچھ عنصر موجود ہے ۔ ہم سب میں نیکی اور بدی، عظمت اور ذلت کا کچھ عجیب سا میل ہوتا ہے ۔ وہ بھی ایسا ہی ایک مرکب تھا ۔ لیکن اس مرکب کے تیار ہونے میں ایسے غیر معمولی اوصاف سے کام لیا گیا تھا، جو ہم میں سے بہتوں میں نہ ملیں گے ۔ اس میں جرأت اور اعتماد تھا ۔ قوتِ فکر تھی اور حیرت انگیز قوت اور توانائی تھی ۔ وہ زبردست اولوالعزم اور حوصلہ مند آدمی تھا ۔ وہ بہت بڑا سپہ سالار تھا ۔ فن سپہ گری میں وہ زمانہ قدیم کے سکندر اور چنگیز جیسے سپہ گروں کے مقابلے کا تھا ۔ لیکن وہ اسی کے ساتھ لالچی، کینہ پرور، خود غرض اور مغرور بھی تھا ۔ اس کی زندگی کا مقصد کسی اونچے نصب العین کے پیچھے دوڑنا نہیں تھا اسے تو محض ذاتی اقتدار کی ہوس تھی ۔

وہ انقلابی طاقتوں کا پروردہ اور اسی میں سے ابھرا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایک عظیم الشان سامراج کے خواب دیکھتا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کی فتوحات کی کہانیاں اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں ۔

نیپولین بونا پارٹ کی پیدائش ۱۷۶۹ء میں کورسیکا کے جزیرے میں ہوئی تھی۔
اُس نے فرانس کے ایک فوجی اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ فرانسیسی انقلاب کے وقت
وہ جیکو بن کلب کا ممبر تھا۔ لیکن وہ شاید جیکو بن لوگوں میں اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی
غرض سے شامل ہوا تھا اس لیے نہیں کہ وہ ان کے نصب العین میں یقین رکھتا تھا۔
۱۷۹۳ء میں تولوں میں اُسے پہلی فتح نصیب ہوئی۔ اس جگہ کے دولت مند لوگوں نے
اس ڈر سے کہ انقلابی حکومت قائم ہو جانے پر ان کی جائدادیں نہ چھن جائیں، بیچ بیچ
انگریزوں کو بلالیا اور فرانس کا باقی ماندہ بیڑا ان کے حوالے کر دیا۔ نیپولین نے باغیوں
کو پیس ڈالا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ حملہ کر کے انگریزوں کو ہرا دیا۔ اب اس کا ستارہ
عروج کی طرف تھا۔ وہ چوبیس سال کی عمر میں سپہ سالار بن گیا۔ چند ہی مہینوں بعد جب
رابس پیری گلوٹین پر (ایک طرح کی پھانسی) چڑھا دیا گیا تو وہ آفت میں پھنس گیا اُس پر
رابس پیری کی جماعت کا ممبر ہونے کا شبہ کیا گیا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ جس پارٹی میں
وہ شامل تھا اس پارٹی کا صرف ایک ہی ممبر تھا اور وہ خود نیپولین تھا۔ اس کے بعد
ڈائرکٹری کی حکومت آئی اور نیپولین نے ثابت کر دیا کہ جیکو بن ہونا تو درکنار وہ تو انقلاب
دشمن عناصر کا سربراہ تھا۔ اور بغیر کسی ہچک کے عام جنتا کو گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔
۱۷۹۶ء میں وہ فرانسیسی فوج کا سپہ سالار ہو گیا اور اٹلی کے شمالی حصّے پر
بڑی ہوشیاری سے دھاوا کر کے اُس نے سارے یورپ کو انگشت بدنداں کر دیا۔
فرانس کی فوجوں میں انقلاب کا جوش ابھی بالکل ٹھنڈا نہیں پڑا تھا حالاں کہ اس کی حالت
بہت خستہ ہو چکی تھی۔ ان کے پاس نہ ٹھیک کپڑے تھے نہ قاعدے کے جوتے، نہ کھانے
کو رسد اور نہ روپیہ پیسہ۔ ان پھٹے حال اور آبلہ پا گردہ کو وہ اَلپس پہاڑوں کے اوپر سے
لے گیا اور ان کو اُمید دلائی کہ انھیں اٹلی کے زرخیز میدانوں میں پہنچ کر کھانا اور آسائش
کے دوسرے سامان ملیں گے۔ دوسری طرف اٹلی کے لوگوں کو اُس نے آزادی کا یقین
دلایا کہ وہ ان کو ظالموں کے چنگل سے نجات دلانے آرہا ہے۔ لوٹ کھسوٹ کی اُمید طلی
کے ساتھ انقلابی نعروں کا یہ عجیب و غریب مرکب تھا! اس طرح فرانس اور اٹلی، دونوں

ملک کے لوگوں کے جذبات سے وہ بڑی ہوشیاری سے کھیل گیا۔ چوں کہ وہ خود بھی اطالوی النسل تھا اس لیے اس کا سکہ خوب جم گیا۔ جیسے جیسے اُسے فتح ملتی گئی اس کا دبدبہ بڑھتا گیا۔ اس کی شہرت کو چار چاند لگنے لگے۔ اپنی فوج کے عام سپاہیوں کے ساتھ وہ بھی بہت تکلیفیں اُٹھاتا تھا اور خطرات میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ حملے میں جہاں سب سے زیادہ خطرہ ہوتا وہ خود وہاں پہنچ جاتا۔ وہ ہمیشہ سچے جوہر کی تلاش میں رہتا تھا اور اس کے لیے وہ فوراً میدانِ جنگ ہی میں انعامات دے دیتا تھا۔ اپنے فوجیوں کے لیے وہ باپ ——— ایک نوجوان باپ کی طرح تھا۔ جسے وہ پیارا ننھا کارپورل کہتے تھے اور 'تو' سے خطاب کرتے تھے۔ پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ بیس پچیس سال کا یہ نوجوان سپہ سالار فرانسیسی فوجیوں کو جان سے بھی پیارا ہو گیا۔

اٹلی کے شمالی حصے کو فتح کر کے آسٹریا کو شکست دے کر اور وینس کی قدیم جمہوریت کا خاتمہ کر کے اور ایک بھدی اور سامراجی شان کی صلح کر کے وہ ایک عظیم فاتح کے روپ میں پیرس لوٹا۔ فرانس میں اس کا دبدبہ قائم ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن اس نے سوچا کہ اقتدار ہاتھ میں لینے کا صحیح موقع ابھی نہیں آیا ہے اس لیے اس نے ایک فوج لے کر مصر جانے کا ڈھونگ رچایا۔ عنفوانِ شباب سے ہی مشرق کی یہ پکار اس کے دل میں رہ رہ کر آ کھڑی تھی اور اب وہ اس حیثیت میں تھا کہ اپنے اس حوصلے کو پورا کرے۔ ایک عظیم الشان سامراج کے خواب اس کے ذہن کے گوشوں میں چکر لگانے لگے ہوں گے۔ بحرِ روم میں انگریزوں کے جہازی بیڑے سے بچتا بچاتا وہ کسی نہ کسی طرح اسکندریہ جا پہنچا۔

مصر ان دنوں ترکی کی سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا لیکن اس سلطنت کا زوال ہو چکا تھا اور در اصل مملوک حکومت کر رہے تھے۔ جو صرف نام کے لیے سلطنت عثمانیہ کے ماتحت تھے۔ جلد ہی نپولین نے پیرامڈوں کی جنگ فتح کی۔ وہ ڈرامائی انداز کو بہت پسند کرتا تھا۔ ایک پیرامڈ کے نیچے اپنی فوج کے سامنے گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر اس نے کہا ——— "سپاہیو دیکھو چالیس صدیاں تمہارے اوپر نگاہ ڈال رہی

ہیں "

نپولین خشکی کی لڑائی کا مرد میدان تھا۔ اور وہ خشکی پر فتح در فتح حاصل کرتا گیا، لیکن بحری بیڑوں پر اس کی ایک نہ چلی۔ وہ سمندری جنگ لڑنا نہیں جانتا تھا اور شاید اُس کے پاس قابل بحری دستے اور سپہ سالار بھی نہیں تھے۔ ٹھیک انھیں دنوں بحر روم میں انگلینڈ کے بحری بیڑے کا سپہ سالار ایک غیر معمولی شخصیت کا آدمی تھا۔ اس کا نام ہوریشیو نیلسن تھا۔ نیلسن بڑی ہمت کر کے ایک دن بندرگاہ کے اندر داخل ہو گیا اور نیل ندی کی جنگ میں اُس نے فرانس کے بحری بیڑوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح پردیس میں نپولین پر یہ ایک نئی آفت تھی۔ وہ کسی طرح بچ بچا کر نکل بھاگا اور فرانس پہنچ گیا۔ اس کے لیے اسے اپنی مشرق کی فوج کو قربان کرنا پڑا۔

اپنی فتوحات اور فوجی شہرت کے باوجود مشرقی ممالک کا یہ زبردست دھاوا ناکام رہا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ نپولین عالموں اور مفکروں کی ایک پوری جماعت اور بہت سی کتابیں اور طرح طرح کے اوزار اپنے ساتھ مصر لے گیا تھا۔ اس حلقے میں روز مباحثے ہوتے تھے۔ جن میں نپولین خود بھی برابر کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا۔ ان عالموں نے سائنٹیفک تحقیق کا بہت اچھا کام کیا۔ یہ بھی بہت دلچسپ بات ہے کہ سویز پر نہر کاٹنے کی ایک تجویز پر نپولین نے بھی بڑی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

جب نپولین مصر میں تھا تو اُس نے ایران کے شاہ اور جنوبی ہندوستان کے ٹیپو سلطان کے ساتھ راہ و رسم پیدا کی تھی مگر ان کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا کیوں کہ اس کے پاس بحری طاقت بالکل نہیں تھی۔

مصر سے جب نپولین لوٹا تو فرانس کی حالت بڑی ابتر ہو چلی تھی۔ ڈائرکٹری بدنام اور غیر مقبول ہو چکی تھی۔ اس لیے سبھی کی آنکھیں نپولین کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ وہ تو اقتدار حاصل کرنے کے لیے جیسے تیار ہی بیٹھا تھا۔ نومبر ۱۷۹۹ء میں اپنی واپسی کے ایک مہینے کے بعد نپولین نے اپنے بھائی لیوشن کی مدد سے اسمبلی کو زبردستی توڑ دیا اور اس وقت کے جس دستور کے ماتحت ڈائرکٹری کی حکومت چل رہی تھی اُس کو ختم دیا۔ وہ یہ سب کرنے

میں اس لیے کامیاب ہوا کہ لوگ اُسے پسند کرتے تھے اور اس پر اعتماد رکھتے تھے۔ اب ایک نئے دستور کا مسودہ تیار کیا گیا جس میں تین کونسل رکھے گئے۔ لیکن ان تینوں میں اعلیٰ نیپولین تھا جسے پورے اختیارات حاصل تھے۔ وہ "پہلا کونسل" یا "کونسل اعلیٰ" کہلایا اور دس سال کے لیے نامزد کیا گیا۔

یہ دستور جس میں نیپولین کو دس سال کے لیے "پہلا کونسل" بنایا گیا تھا عوام کی رائے کے لیے پیش کیا گیا۔ تیس لاکھ سے زیادہ رائے دہندوں نے اُسے تقریباً اتفاق رائے سے مان لیا۔ اس طرح فرانس کے عوام نے اس خوش فہمی میں کہ وہ انھیں آزادی اور سکھ چین دلائے گا خود ہی سارا اقتدار نیپولین کو سونپ دیا۔

نیپولین نے نظامِ حکومت میں سادگی اور کارکردگی پیدا کی۔ وہ ہر کام میں دخل دیتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں یاد رکھنے کی اس میں حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ اپنی انتھک محنت سے وہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو تھکا ڈالتا تھا۔ اکبر کی طرح نیپولین کا حافظہ بھی بہت غیر معمولی تھا۔ اس کا ذہن بہت مربوط تھا۔ وہ اپنے بارے میں کہتا تھا ——" جب میں کسی بات کو ذہن سے ہٹانا چاہتا ہوں تو اس دراز کو بند کر دیتا ہوں اور دوسری دراز کھول لیتا ہوں۔ الگ الگ درازوں میں رکھی ہوئی چیزیں کبھی ایک دوسرے سے ملنے نہیں پاتیں اور نہ وہ مجھے پریشان کرتی ہیں۔ میں جب سونا چاہتا ہوں تو سب درازیں بند کر دیتا ہوں اور آرام سے سو جاتا ہوں"۔ جنگ کے میدان میں بھی اکثر دیکھا جاتا تھا کہ وہ زمین پر لیٹا اور سو گیا اور آدھ ہی گھنٹے میں اُٹھ بیٹھا اور پھر تازہ دم ہو کر جنگ میں مصروف ہو گیا۔ یہ اس کا معمول تھا۔

وہ دس سال کے لیے پہلا کونسل بنایا گیا تھا۔ اقتدار کی زندگی کا دوسرا دروازہ تین سال بعد ۱۸۰۲ء میں کھلا جب اس نے خود کو زندگی بھر کے لیے کونسل بنوا لیا۔ اس کے اختیارات پہلے سے بہت بڑھ گئے۔ جمہوریت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور وہ ہر اعتبار سے ایک مطلق العنان شہنشاہ بن گیا تھا۔ شہنشاہ کا خطاب اُسے بھلے ہی نہیں ملا، مگر زندگی بھر کے لیے لازمی طور سے کونسل بن جانے کے بعد اُس نے ۱۸۰۴ء میں

عوام کی رائے لے کر شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ فرانس میں وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا، لیکن اس میں اور پُرانے زمانے کے مطلق العنان شہنشاہوں میں بہت فرق تھا۔ وہ وراثت اور خداداد حقِ فرماں روائی کو اپنے اقتدار کی بُنیاد نہیں بنا سکتا تھا۔ اُسے اپنے اقتدار کی بُنیاد اپنی کارکردگی اور عوام میں اپنی مقبولیت پر رکھنی پڑی تھی خاص طور سے کسانوں میں اپنی مقبولیت کی بنیاد پر، جو ہمیشہ سے اُس کے سب سے زیادہ وفاشعار اور طرف دار تھے۔ کسان یہ سمجھتے تھے کہ اسی نے ان کی زمینوں کو چھن جانے سے بچایا ہے۔ لیکن کسان بھی اب اب دھیرے دھیرے تنگ آ چکے تھے۔ جنگ برابر چل رہی تھی۔ اور انھیں ہر جنگ میں اپنے سپوتوں کو بھیجنا پڑتا تھا۔ جب یہ سہارا چھن گیا تو جو عظیم الشان عمارت نپولین نے کھڑی کی تھی اس کی دیواریں آہستہ آہستہ کھسکنا شروع ہو گئیں۔

دس سال تک وہ تاج دار بنا رہا اور اس مُدت میں وہ زبردست فوجی کارنامے سرانجام دیتا ہوا اور یادگار لڑائیاں فتح کرتا ہوا یورپ کے سارے برِّاعظم کو چھانتا پھرا۔ سارا یورپ اُس کے نام سے تھرّاتا تھا اس کا ایسا دبدبہ تھا کہ اُس سے پہلے اور بعد میں بھی آج تک کسی کا نہ ہوا۔ مارینگو (یہ جنگ ۱۸۰۰ء میں ہوئی جب اُس نے اپنی فوج کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کی برف پوش وادی سینٹ برانڈ کو عبور کیا) اُلم، آسترلیتز، جینا، فریڈلینڈ، ویگرام وغیرہ اُس کی سر کی ہوئی مشہور لڑائیوں کے نام ہیں۔ آسٹریا، پُرشیا، روس وغیرہ سب ہی اُس کے سامنے ڈھیر ہو گئے۔ اسپین، اٹلی، نیدرلینڈس، رائن کانفیڈریشن کہلانے والا جرمنی کا بڑا حصہ، پولینڈ جو اس وقت وارسا کی ڈچی کہلاتا تھا، یہ سب اُس کے ماتحت ہو گئے۔ قدیم مقدس رومن سامراج جو بہت دنوں سے نام نہاد چلا آ رہا تھا اب اس کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔

یورپ کی بڑی طاقتوں میں صرف انگلینڈ ہی اس آفت سے بچا رہا۔ انگلینڈ کو اُسی بحری طاقت نے بچایا جو نپولین کے لیے ہمیشہ ایک خطرہ اور عجوبہ بنی رہی۔ سمندر سے محفوظ رہنے کی وجہ سے انگلینڈ اس کا سب سے زبردست اور کٹّر دشمن بن گیا۔ میں بتا آیا ہوں کہ کس طرح نپولین کی فوجی زندگی کی ابتدا میں ہی نیلسن نے نیل ندی کی لڑائی

میں اُس کے بحری بیڑوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ۲۱ اکتوبر ۱۸۰۵ء کو اسپین کے شمالی ساحل پر ٹرافلگار کے پاس نیلسن نے فرانس اور اسپین کے بحری بیڑوں پر زبردست فتح حاصل کی۔ نیلسن حالاں کہ فتح کی ساعت میں ہی مارا گیا، لیکن اس فتح نے انگلینڈ پر دھاوا بولنے کے، نیپولین کے حوصلے کو چور چور کر دیا۔ انگریز اس تاریخی جنگ کو بہت فخر سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی یادگار لندن کے ٹریفل گار اسکوائر میں نیلسن مینار کے روپ میں قائم ہے۔

نیپولین نے انگلینڈ کے خلاف یورپ کے سارے بندرگاہوں کی ناکہ بندی کرنے کے احکامات جاری کر کے اس کا بدلہ لیا۔ اس نے انگلینڈ سے ہر طرح کی نقل و حمل کے تعلقات رکھنے کی ممانعت کر دی۔ سوداگروں کے ملک انگلینڈ کو اس طرح قابو میں رکھنے کی بات سوچی گئی۔ ادھر انگلینڈ نے بھی بندرگاہوں کی ناکہ بندی کر دی اور نیپولینی سامراج اور امریکا وغیرہ دوسرے ملکوں کے درمیان ہونے والی تجارت کو روک دیا۔ یورپ میں لگاتار سازشیں کر کے اور نیپولین سے ناراض رہنے والے لوگوں اور دشمن ریاستوں میں دل کھول کر سونا تقسیم کر کر کے انگلینڈ نے نیپولین کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ اس میں آسے یورپ کے کئی دولت مند گھرانوں سے، خاص طور سے راتھس چائلڈ کے گھرانے سے بڑی مدد ملی۔

انگلینڈ نے نیپولین کے خلاف ایک اور بھی طریقہ اختیار کیا، جو پروپیگنڈے کا طریقہ تھا۔ جنگ میں کام آنے والا یہ ایک بالکل نیا حربہ تھا۔ لیکن اس وقت سے یہ بہت رائج ہو گیا ہے۔ فرانس اور خاص طور سے نیپولین کے خلاف اخباروں میں زہر اُگلنے کی تحریک شروع کی گئی۔ طرح طرح کے مضامین، کتابچے، خبریں، رسائل، نئے شہنشاہ کی ہجو کرنے والے کارٹون اور فرضی خود نوشتیں لندن سے شائع ہوتی تھیں اور چوری سے فرانس میں پہونچا دی جاتی تھیں۔

نیپولین جہاں کہیں گیا، وہاں وہ اپنے ساتھ انقلاب فرانس کی کچھ باتیں لیتا گیا اور جن جن ملکوں کو اس نے جیتا وہاں کے لوگ اُس کی آمد پر ناخوش نہیں ہوئے

وہ لوگ اپنے نکمّے اور جاگیردارانہ ذہنیت والے حکمرانوں سے تنگ آچکے تھے۔ نیپولین نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا گیا، جاگیردارانہ نظام اس کے سامنے ڈھیر ہوکر گرنے لگا۔ جرمنی میں تو خاص طور سے جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوگیا۔ اسپین میں اس نے انکویزیشن کا خاتمہ کرڈالا لیکن قومیت کے جس جذبے کو اس نے غیرشعوری طور پر جگایا وہ خود اس کے راستے کا کانٹا بن گیا۔ اور بالآخر اسی کے ہاتھوں اِسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ پُرانے بادشاہوں اور شہنشاہوں کو نیچا دکھا سکتا تھا۔ لیکن اُس ساری قوم کو نہیں جو اُس کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس طرح اسپین کے لوگ اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور کئی سال تک اُس کی طاقت اور اس کے وسائل کو نچوڑتے رہے۔ جرمن بھی بیرن وام اشٹین نام کے ایک قوم پرست رہنما کی سرکردگی میں متحد ہوگئے۔ یہ نیپولین کا کٹر دشمن ہوگیا۔ جرمنی میں آزادی کی جنگ ہوئی۔ اس طرح قوم پرستی، جسے خود ہی نیپولین نے جگایا تھا، بحری طاقتوں سے مل کر اُس کی تباہی کا سبب بن گئی۔ یہ بات بھی بہرصورت، بہت مشکل تھی کہ سارا یورپ ایک واحد ڈکٹیٹر کو برداشت کرلیتا۔ اس سلسلے میں خود نیپولین کا خیال درست تھا جس کا اظہار اُس نے بعد میں ایک موقع پر کیا۔ :"میری بربادی کا قصور، میرے سوا کسی اور پر نہیں ہے۔ میں خود ہی اپنا سب سے بڑا دشمن رہا ہوں اور خود ہی اپنی تباہی اور بدقسمتی کا سبب بنا ہوں۔"

اس حیرت انگیز اور غیرمعمولی خوبیوں والے انسان میں کمزوریاں بھی بہت غیرمعمولی تھیں۔ اُس پر ہمیشہ نئے نوابوں کی سی حماقتوں کا رنگ چھایا رہا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کے دل میں ہمیشہ یہ ارمان رہا کہ پُرانے اور نکمّے بادشاہ اُس سے برابری کا سلوک کریں۔ اُس نے اپنے بھائی بہنوں کو بہت بھدّے طریقے سے آگے بڑھایا حالاں کہ وہ بالکل نکمّے اور نالائق تھے۔ لیوشن ہی ایک لائق بھائی تھا، جس نے ۱۷۹۹ء میں مصیبت کے وقت اُس کی مدد کی تھی لیکن جو بعد میں اختلاف ہوجانے کی وجہ سے اٹلی میں جاکر آباد ہوگیا۔ دوسرے بھائیوں کو جو بہت مغرور اور بے وقوف تھے، نیپولین نے کہیں کا

بادشاہ اور کہیں کا حکمراں بنا دیا۔ جب اس پر مصیبت پڑی تو اس میں سے تقریباً سب ہی نے اُسے دھوکا دیا اور اُس سے کنارہ کشی اختیار کی۔ نیپولین کو اپنے خاندان کی حکومت چلانے کی تمنا تھی۔ اپنی شروع زندگی میں اٹلی پر حملے کرنے اور شہرت حاصل کرنے سے بہت پہلے اُس نے جوسیفائن نام کی ایک حسین اور چنچل عورت سے شادی کر لی تھی جب اُس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تو نیپولین کو بہت مایوسی ہوئی۔ کیوں کہ اُس کے دل میں اپنے خاندان کی حکومت چلانے کی خواہش بیٹھی ہوئی تھی۔ بس اُس نے جوسیفائن کو طلاق دے کر دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا، حالاں کہ وہ جوسیفائن سے محبت کرتا تھا۔ اس کی خواہش روس کی ایک گرانڈ ڈچس سے شادی کرنے کی تھی لیکن زار نے اس کی اجازت نہیں دی نیپولین بھلے ہی سارے یورپ کا مالک و مختار سہی لیکن روس کے شاہی خاندان میں شادی کی خواہش کرنا زار کے خیال میں اُس کی توہین تھی۔ اب نیپولین نے کسی طرح آسٹریا کے ہیپس برگ بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنی بیٹی میری کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے دے۔ اُس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ شہزادی بے وقوف اور بے حس تھی اور نیپولین کو بالکل نہیں چاہتی تھی۔ نیپولین کے لیے وہ بہت بُری عورت ثابت ہوئی۔ جب نیپولین پر آفت آئی تو وہ اُسے چھوڑ کر بھاگ گئی اور اُسے بالکل ہی بھلا دیا۔

تعجب کی بات ہے کہ یہ شخص، جو بہت سی باتوں میں اپنے ہمعصروں سے بہت اونچا تھا، شہنشاہیت کے پُرانے خیالوں سے پیدا ہونے والی جھوٹی شان و شوکت کا شکار ہو گیا۔ پھر بھی اکثر وہ بہت انقلابی قسم کی باتیں کرتا تھا اور ان "نکمّے" بادشاہوں کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ اُس نے انقلاب اور نئے نظام کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ پُرانا نظام نہ تو اُس کے موافق تھا اور نہ پُرانا نظام اُسے اپنانے کے لیے تیار تھا۔ اسی لیے ان دونوں کی کشمکش اس کے زوال کا سبب بن گئی۔

بالآخر اس فوجی شہرت و عظمت کی جد وجہد سے بھرپور زندگی کا بہت دردناک انجام ہوتا ہے۔ خود اس کے کچھ وزرا، مخالف ہو جاتے ہیں۔ اُس کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ ٹیلی رینڈ روس کے زار سے مل کر سازش کرتا ہے اور فوشے انگلینڈ والوں سے

مل کر ریشہ دوانیاں شروع کرتا ہے۔ نپولین ان کی دغابازی کی حرکتوں کو پکڑ لیتا ہے لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود وہ صرف لعنت ملامت کر کے چھوڑ دیتا ہے اور انھیں وزارت کے عہدوں پر بدستور فائز رکھتا ہے۔ برنادوت نام کا اس کا ایک سپہ سالار اس کا مخالف اور کٹر دشمن بن جاتا ہے۔ ماں اور بھائی لیوشن کے سوا، اس کے خاندان کے سارے لوگ اس کے خلاف بدمعاشیوں میں شریک ہوتے جاتے ہیں اور اکثر اس کی جڑیں بھی کاٹتے رہتے ہیں۔ فرانس میں بھی بے اطمینانی بڑھتی جاتی ہے اور اس کی ڈکٹیٹری میں بہت سی تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کتنے ہی لوگ بغیر مقدموں کے جیل کی کوٹھریوں کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ اس کی قسمت کا ستارہ اب زوال پذیر معلوم ہوتا ہے۔ تالاب کو سوکھتا دیکھ کر بہت سی مچھلیاں اُسے چھوڑ جاتی ہیں۔ زیادہ عمر نہ ہونے پر بھی نپولین کی جسمانی اور ذہنی طاقتیں سلب ہونے لگتی ہیں۔ ٹھیک جنگ کے میدان میں اُسے قولنج کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ پرانی ہوشیاری تو اس میں موجود ہے لیکن اب اس کی چال بھاری پڑ گئی ہے۔ وہ اکثر آگا پیچھا سوچنے میں رہ جاتا ہے اور شکّی اور وہمی ہو جاتا ہے۔ اُس کی فوجیں بھی پہلے سے زیادہ بھاری بھر کم ہو گئی ہیں۔

سنہ ۱۸۱۲ء میں ایک زبردست فوج کے ساتھ وہ روس پر چڑھائی کرنے کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ وہ روس والوں کو شکست دے دیتا ہے اور بغیر کسی خاص مقابلے کے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ روس کی فوجیں لگاتار پیچھے ہٹتی جاتی ہیں اور لڑنے کے لیے سامنے نہیں آتیں۔ نپولین کی گرانڈ آرمی ان کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے ماسکو تک پہنچ جاتی ہے۔ زار تو گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن دو آدمی ایک تو فرانسیسی برنادوت، جو نپولین کا پرانا ساتھی اور سپہ سالار تھا اور دوسرا جرمن قوم پرست لیڈر بیرن وان اشٹین جسے نپولین نے باغی قرار دے دیا تھا زار کو ایسا کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ روس والے دشمن کو دھوئیں سے بھگا دینے کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے پیارے شہر ماسکو میں آگ لگا دیتے ہیں۔

سردیاں شروع ہو رہی ہیں۔ نپولین جلتے ہوئے ماسکو کو چھوڑ کر فرانس لوٹنے کا

ارادہ کرتا ہے۔ گرانڈ آرمی، برف میں سے ہو کر تھکی ماندی دھیرے دھیرے واپس لوٹتی ہے۔ ادھر روس کے قزاق لوگ، جو برابر اس کے دونوں طرف پیچھے پیچھے لگے ہوئے تھے اس پر حملے کرتے ہیں۔ چھاپے مارتے ہیں اور بچھڑے فوجیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔ سردی کی شدّت اور قزاقوں کی بے رحمی نے مل کر ہزاروں آدمیوں کی جانیں لے لیں، اس طرح گرانڈ آرمی بھوتوں کا جلوس بن کر رہ جاتی ہے، جس میں سب لوگ پیدل، پھٹے حال، آبلہ پا، ٹھنڈک سے ٹھٹھرے ہوئے، تھکان سے چور، گرتے پڑتے چلتے ہیں۔ اپنے گولا اندازوں کے ساتھ نپولین کو بھی پیدل چلنا پڑتا ہے۔ یہ سفر بہت خطرناک اور دلوں کو ہلا دینے والا ثابت ہوتا ہے اور وہ زبردست فوج کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ صرف مٹھی بھر لوگ واپس لوٹتے ہیں۔

روس کے اس حملے نے نپولین کے اقتدار کو بڑی زبردست چوٹ پہنچائی۔ اس نے فرانس کی طاقت کو ختم کر دیا اور اس سے بھی زیادہ یہ ہوا کہ اس سے نپولین بہت زیادہ اُداس اور فکر مند نظر آنے لگا۔ اس پر بڑھاپے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ وہ لڑائی جھگڑوں سے اوب گیا تھا۔ لیکن دُشمن اُسے کب چین سے بیٹھنے دینے والے تھے۔ اُنھوں نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ حالاں کہ اس کی حیثیت اب بھی بہت ہوشیار اور فتح مند سپہ سالار کی تھی۔ لیکن اب پھندا دھیرے دھیرے کسا جانے لگا تھا۔ تیلی رینڈ کی سازشیں بڑھنے لگیں اور نپولین کے کچھ معتبر فوجی افسر بھی اس کے خلاف ہو گئے۔ بالآخر ان باتوں سے گھبرا کر اُس نے ۱۸۱۴ء میں تخت و تاج کو ترک کر دیا۔

نپولین کے راستے سے ہٹتے ہی یورپ کی طاقت ور قوموں کی ایک بڑی کانگریس یورپ کا نیا نقشہ بنانے کے لیے ویانا میں بُلائی گئی۔ نپولین کو بحرِ روم کے ایک چھوٹے سے جزیرے ایلبا میں بھیج دیا گیا۔ فرانس کے شہنشاہ لوئی کو گلوٹین پر چڑھایا جا چکا تھا۔ اس کے ایک بھائی کو جو خوف سے چھپا چھپا پھرتا تھا اُسے اٹھارویں لوئی کے نام سے فرانس کے تخت پر بٹھایا گیا۔ اس طرح بوربون خاندان ایک بار پھر فرانس کے تخت پر آ جما۔ اسی کے ساتھ ظلم و تشدد کا پُرانا نظام بھی واپس آ گیا۔ بیسٹیل کے زوال سے لے کر اب تک پچیس سال

کے دلیرانہ کارناموں کا انجام کار یہی نکلا۔ ویانا میں متعدد شہنشاہ اور ان کے وزراء آپس میں بحث مباحثے اور حجت و تکرار کرتے اور جب ذرا فرصت ملتی تو مزے اُڑاتے تھے۔ انھوں نے اب اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت بڑا خطرہ دور ہو گیا تھا اور وہ لوگ کھل کر سانس لے سکتے تھے۔ نپولین کے ساتھ دغا کرنے والا تیلی رینڈ بادشاہوں اور ان کے وزراء میں بہت مقبول تھا۔ کانگریس میں اس نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔

ایک سال سے کم مدت میں ہی نپولین ایلبا سے تنگ آ گیا اور ادھر فرانس والے بوربون خاندان کی شہنشاہیت سے تنگ آ چکے تھے۔ نپولین کسی طرح ایک چھوٹی سی کشتی میں وہاں سے بھاگ نکلا اور ۲۶ فروری ۱۸۱۵ء کو شاید اکیلا ہی زوریا برکینس کے مقام پر کنارے آ لگا۔ کسانوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس کے خلاف بھیجی گئی فوجوں نے جب اپنے پرانے سپہ سالار "ننھے کارپورل" کو دیکھا تو وہ "بادشاہ سلامت زندہ باد" کے نعرے لگا کر اس سے جا ملے۔ وہ فاتحانہ شان اور مسرت کے ساتھ پیرس پہنچا۔ اس کے پہنچتے ہی بوربون بادشاہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ تمام یورپی دارالسلطنتوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ویانا میں جہاں کانگریس ابھی تک لشتم پشتم چل رہی تھی، ناچ و رنگ کی محفلیں بھنگ ہو گئیں۔ اس اچانک اور بڑے خطرے کو سامنے دیکھ کر سارے شہنشاہ اور وزراء آپسی چپقلشوں کو بھول گئے اور ان کی ساری توجہ دوبارہ نپولین پر مرکوز ہو گئی۔ سارا یورپ اسلحہ بند ہو کر اس کے خلاف آ ڈٹا۔ لیکن فرانس تو لڑائیوں سے اُکتا چکا تھا اور نپولین جو ابھی چھیالیس سال کا ہی تھا اب ایک تھکا ہوا اور بوڑھا انسان رہ گیا تھا۔ اس کی بیوی میری لیوسی بھی اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کچھ لڑائیوں میں اس کو فتح ضرور نصیب ہوئی لیکن فرانس میں قدم رکھنے کے ٹھیک سو دن بعد ویلنگٹن اور بلوشر کے ماتحت انگریز اور پرشیا کی فوجوں نے برسلیس شہر کے پاس واٹرلو میں اُسے شکست دے دی۔ واٹرلو کی لڑائی میں دونوں طرف سے برابر کا مقابلہ تھا اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ فتح کس کی ہو گی۔ نپولین کی قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا، اس جنگ میں اس کی فتح کے امکانات روشن ضرور تھے لیکن اگر وہ یہ

لڑائی جیت بھی جاتا تو بھی کچھ دن بعد اُسے یورپ کی مشترکہ اور متحد طاقت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑتے۔ اب چونکہ وہ ہار چکا تھا، اس لیے اس کے بہت سے حامیوں نے بھی اُس کی مخالفت کر کے اپنی جانیں بچانی چاہیں۔ اب لڑائی کا جاری رکھنا فضول تھا، اس لیے اُس نے دوبارہ تخت و تاج کو چھوڑ دیا اور فرانس کی ایک بندرگاہ میں خود کو ایک برطانوی جہاز کے کپتان کے حوالے کر دیا اور اس سے اپنی یہ خواہش ظاہر کر دی کہ وہ اطمینان اور امن کی زندگی گزارنے کے لیے انگلینڈ میں بسنا چاہتا ہے۔

انگلینڈ یا یورپ سے اس طرح کے فیاضانہ سلوک کی اُمید رکھنا اس کی بھول تھی۔ وہ اُس سے بہت خوف زدہ تھے اور ایلبا سے اُس کے فرار ہو جانے پر ان کا یہ خیال مستحکم ہو گیا کہ اُسے دور دراز کے علاقے میں سخت نگرانی کے اندر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے اُس کی مخالفت کے باوجود اُسے قیدی قرار دے دیا گیا اور کچھ ساتھیوں کے ساتھ اُسے بحر اوقیانوس کے ایک دُور اُفتادہ جزیرے سینٹ ہیلینا میں بھیج دیا گیا۔ وہ یورپ کا قیدی مانا گیا اور کئی ملکوں نے سینٹ ہیلینا میں اس پر نگرانی رکھنے کے لیے کمشنر مقرر کیے۔ لیکن اصل میں اس پر نگرانی رکھنے کی پوری ذمے داری انگلینڈ پر تھی۔ اس دُور اُفتادہ جزیرے پر پہرہ دینے کے لیے ساری دُنیا کی ایک اچھی خاصی فوج جمع ہو گئی تھی۔ اُس وقت وہاں کے روسی کمشنر کاؤنٹ بالمین نے سینٹ ہیلینا کی اُس تنہا چٹان کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ دُنیا کی وہ جگہ ہے جو سب سے زیادہ پُردرد، سب سے زیادہ الگ تھلگ، تمام دُنیا سے کٹی ہوئی اور اسی لیے سب سے زیادہ محفوظ اور حملے کے لیے سب سے زیادہ مشکل اور بات چیت کے لیے سب سے زیادہ تنہا ہے۔" اس جزیرے کا انگریز گورنر بالکل وحشی اور غیر مہذب شخص تھا۔ وہ نپولین کے ساتھ بہت رکیک حرکتیں کرتا تھا۔ نپولین کو جزیرے کے سب سے زیادہ خراب آب و ہوا والے علاقے کے سب سے گھٹیا مکان میں رکھا گیا اور اُس پر اور اس کے ساتھیوں پر طرح طرح کی شرمناک پابندیاں لگا دی گئیں۔ کبھی کبھی تو اُسے کھانے کے لیے اچھا کھانا بھی پیٹ بھر نہیں ملتا تھا۔ اُسے یورپ میں رہنے والے دوستوں سے خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ اپنے

اس ننھے بچّے کی بھی خیر و عافیت نہیں معلوم کر سکتا تھا جسے اپنے عروج کے زمانے میں اُس نے لاڈ میں شہنشاہِ روم کا خطاب دے رکھا تھا۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ نپولین کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا گیا۔ ہیلینا کا گورنر تو صرف حکم کا بندہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت کی یہ جانی بوجھی پالیسی تھی کہ اس قیدی کے ساتھ بُرا سلوک کیا جائے اور اُسے ہر طرح ذلیل کیا جائے۔ یورپ کے دوسرے ملک اِس رویّے سے متّفق تھے، نپولین کی ماں بوڑھی ہونے پر بھی سینٹ ہیلینا میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہنا چاہتی تھی لیکن ان بڑی طاقتوں نے اُسے اس بات کی بھی اجازت نہیں دی۔ نپولین کے ساتھ جو بُرا سلوک کیا گیا اُس سے اُس تشدّد اور ظلم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اب تک یورپ میں اُس کے نام سے منسوب تھا، حالانکہ اُس کے پر کاٹ دیے گئے تھے۔ اور اس وقت وہ ایک دور دراز کے جزیرے میں معذور اور بے بس پڑا ہوا تھا۔

ساڑھے پانچ سال تک وہ سینٹ ہیلینا میں زندہ موت کا یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ چھوٹی سی چٹان کے اُس جزیرے میں قید ہو کر اور روز روز کی ذِلّتیں سہ کر اس زبردست ہمّت اور قوّت والے حوصلہ مند شخص نے جو مصیبتیں اُٹھائی ہوں گی انھیں تصوّر میں لانا بھی مشکل ہے۔

نپولین مئی ۱۸۲۱ء میں مرا۔ مرنے کے بعد بھی گورنر کے دل سے نفرت کا جذبہ کم نہیں ہوا۔ اُس نے اُس کے لیے ایک بہت ہی بُری قبر بنوائی۔ نپولین کے ساتھ کی گئی ان بدسلوکیوں کی خبر رفتہ رفتہ یورپ پہنچی (اُن دنوں خبر رسانی کے اتنے تیز رفتار ذرائع نہیں تھے)، اِس خبر کے پہنچتے ہی انگلینڈ اور سارے یورپ میں اس رویّے کے خلاف شور مچ گیا۔ انگلینڈ کا وزیر خارجہ کیسل رے، جو اس بدسلوکی کے لیے سب سے زیادہ ذمّے دار تھا، کچھ اس وجہ سے اور کچھ اپنی سخت خارجی پالیسی کی وجہ سے بہت بدنام ہو گیا۔ اس بدنامی کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اُس نے خودکشی کر لی۔

دُنیا کی عظیم اور غیر معمولی شخصیتوں کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں

ہے کہ نپولین ایک جلیل القدر انسان اور غیر معمولی خوبیوں کا مالک تھا۔ اس میں غلط و صلاحیتیں اور غیبی قوت موجود تھی۔ لیکن ذہن و فکر اور تصورات کی گہرائی کے باوجود اُس میں اعلیٰ نصب العین اور بے لوث جذبات کی قدر و قیمت کا فقدان تھا۔ وہ لوگوں کو عہدے اور دولت دے کر قابو میں رکھنے اور اس طرح اپنا اثر قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس لیے جب اس کی شہرت اور اقتدار کا زمانہ ختم ہوگیا تو جن لوگوں کو اُس نے اونچا اُٹھایا تھا، وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ مذہب کو تو وہ غریبوں اور دُکھیوں کو ان کی بدحالی اور محتاجی پر قانع رکھنے کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔ وہ مذہب میں بالکل یقین نہیں رکھتا تھا مگر مذہب کی حوصلہ افزائی ضرور کرتا تھا۔ کیوں کہ وہ اُسے اپنے زمانے کی سماجی تنظیم کی ریڑھ کی ہڈی مانتا تھا۔ وہ کہتا تھا ——— مذہب نے جنّت کے تخیل کے ساتھ مساوات کے خیال کو بھی جوڑ رکھا ہے، جو غریبوں کو امیروں کا خاتمہ کرنے سے روک سکتا ہے۔ مذہب کا وہی استعمال ہے جو چیچک کے ٹیکے کا۔ وہ ہمارے کچھ کر گزرنے کے جذبے کو دبا دیتا ہے .... دولت کی نابرابری کے بغیر سماج ٹک ہی نہیں سکتا اور دولت کی نابرابری مذہب کے بغیر ٹھیر نہیں سکتی ہے۔ اس شخص کو جو بھوک سے مر رہا ہے، لیکن جس کا پڑوسی خوش ذائقہ دعوتیں اُڑا رہا ہے اُسے تسلی دینے والی صرف ایک ہی بات تو ہے ——— خدا کی قدرت میں یقین اور یہ تصور کہ آخرت میں چیزوں کی تقسیم کا دوسرا ہی طریقہ ہوگا......"

نپولین میں عظیم الشان انسانوں کی سی کشش تھی۔ اس نے بہت سے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔ اکبر کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی غضب کی کشش تھی۔ ایک بار اس نے کہا تھا ——— "میں نے تلوار بہت کم کھینچی ہے۔ میں نے لڑائیاں اپنی آنکھوں سے جیتی ہیں۔ ہتھیاروں سے نہیں"۔ جس آدمی نے سارے یورپ کو جنگ کے چنگل میں پھنسا دیا اُس کی زبان سے یہ الفاظ بہت عجیب سے معلوم ہوتے ہیں۔ بعد میں جب وہ قید تھا، اُس نے کہا تھا کہ "طاقت کا استعمال کوئی حل نہیں ہے اور انسان کی روح تلوار سے بھی زیادہ طاقت ور ہے"۔ اُس نے کہا تھا ——— "تم جانتے ہو

مجھے سب سے زیادہ حیرت کس بات پر ہوتی ہے؟ اس بات پر کہ طاقت کسی چیز کو منظم کرنے کی قدرت نہیں رکھتی ہے "دنیا میں صرف دو ہی طاقتیں ہیں۔ ایک تو روحانی اور دوسری شمشیر کی طاقت۔ ان میں آخری کامیابی ہمیشہ روحانی قوت کو حاصل ہوگی، لیکن آخری فتح حاصل کرنا خود اس کی قسمت میں نہ تھا وہ تو عجلت میں تھا اور اپنی زندگی کے سفر کے شروع میں ہی اُس نے شمشیر کا راستہ منتخب کر لیا تھا۔ شمشیر سے ہی اس نے فتح حاصل کی اور نوک شمشیر ہی اس کے زوال کا سبب بنی۔ پھر وہ یہ بھی کہتا تھا کہ ـــــ "جنگ اب اس زمانے کی چیز نہیں ہے۔ ایک دن وہ آئے گا جب توپوں اور سنگینوں کے بغیر فتح حاصل کی جایا کرے گی۔" حالات نے ہر طرف سے اُسے آجکڑا تھا ـــــ اُس کی چھلانگیں مارنے والی بوالہوسی۔ جنگیں فتح کرنے میں آسانی اور یورپ کے حکمرانوں کا اس نوخیز چھوکرے کی طرف سے حسد اور خوف کا جذبہ، ان سب نے اُسے اطمینان کے ساتھ جمنے نہیں دیا۔ میدانِ جنگ میں وہ بہت لاپرواہی کے ساتھ لوگوں کی جانیں جھونک دیتا تھا، لیکن پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ لوگوں کی تکلیفوں کو دیکھ کر اس کا دل پسیج اُٹھتا تھا۔

شخصی زندگی میں وہ بہت سادہ طبیعت تھا۔ کام کے سوا کبھی کسی بات میں زیادتی نہیں کرتا تھا۔ اُس کی رائے میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی کم کھائے وہ ہمیشہ ضرورت سے زیادہ کھاتا ہے۔ زیادہ کھانے سے آدمی بیمار پڑ سکتا ہے، کم کھانے سے کبھی نہیں۔ یہی سادہ زندگی تھی، جس کی وجہ سے اس کی صحت اتنی اچھی تھی اور اُس میں کام کرنے کی بے پناہ قوت تھی۔ وہ جب چاہتا اور جتنا کم چاہتا، سو سکتا تھا۔ صبح سے سہ پہر تک لگاتار گھوڑے پر سو سو میل کا سفر کر لینا اُس کے لیے معمولی بات تھی۔

جیسے جیسے اُس کی حوصلہ مندی یورپ کے برِّ اعظم کو سر کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی، ویسے ویسے وہ یہ سوچنے لگا کہ یورپ ایک ریاست ہے، ایک وحدت ہے، جہاں ایک قانون اور ایک ہی حکومت ہونی چاہیے۔ بعد میں سینٹ ہیلینا میں نظر بند

کیے جانے کے بعد جب اُس کے دماغ کا توازن برقرار ہوا تو یہ خیال پھر اُس کے ذہن میں زیادہ واضح شکل میں پیدا ہوا ـــــ "کبھی نہ کبھی واقعات کی رَو میں آکر (یورپ کے ملکوں کا) یہ اتحاد ہوگا۔ پہلا دھکّا لگ چکا ہے اور مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ میرے طریقے کا خاتمہ ہونے کے بعد یورپ میں توازن قائم کرنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو وہ مُلکوں کے ایک وفاق کا راستہ ہے ـــ" یورپ اب متحدہ وفاق کے بارے میں تجربے کی منزل سے گزر رہا ہے۔

لیکن یہ سب خیالات اُس کے ذہن میں اُس وقت آئے جب وہ نظر بند تھا اور جب اس کی عقل ٹھکانے آگئی تھی۔ یا شاید اُس نے بعد کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے ایسا لکھا ہو۔ اپنے عروج کے زمانے میں وہ جدوجہد کرنے والا ایسا باعمل انسان تھا کہ وہ فلسفی نہیں بن سکتا تھا۔ وہ تو اقتدار کی دیوی کا پرستار تھا۔ وہ اقتدار سے سچی محبت رکھتا تھا۔ مگر اس محبت میں گنوار پن نہیں، بلکہ فن کار کی جابک دستی تھی۔ اقتدار کی بہت زیادہ ہوس خطرناک ہوتی ہے اور جو شخص یا جو ملک اس کے پیچھے پڑتا ہے وہ کبھی نہ کبھی تباہ ہو ہی جاتا ہے۔ پس نپولین کا بھی خاتمہ ہوگیا اور یہ اچھا ہی ہوا۔

ادھر بوربون لوگ فرانس میں حکومت کر رہے تھے، لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ بوربون لوگوں نے ان ساری باتوں سے نہ تو کچھ نصیحت حاصل کی اور نہ پُرانی باتوں کو ہی بھولے۔ نپولین کے مرنے کے نو سال کے بعد فرانس اُن سے تنگ آگیا اور اس نے انھیں اُکھاڑ پھینکا۔ ایک دوسری طاقت برسرِ اقتدار آئی۔ نپولین کی یاد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اُس کی مورتی، جو وینڈوم کے مینار سے ہٹادی گئی تھی، دوبارہ نصب کر دی گئی۔ نپولین کی دُکھیا ماں نے: جو بڑھاپے میں اندھی ہوگئی تھی کہا ـــــ شہنشاہ (نپولین) ایک بار پھر پیرس میں آگیا ہے۔

کچھ اور ہندو مصلحین

ہندوستان میں مغربی خیالات کے میل کا کچھ اثر ہندو مذہب پر بھی پڑا۔ عوام پر تو اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور حکومت وقت کی حکمتِ عملی نے جان بوجھ کر دقیانوسیت کو تقویت پہنچائی۔ لیکن سرکاری ملازمین اور پیشہ ور لوگوں کا جو نیا متوسط طبقہ ابھر رہا تھا اس پر ضرور ان کا اثر پڑا۔ انیسویں صدی کے شروع میں ہی بنگال میں ہندو مذہب میں مغربی انداز پر سدھار لانے کی کچھ کوشش کی گئی۔ اس نئی کوشش پر یقینی طور سے عیسائیت اور مغربی خیالوں کا اثر تھا۔ اس کوشش کے روح رواں ایک اعلیٰ شخصیت اور مایۂ ناز عالم راجہ رام موہن رائے تھے۔ انھیں سنسکرت عربی اور کئی دوسری زبانوں کی اچھی واقفیت تھی۔ انھوں نے مختلف مذہبوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ پوجا پاٹ قسم کی محض ظاہری مذہبی رسومات کے خلاف تھے اور سماج سدھار اور عورتوں کی تعلیم کے علمبردار تھے۔ انھوں نے ایک انجمن قائم کی جو برہمو سماج کے نام سے مشہور ہوئی۔ جہاں تک اس انجمن کے ممبروں کی تعداد کا تعلق ہے یہ ایک چھوٹی سی انجمن تھی۔ وہ اب بھی ویسی ہی ہے اور بنگال کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے تک محدود ہے لیکن بنگال کی زندگی پر اس کا زبردست اثر پڑا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا خاندان ان کا پیرو بن گیا اور شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کے والد مہارشی دیویندر ناتھ ٹھاکر کئی سال اس کے روحِ رواں رہے۔ اس کے ایک اور خاص رکن تھے ـــــــ

کیشو چندر سین۔

اس صدی کے آخر میں ایک اور مذہبی سدھار کی تحریک چلی سوامی دیانند سرسوتی اس کے بانی تھے۔ اُنھوں نے آریہ سماج نام کی ایک انجمن قائم کی۔ اس تحریک نے بھی ہندو مذہب میں بعد میں پیدا ہونے والی بُرائیوں کی نکتہ چینی کی اور ذات پات کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس کی دعوت تھی "ویدوں کے سایے میں آؤ۔" حالاں کہ یہ مُسلم اور عیسائی خیالوں سے متاثر ایک اصلاحی تحریک تھی لیکن اپنی بنیادی شکل میں یہ ایک شدید روحانی ولولے کی تحریک بھی تھی۔ اس کا ایک عجیب نتیجہ یہ ہوا کہ آریہ سماج کی تحریک جو شاید ہندوؤں کے مختلف فرقوں میں سب سے زیادہ اسلام کے قریب پہنچتی ہے اسلام کی کٹر دشمن اور حریف بن گئی۔ یہ ایک تحفظانہ تدبیر تھی اور بے حس ہندو مذہب کو ایک انقلابی تبلیغی مذہب میں بدل دینے کی کوشش تھی۔ اس کا مقصد ہندو مذہب کو نئے سرے سے جگانا تھا۔ قومیت کا رنگ دے دینے سے اس تحریک کو کچھ تقویت مل گئی۔ دراصل اس تحریک کی شکل میں ہندو قومیت اپنا سر اُٹھا رہی تھی اور چوں کہ یہ ہندو قومیت تھی اس لیے اس کے لیے ہندوستانی قومیت کی شکل اختیار کرنا مشکل ہو گیا۔

برہمو سماج کے مقابلے میں آریہ سماج کا کہیں بڑے پیمانے پر پرچار تھا خاص طور سے پنجاب میں۔ لیکن یہ تحریک زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگوں تک ہی محدود رہی۔ اس نے تعلیم کے پھیلانے میں بہت بڑا کام کیا ہے اور لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے اسکول اور کالج کھولے ہیں۔

اس صدی کی ایک اور غیر معمولی مذہبی شخصیت رام کرشن پرم ہنس کی ہے لیکن وہ اُن عظیم انسانوں سے بہت مختلف تھے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ وہ ان سب سے جُدا تھے۔ انھوں نے سدھار کے لیے کسی جوشیلے سماج کا قیام نہیں کیا۔ انھوں نے خدمت پر زور دیا "رام کرشن مشن" کی شکل میں ملک کے مختلف حصّوں میں اس مشن کے توسط سے معذوروں اور غریبوں کی خدمت کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ رام کرشن

پرم ہنس کے ایک مشہور شاگرد سوامی وی ویکانند گزرے ہیں جنھوں نے بہت اُمنگ اور جوشیلے ڈھنگ سے قومیت کے نعرے کو بلند کیا۔ یہ قومیت کسی بھی طرح مسلم دشمن یا کسی کی مخالف نہیں تھی، نہ آریہ سماج کی طرح کی تنگ نظر قومیت تھی مگر اس کے باوجود وی ویکانند کی قومیت کی شکل ہندو قومیت کی ہی تھی۔ اور اس کی بنیاد ہندو مذہب اور ہندو تہذیب و تمدن پر تھی۔

اس طرح یہ ایک دل چسپ بات معلوم ہوتی ہے کہ اُنیسویں صدی میں ہندوستان میں قومیت کی ابتدائی لہروں کی بنیادیں مذہب اور ہندو مذہب کارفرما تھا۔ ظاہر ہے کہ اس ہندو قومیت میں مسلمان کوئی حصّہ نہیں لے سکتے تھے۔ وہ اس سے الگ ہی رہے۔ انگریزی تعلیم سے اپنے آپ کو الگ رکھنے کی وجہ سے ان پر نئے خیالوں کا کم اثر ہوا اور ان میں ذہنی بیداری بہت ہی کم آئی۔ کافی برسوں کے بعد انھوں نے اس تنگ دائرے سے باہر نکلنا شروع کیا اور پھر ہندوؤں کی طرح ان کی قومیت نے بھی اسلامی شکل اختیار کر لی۔ وہ اسلامی روایات اور اسلامی تہذیب و تمدن کی طرف مڑ کر دیکھنے لگے اور انھیں یہ اندیشہ ہوگیا کہ ہندوؤں کی اکثریت میں وہ کہیں گُم ہو کر نہ رہ جائیں۔ لیکن مسلمانوں کی یہ تحریک بہت دن بعد پچھلی صدی کے آخیر میں رُونما ہوئی۔

ہندو مذہب اور اسلام کی ان اصلاحی اور ترقی پسند تحریکوں کے بارے میں ایک اور دل چسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے پُرانے مذہبی عقیدوں اور دستوروں کو جہاں تک ممکن ہوا مغرب کی نئی سائنٹفک اور سیاسی فکروں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ نہ تو وہ آزادی کے ساتھ ان پُرانے خیالوں اور دستوروں کے بارے میں شک و شبہات کا اظہار کرتے اور نہ ہی انھیں کسوٹی پر پرکھنے کے لیے تیار تھے اور نہ ہی وہ نئے سائنسی اور سیاسی اور سماجی نظریات اور اپنے چاروں طرف کی نئی دنیا کو نظرانداز کر سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تمام جدید نظریات اور ترقی کا خزانہ قدیم مذہبی کتابوں میں محفوظ ہے۔

دونوں میں ایک ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش لازمی طور پر ناکام ہونی چاہیے تھی۔ اس نے لوگوں کو صحیح فکر سے روک دیا۔ ہمت کے ساتھ فکر کرنے اور دنیا کی شکل کو بدلنے والے نئے اسباب و وسائل اور نئے خیالوں کو سمجھنے کے بجائے ان کے دماغ قدیم روایات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے۔ آگے دیکھنے اور آگے بڑھنے کے بجائے وہ ہر وقت پوری چھپے پیچھے کی طرف تاکتے رہتے تھے۔ اگر کوئی اپنی گردن ہمیشہ موڑے رہے اور پیچھے کی طرف دیکھتا رہے تو آسانی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

ڈاکٹر سن یات سین

روس اور جاپان کے مابین جنگ کے دوران چین خاموش تماشائی بنا رہا۔
حالاں کہ جنگ چین کے ایک صوبے منچوریا میں ہو رہی تھی۔ جاپان کی فتح نے چین کے
اصلاح پسندوں کے ہاتھ مضبوط کر دیے۔ تعلیم کا جدید نظام رائج کیا گیا۔ نئے
سائنسی علوم کے مطالعے کے لیے بہت سے طالب علم یورپ، امریکا اور جاپان
بھیجے گئے۔ افسروں کے تقرر کا پرانا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ دو ہزار سال سے افسروں
کے تقرر کا ایک عجیب و غریب طریقہ، جو چین کی اپنی خصوصیت تھا، رائج چلا آ رہا تھا۔
جس کی افادیت بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ یہ طریقہ چین کی ترقی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا
اس لیے اس کا ختم ہو جانا بہتر ہی ہوا۔

واقعات کی رو نے چین کے بہت سے لوگوں میں نئی زندگی کی تڑپ پیدا
کر دی اور انھیں دوسرے مقامات میں جا کر علم کی روشنی حاصل کرنے کے لیے مجبور
کر دیا۔ عوام اس سے بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے ۱۸۹۴ء میں
ڈاکٹر سن یات سین نے چین کی نشاۃ ثانیہ کمیٹی قائم کر دی تھی۔ چین میں غیر ملکی طاقتوں
نے تشدد آمیز اور یک طرفہ معاہدے کر لیے تھے۔ انھیں چینی عوام "غیر متوازن معاہدے"
کہا کرتے تھے۔ ان معاہدوں کی مخالفت میں بہت سے لوگ اس کمیٹی میں شامل ہو گئے۔
یہ کمیٹی پھولنے پھلنے لگی۔ ملک کے نوجوان اس کی طرف کھنچنے لگے۔ ۱۹۱۱ء میں اس کا

نام بدل کر کاؤمن تانگ یعنی عوام کی قومی جماعت رکھا گیا اور جو چینی انقلاب کا محور بن گئی۔ اس تحریک کے علمبردار ڈاکٹر سن یات سین کے سامنے ممالکِ متحدہ امریکا کی مثال تھی۔ اسے وہ ایک نمونے کی ریاست مانتے تھے۔ وہ جمہوریہ کے قیام کے حامی تھے۔ ان کو نہ تو انگلینڈ کی طرح کی دستوری شہنشاہیت پسند تھی اور نہ جاپان کی سی شہنشاہ پرستی ان کو گوارا تھی۔ چینیوں نے اپنے شہنشاہ کو قابلِ پرستش کبھی نہیں مانا' پھر اُس وقت تو چین کا شاہی خاندان چینی نہیں تھا۔ وہ منچو خاندان تھا۔ عوام میں منچو دشمن رجحانات پھیلتے جا رہے تھے۔

عوام میں منچو دشمن رجحانات اور مطلق العنانیت کے خلاف جذبات پرورش پانے لگے۔ انقلابی بھی زور پکڑنے لگے۔ اس وقت چین کے ایک صوبے کا وائسرائے یوآن شی۔کائی ہی ایک ایسا مضبوط آدمی تھا جو ان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ یہ بوڑھی لومڑی کی طرح چالاک تھا۔ خوش قسمتی سے چین کی واحد باکمال اور جدید فوج جسے "شمالی فوج" کا نام دیا گیا تھا اس کے ہاتھ میں تھی۔ منچو حکمرانوں نے بے وقوفی میں آکر اسے خفا کر دیا اور عہدے سے معزول کر دیا۔ اس طرح انھوں نے ایک ایسے آدمی کو کھو دیا جو' کچھ دیر کے لیے ہی سہی ان کی حفاظت کر سکتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں یانگ سی کی وادی میں انقلاب کی آگ بھڑک اُٹھی اور جلدی ہی وسطی اور جنوبی چین کے بڑے حصے میں بغاوت پھیل گئی۔ یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو ان صوبوں نے جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا اور نانکنگ کو دارالسلطنت بنایا۔ ڈاکٹر سن یات سین صدر چنے گئے۔

ادھر یوآن شی کائی اس ڈرامے کو دیکھ رہا تھا وہ موقع کا منتظر تھا۔ ریجنٹ نے (جو اس وقت نابالغ شہنشاہ کی طرف سے حکومت کر رہا تھا) یوآن کو برخاست کرنے کے بعد دوبارہ بلایا۔ یہ قصہ بھی بہت دل چسپ ہے۔ قدیم چین میں ایک بات بہت مہذب طریقے سے کی جاتی تھی۔ جس وقت یوآن کو برخاست کرنا تھا تو یہ اعلان کیا گیا کہ اس کے پیر میں تکلیف ہے۔ جب کہ سب کو اصلیت کا پتہ تھا کہ اس کے پیروں کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ اُسے برخاست کرنے کی محض ایک رسمی کارروائی تھی۔ لیکن یوآن نے بھی

اپنا بدلہ لے لیا۔ دو سال بعد ۱۹۱۱ء میں جب حکومت کے خلاف بغاوتوں کا بازار گرم تھا، ریجنٹ نے گھبرا کر یوآن کو بلوایا۔ لیکن یوآن کا ارادہ اس وقت تک جانے کا نہیں تھا جب تک اس کی شرائط منظور نہ کر لی جائیں۔ اُس نے ریجنٹ کو جو جواب بھیجا اس میں اظہارِ افسوس کے ساتھ کہا کہ اس کے لیے گھر چھوڑنا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ پیروں میں تکلیف ہونے کی وجہ سے وہ سفر نہیں کر سکتا! لیکن ایک ماہ بعد جب اس کی شرطیں منظور کر لی گئیں تو اس کی ٹانگیں بھی اچھی ہو گئیں۔

لیکن اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ یہ انقلاب روکے نہیں رُک سکتا تھا۔ یوآن بھی اس قدر چالاک تھا کہ وہ دونوں فریق میں سے کسی کے ساتھ بندھ کر اپنی پوزیشن کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ بالآخر اس نے منچوؤں کو تخت و تاج سے دست بردار ہونے کا مشورہ دیا۔ ادھر تو جمہوریت ان کے مقابلے پر صف آرا تھی اُدھر ان کے سپہ سالار نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے منچو حکمرانوں کے لیے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ۱۲ر فروری ۱۹۱۲ء کو تخت چھوڑنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ اس طرح ڈھائی سو سال سے زیادہ کی یادگار حکومت کے بعد چین کے شاہی تخت سے منچو خاندان رخصت ہو گیا۔ ایک چینی کہاوت کے مطابق یہ شیر جیسا گرجتا ہوا آیا اور سانپ کی دُم کی طرح چپکے سے غائب ہو گیا۔

اسی، یعنی ۱۲ر فروری کے دن نئی جمہوریہ کے دارالسلطنت نان کنگ میں پہلے منگ شہنشاہ کے مقبرے پر عجیب و غریب رسم ادا کی گئی۔ ایک ایسی رسم جس میں جدید و قدیم کا فرق دکھاتے ہوئے انھیں ایک جگہ پر جمع کر دیا گیا تھا۔ جمہوریہ کے صدر سن یات سین نے اپنی کابینہ کے ساتھ مقبرے پر پُرانے طریقے پر نذر چڑھائی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا ـــــ ہم مشرقی ایشیا کے لیے جمہوری نظام کا طریقہ سب سے پہلے پیش کر رہے ہیں۔ جو لوگ کوشش کرتے ہیں انھیں جلدی یا دیر سے کامیابی ملتی ہی ہے۔ نیکی کا صلہ آخیر میں یقینی ملتا ہے۔ پھر ہم آج یہ غم کیوں کریں کہ یہ دن اتنی دیر سے آیا۔

کئی سال تک اپنے ملک میں اور ملک بدر ہوکر بھی سن یات سین چین کی آزادی کے لیے جان لڑاتے رہے اور بالآخر انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن آزادی ایک بے وفا محبوب ہے جسے حاصل کرنے کے لیے پہلے اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ اکثر وہ ہمیں جھوٹی امیدیں دلا دلا کر بہلاتی ہے، طرح طرح کی آزمائش میں ڈالتی ہے اور ہمارا امتحان لیتی ہے اور ان منزلوں سے گزر جانے کے بعد ہی کہیں وہ حاصل ہوتی ہے۔ چین اور ڈاکٹر سن یات سین کی منزل ابھی کافی دور تھی۔ کئی سال تک اس نوزائیدہ جمہوریت کو اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرنی پڑی۔

منچوؤں نے تو تخت و تاج کو خیر باد کہہ دیا لیکن جمہوریہ سلطنت کے راستے میں یوآن ابھی تک کانٹا بنا ہوا تھا۔ معلوم نہیں اس کا ارادہ کیا تھا۔ شمالی علاقہ اس کے اختیار میں تھا اور جنوبی حصہ جمہوریہ کے زیر اختیار۔ امن و امان کو خطرے میں ڈالنے اور خانہ جنگیوں سے بچانے کے لیے سن یات سین نے یہ قربانی دی کہ صدر کا عہدہ چھوڑ دیا اور یوآن کو صدر منتخب کرا دیا۔ لیکن یوآن تو جمہوریت پسند نہ تھا وہ تو اپنے عروج کے لیے اقتدار حاصل کرنے کی تاک میں تھا۔ جس جمہوریہ نے اُسے اپنا صدر منتخب کرکے اس کو اعزاز بخشا تھا وہ اُسی کو کچلنے کے درپے ہوگیا۔ اس کے لیے اُس نے باہری ملکوں سے بڑی بڑی رقمیں اُدھار لیں۔ اُس نے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا اور کاؤمن تانگ کو توڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو جماعتیں ہوگئیں اور ڈاکٹر سین کی سرکردگی میں جنوب میں مقابل حکومت کا قیام ہوا۔ جس انتشار اور پھوٹ سے بچنے کی ڈاکٹر سین نے کوشش کی تھی، وہی بات سامنے آگئی اور جس وقت پہلی جنگ عظیم چھڑی۔ چین میں دو حکومتیں تھیں۔ یوآن نے شہنشاہ بننے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا اور تھوڑے ہی دنوں بعد مرگیا۔

اگست ۱۹۱۷ء میں جنگ شروع ہونے کے تین سال بعد چین اتحادی ملکوں کے ساتھ مل گیا اور اس نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ یہ مضحکہ خیز بات تھی کیوں کہ چین جرمنی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کا سارا مقصد یہ تھا کہ وہ اتحادی

ملکوں کے ساتھ اپنے کشیدہ تعلقات کو دوبارہ استوار کر کے جاپان کے تیزی سے بڑھتے ہوئے شکنجوں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے۔

اس کے کچھ ہی دن بعد نومبر ۱۹۱۷ء میں روس میں بالشویک انقلاب ہو گیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر سارے شمالی ایشیا میں بڑی گڑبڑ پھیل گئی۔ سوویت اور سوویت دشمن فوجوں کا ایک میدانِ جنگ سائبیریا تھا۔ روسی، سفید فام، سپہ سالار کول چک سوویتوں کے خلاف سائبیریا میں اپنا اڈہ بنا کر لڑ رہا تھا۔ سوویت کی شاندار فتح سے چوکنے ہو کر جاپانیوں نے سائبیریا کو ایک بڑی فوج بھیجی۔ برطانوی اور امریکی فوجیں بھی وہاں بھیجی گئیں۔ کچھ مدت کے بعد سائبیریا اور وسط ایشیا پر روسی اثر ختم ہو گیا۔ برطانوی سرکار نے ان علاقوں سے روسی اقتدار کا نام و نشان مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وسط ایشیا کے ٹھیک بیچ میں انگریزوں نے بالشویک دشمن پروپیگنڈا کرنے کے لیے ریڈیو اسٹیشن قائم کر دیا۔

منگولیا میں بھی سوویت اور سوویت دشمن لوگوں میں سخت لڑائی ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں جب جنگِ عظیم چل رہی تھی، زار شاہی روس کی امداد سے منگولیا، چین کی حکومت سے خود اختیاری کا حق حاصل کرنے میں بہت کچھ کامیاب ہو گیا تھا۔ اقتدارِ اعلیٰ تو چین کا ہی تسلیم کیا گیا، مگر منگولیا کے بیرونی معاملات میں روس کو بھی کچھ دخل مل گیا۔ یہ ایک عجیب و غریب انتظام تھا۔ سوویت انقلاب کے بعد منگولیا میں خانہ جنگی چھڑ گئی جس میں تین سال سے زیادہ کی جدوجہد کے بعد سوویت کی فتح ہوئی۔

جنگِ عظیم کے بعد ہونے والی امن کانفرنس نے۔ یعنی بڑی طاقتوں نے جس میں خاص طور سے انگلینڈ، فرانس اور متحدہ امریکہ کو شمار کرنا چاہیے۔ چین کا شانتنگ صوبہ جاپان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اس جنگ کے نتیجے کے طور پر ان طاقتوں نے اپنے ساتھی چین سے اس کے ملک کا ایک ٹکڑا بیچ بیچ جاپان کو دلوا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دورانِ جنگ میں انگلینڈ، فرانس اور جاپان کے مابین خفیہ معاہدہ ہو گیا تھا۔ اس کا سبب خواہ کچھ رہا ہو چین کے ساتھ اس گندی چال بازی پر

چینی عوام نے زبردست غصّے کا اظہار کیا اور پیکنگ کی حکومت کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اِس معاملے میں سمجھوتہ کر لیا تو انقلاب ہو جائے گا۔ جاپانی مال کا سختی سے بائیکاٹ کرنے کا بھی اعلان کر دیا گیا اور جاپان دشمن مظاہرے اور بلوے ہوئے چینی حکومت نے (میری مراد شمال کی پیکنگ حکومت سے ہے جو خاص حکومت تھی) امن کے معاہدے پر رضامندی دینے سے انکار کر دیا۔

دو سال بعد متحدہ امریکا کے واشنگٹن شہر میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں شانٹنگ کا یہ سوال اٹھایا گیا۔ یہ کانفرنس ان سب طاقتوں کی تھی جن کا دور مشرق کے سوال سے سروکار تھا اور وہ اپنی بحری فوجوں کی تعداد پر غور کرنے کے لیے اکٹھا ہوئے تھے۔ جہاں تک چین اور جاپان کا تعلق تھا ۱۹۲۲ء کی اس واشنگٹن کانفرنس سے کئی اہم نتیجے نکلے۔ شانٹنگ واپس دینے پر جاپان رضامند ہو گیا اور اس طرح جس ایک سوال نے چین والوں کو بری طرح بے چین کر رکھا تھا اس کا حل نکل آیا۔ ان طاقتوں کے درمیان دو اور اہم معاہدے بھی ہوئے۔

ان میں سے ایک معاہدہ جو امریکا، انگلینڈ، جاپان اور فرانس کے مابین ہوا چار طاقتی معاہدہ کہلاتا ہے۔ ان چاروں طاقتوں نے باہم اقرار کیا کہ بحرالکاہل میں ایک دوسرے کے مقبوضہ علاقوں کی سرحدوں کا خیال رکھیں گے اور اُس میں دخل انداز نہیں ہوں گے۔ دوسرا معاہدہ جو نو طاقتی معاہدہ کہلاتا ہے اس کانفرنس میں شامل ہونے والی نو طاقتوں، متحدہ امریکا، بلجیم، انگلینڈ، فرانس، اٹلی، جاپان، ہالینڈ، پرتگال اور چین کے مابین ہوا۔

ان دونوں معاہدوں کا مقصد آئندہ حملوں سے چین کی حفاظت کرنا اور نئے علاقوں پر قبضہ کرنے کے اِس کھیل کو روکنا تھا جو اب تک بہت دھڑلّے سے کھیلا جا رہا تھا۔ مغربی طاقتوں کو جنگ کے بعد کے مسائل سے ہی فرصت نہیں تھی۔ اس وقت چین میں انھیں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے خود ایثاری کا یہ قاعدہ بنا کر اس پر عمل پیرا ہونے کا اقرار کیا۔ جاپان نے بھی اس پر کاربند ہونے کا وعدہ

کیا حالاں کہ یہ اس کی اس متعینہ پالیسی کے خلاف تھا، جسے وہ بہت پہلے سے برتتا آرہا تھا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ یہ بات ظاہر ہوگئی کہ تمام معاہدوں اور اقرار ناموں کے باوجود جاپان نے اپنی پرانی پالیسی نہیں بدلی ہے۔ اس نے چین پر حملہ کردیا بین الاقوامی معاہدے سے مکر جانے کی یہ ایک شرم ناک مثال ہے۔ آگے چل کر جو واقعات رونما ہوئے ان کے پسِ منظر کو سمجھنے کے لیے ہی میں نے یہاں واشنگٹن کانفرنس کا ذکر کرنا ضروری سمجھا۔

اسی واشنگٹن کانفرنس کے زمانے کے آس پاس سائبیریا سے غیر ملکی فوجوں کو آخری طور پر ہٹالیا گیا۔ جاپانی سب سے آخر میں ہٹے۔ ان کے ہٹتے ہی "مقامی سودیتیں" فوراً میدان میں آگئیں اور روس کی سوویت جمہوریہ میں شامل ہوگئیں۔

سوویت جمہوریہ نے اپنے قیام کے کچھ ہی دن بعد چینی حکومت کو لکھا تھا اور ان تمام مراعات سے دست بردار ہونے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا، جن سے دوسری سامراجی طاقتوں کی طرح زارشاہی روس بھی فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ایک تو کمیونزم اور سامراج کا کسی طرح کا ساتھ نہیں ہوسکتا۔ مگر اس کے علاوہ بھی سوویت روس نے مشرقی ممالک کی طرف سے، جن کے ساتھ مغربی طاقتیں ایک زمانے سے زیادتیاں کرتی چلی آرہی تھیں، جان بوجھ کر فیاضانہ سلوک کیا۔ سوویت روس کے لیے یہ ایک نیک فرض کی انجام دہی تو تھا ہی، اسی کے ساتھ وہ ایک ٹھوس حکمتِ عملی بھی تھی، کیوں کہ اس سے مشرق کے کئی ملک اُس کے دوست بن گئے۔ مراعات سے دست بردار ہونے کی سوویت روس کی تجویز غیر مشروط تھی وہ اس کے بدلے میں کچھ نہیں چاہتا تھا۔ اس پر بھی چینی حکومت، روس کے ساتھ تعلقات بڑھانے میں ڈرتی تھی کہ کہیں مغربی طاقتیں ناراض نہ ہوجائیں۔ بالآخر روسی اور چینی نمائندے ایک جگہ اکٹھا ہوئے اور ۱۹۲۴ء میں دونوں میں بعض باتوں پر معاہدہ ہوگیا۔ اس معاہدے کی خبر لگتے ہی فرانسیسی، امریکی اور جاپانی حکومتوں نے پیکنگ کی حکومت کو اپنا اختلاف لکھ بھیجا۔ پیکنگ کی حکومت اس سے اتنی گھبرا گئی کہ اُس نے اِس معاہدے

پر اپنے نمائندے کے دستخط ماننے سے ہی انکار کر دیا! اس پر روسی نمائندے نے معاہدے کی ساری عبارت شائع کر دی۔ اس سے کافی سنسنی پھیل گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ باہری طاقتوں سے معاملہ کرنے میں چین کے ساتھ بھلمنساہت کا برتاؤ کیا گیا تھا اور اس کے حقوق کو تسلیم کیا گیا تھا۔ چین کے عوام اس پر خوشی سے اُچھل پڑے اور حکومت کو اس پر رضامندی کا اظہار کرنا پڑا۔ سامراجی طاقتوں کا اسے ناپسند کرنا یقینی تھا۔ کیوں کہ اس سے ان کا سارا پول کھل جاتا تھا۔ وہ سبھی طاقتیں خاص خاص مراعات پر ہی زندہ تھیں۔

سوویت حکومت نے ڈاکٹر سن یات سین کی جنوبی حکومت سے بھی بات چیت شروع کی، جس کا صدر مقام کینٹن میں تھا۔ دونوں میں باہم معاہدہ بھی ہو گیا۔ قریب قریب اِس ساری مُدّت میں شمال اور جنوب کے درمیان اور شمال میں مختلف فوجی سپہ سالاروں کے بیچ ایک خانگی کشمکش سی جاری تھی۔ یہ شمالی توشن یا ان میں سے مہاتوشن کہلانے والے کچھ لوگ کسی اصول یا کسی پروگرام کے لیے نہیں لڑ رہے تھے۔ ان کی لڑائی تو شخصی اقتدار کی تھی۔ وہ کبھی ایک فریق سے اور کبھی دوسرے فریق سے جا ملتے اور نیا گٹھ جوڑ کر لیتے۔ اتھل پتھل کرنے والے یہ حلقے باہر والوں کو بہت چکر میں ڈال دیتے تھے۔ یہ توشن یا فوجی حوصلہ مند، نجی فوجیں کھڑی کرتے تھے، نجی ٹیکس وصول کرتے تھے، نجی لڑائیوں میں لگے رہتے تھے اور ان سب کا بار پڑتا تھا بے چارے مصیبت زدہ عوام پر۔ کہتے ہیں کچھ مہاتوشنوں کی پُشت پر غیر ملکی طاقتیں بھی تھیں، خاص طور سے جاپان۔ شنگھائی کی بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں سے بھی انھیں روپے پیسے کی مدد ملتی رہتی تھی۔

تاریکی سے بھرپور اس ماحول میں صرف جنوبی علاقہ ہی روشن تھا۔ جہاں ڈاکٹر سن یات سین کی حکومت قائم تھی۔ اِس حکومت کے کچھ اصول اور کچھ نصب العین تھے۔ ایک متعینہ حکمت عملی تھی یہ توشنوں کی کچھ حکومتوں کی طرح لٹیروں کا معاملہ نہیں تھا۔ ۱۹۲۴ء میں کومن تانگ یا عوامی پارٹی کی پہلی قومی کانگریس ہوئی اور

ڈاکٹر سن یات سین نے اس کے سامنے ایک اعلان نامہ رکھا۔ اِس اعلان نامے میں انھوں نے قوم کو راستہ دکھانے کے لیے کچھ اصولوں کی تشریح و توضیح کی تھی۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر سن یات سین کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی چین کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی اور وہ چینی عوام کے سب سے زیادہ عزیز اور محبوب بن گئے تھے۔

رضا شاہ پہلوی

۱۹۱۴ء کی جنگ میں ایران نے غیر جانب داری کا اعلان کیا، مگر کمزوروں کی آواز کا طاقت وروں پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ایران کی غیر جانب داری کی کسی بھی فریق نے پرواہ نہیں کی۔ قسمت کی ماری ایرانی حکومت کچھ بھی سمجھا کرے۔ غیر ملکی فوجیں اس کی سرزمین پر آپس میں لڑتی رہیں۔ ایران کے چاروں طرف جنگ میں شریک ہونے والے ملک تھے۔ ایک طرف انگلینڈ اور روس آپس میں دوست تھے۔ دوسری طرف ترکی، جس کی سلطنت میں اس وقت عراق اور عرب شامل تھے، جرمنی کا ساتھی تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی اور اس میں انگلینڈ، فرانس اور ان کے ساتھیوں کی فتح ہوئی۔ اس وقت سارے ایران پر برطانوی فوجوں کا قبضہ تھا۔ برطانیہ ایران کو اپنے تحفظ میں رکھنے کا اعلان کرنے کی بات سوچ رہا تھا، جو قبضہ جمانے کی ایک سہل اور آسان ترکیب تھی۔ یعنی اِس طرح وہ بحرِ روم سے لے کر بلوچستان اور ہندوستان تک وسط مشرق میں ایک عظیم الشّان اور وسیع سامراج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر یہ خواب حقیقت کا جامہ نہ پہن سکا۔ برطانیہ کی بدقسمتی سے روس میں زار شاہی کا خاتمہ ہو گیا اور اب اِس کی جگہ سوویت روس کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ برطانیہ کی یہ بھی بدقسمتی رہی کہ ترکی میں اِس کی چالیں بے کار ثابت ہوئیں اور کمال پاشا نے اپنے ملک کو اتّحادیوں کے چنگل سے بچا کر نکال لیا۔

ان سب واقعات سے ایرانی قوم پرستوں کو تقویت ملی اور ایران برائے نام ہی سہی اپنے آپ کو آزاد بنائے رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء میں ایک ایرانی سپاہی رضا خاں فوجی چالبازیوں کا سہارا لے کر سامنے آیا۔ اُس نے فوج پر قبضہ کر لیا اور پھر وزیر اعظم بن گیا۔ ۱۹۲۵ء میں شاہ کو گدی سے اُتار دیا گیا اور مجلس کی رائے سے رضا خاں نیا بادشاہ چُن لیا گیا۔ اُس نے رضا شاہ پہلوی کا خطاب اختیار کیا۔

رضا شاہ امن پسند آدمی تھا وہ ظاہری طور پر جمہوری طریقوں سے تخت پر پہنچا تھا۔ گزشتہ چند سال میں ایران بہت زیادہ بدل چکا ہے۔ قوم پرستی تیزی سے سر اٹھا رہی ہے، جس نے ملک میں نئی بیداری پیدا کر دی ہے۔ ایران میں جہاں کہیں غیر ملکی مفاد کا تعلق ہے۔ ان کے خلاف وہاں بیداری کی یہ نئی لہر شدید قوم پرستی کی شکل اختیار کر رہی ہے۔

یہ بڑی دل چسپ بات ہے کہ یہ قومی بیداری ایران کی دو ہزار سالہ قدیم روایات کے عین مطابق ہے۔ اِس کی نظریں شروع کے دنوں کی یعنی اسلام سے پہلے کی ایرانی شان و شوکت پر پلٹ رہی ہیں اور وہ اُسی سے گرمی پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ رضا شاہ نے اپنے خاندان کے لیے جو پہلوی نام اختیار کیا ہے وہ بھی اُس قدیم زمانے کی یاد دلاتا ہے۔ ویسے ایران کے لوگ شیعہ مسلمان ہیں مگر جہاں تک ان کے ملک کا سوال ہے، وہاں قومیت کا جذبہ اسلام سے زیادہ طاقت ور ہے۔ ایشیا بھر میں یہی ہو رہا ہے۔ یورپ میں ایسا ہی سو سال پہلے یعنی اُنیسویں صدی میں ہوا تھا۔ لیکن آج تو وہاں متعدد لوگوں نے، ایسا معلوم ہوتا ہے، قومیت کے اصولوں کو بھی چھوڑ دیا ہے اور ایسے نئے مذہبوں اور نئے عقیدوں کی تلاش میں ہیں جو موجودہ حالات سے مطابقت رکھتے ہوں۔

ایران کو پہلے فارس کہتے تھے۔ مگر اب اس کا سرکاری نام ایران رکھ دیا گیا ہے۔ رضا شاہ نے حکم جاری کر دیا کہ فارس نام کا استعمال ترک کر دیا جائے۔

میزنی اور گیری بالڈی

اٹلی کی قومیت کا پیغام بر جوسیف میزنی تھا۔ ۱۸۳۱ء میں اس نے "نوجوان اٹلی" نام کی ایک انجمن کی تنظیم کی، جس کا مقصد اٹلی میں جمہوریہ کا قیام کرنا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لیے برسوں مسلسل جدوجہد کی۔ اُسے نظر بند بھی رہنا پڑا اور اکثر اپنی جان جوکھم میں ڈالنی پڑی۔ اُس کی مختلف قومی تصنیفات ادبی شاہ کاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ۱۸۴۸ء میں جب شمالی اٹلی میں جگہ جگہ بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ میزنی کو موقع مل گیا اور وہ روم چلا آیا۔ پوپ کو نکال باہر کیا گیا اور تین آدمیوں کی ایک کمیٹی کے ماتحت جمہوریہ کا اعلان کردیا گیا۔ اِن تینوں میں ایک میزنی تھا، اس نوزائیدہ جمہوریہ پر چاروں طرف سے حملے ہونے لگے ـــــ آسٹریا، نیپاس یہاں تک کہ فرانس والے بھی پوپ کو دوبارہ گدّی پر بٹھانے کے لیے سامنے آئے۔ رومن جمہوریہ کی طرف سے لڑنے والوں کا سردار گیری بالڈی تھا۔ اس نے آسٹریا والوں کو روکے رکھا، نیپلس والوں کو ہرادیا اور فرانس والوں کو بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ یہ سب رضا کاروں کی مدد سے کیا گیا تھا اور جمہوریہ کے تحفظ کے لیے روم کے بہادر نوجوانوں نے اپنی جانیں نچھاور کردیں۔ مگر اس بہادرانہ مقابلے کے بعد بھی رومی جمہوریہ کو فرانسیسیوں کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی۔ ان لوگوں نے پوپ کو دوبارہ لا بٹھایا۔

اس طرح لڑائی کی شکل میں اس پہلی جد و جہد کا خاتمہ ہوا۔ لیکن میزنی اور گیری بالڈی چپ نہیں بیٹھے رہے۔ انھوں نے دوسری بڑی کوشش کے لیے تیاری اور پروپیگنڈے کے مختلف کاموں کو جاری رکھا، دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک مفکر اور اصول پرست تھا اور دوسرا سپاہی، جس میں چھاپہ ماری کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ دونوں میں اٹلی کی آزادی اور اتحاد کی زبردست لگن تھی۔ اِس وقت اِس بڑے کھیل کے میدان میں ایک تیسرا کھلاڑی بھی آدھمکا۔ یہ پیڈمانٹ کے راجا وکٹر ایمینوئل کا وزیر اعظم کابور تھا۔ اس کا خاص مقصد وکٹر ایمینوئل کو اٹلی کا بادشاہ بنانا تھا، چوں کہ اس کے لیے چھوٹے چھوٹے راجاؤں اور نوابوں کو دبانے اور راستے سے ہٹانے کی ضرورت تھی۔ اس لیے کابور میزنی اور گیری بالڈی کے کاموں سے فائدہ اٹھانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ اس نے فرانس والوں سے سازش کی اور انھیں اپنے دشمن آسٹریا والوں کے ساتھ جنگ میں پھنسا دیا۔ اس وقت نپولین سوم فرانس کا حکمراں تھا۔ یہ ۱۸۵۹ء کی بات ہے۔ فرانس والوں کے ہاتھوں آسٹریا والوں کی شکست سے گیری بالڈی نے فائدہ اٹھایا اور نیپلس اور سسلی کے بادشاہ پر بغیر کسی کی صلاح اور مشورے کے اپنی رہنمائی میں حملہ کر دیا۔ گیری بالڈی اور اس کے ایک ہزار سرخ پوشوں کا یہ مشہور فوجی دھاوا تھا۔ سپہ گری کے فن سے ناواقف ان غیر تربیت یافتہ لوگوں نے، جن کے پاس اچھے قسم کے فوجی اسلحہ بھی نہیں تھے اپنے مقابلے کے تربیت یافتہ فوجیوں کے چھکے چھڑا دیے۔ دشمنوں کی فوجیں سرخ پوشوں سے کہیں زیادہ تھیں مگر اپنی حوصلہ مندی سے وہ برابر میدان سر کرتے چلے گئے۔ گیری بالڈی کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ اِس کے نام میں ایسا جادو تھا کہ اِس کے قریب آتے ہی فوجیں منتشر ہو جاتی تھیں۔ پھر بھی گیری بالڈی کا کام مشکل تھا۔ کتنی ہی بار اُسے اور اس کے رضا کاروں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ لیکن اس بُرے وقت میں قسمت اس کا ساتھ دیتی تھی اور وہ اپنی شکست کو فتح میں بدل ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ جان جوکھوں میں ڈال کر بے جگری

سے کام کرنے والوں پر قسمت اسی طرح مہربان ہو جاتی ہے۔

گیری بالڈی اور اس کے ہزار ساتھی سسلی کے کنارے پر اُترے۔ وہاں سے لڑتے لڑتے رفتہ رفتہ اٹلی تک جا پہنچے۔ جنوب کے گاؤں میں سے ہو کر گزرتے ہوئے وہ رضاکاروں کی مانگ کرتا جاتا تھا اور عجیب عجیب انعام دینے کا اعلان کرتا جاتا تھا۔ وہ کہتا ــــ "چلے آؤ! چلے آؤ! جو گھر میں گھسا رہتا ہے وہ بزدل ہے۔ میں تمھیں تکان، تکلیفیں اور لڑائیاں دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ گر ہم یا تو جیتیں گے یا مر مٹیں گے۔" دنیا کامیابی کی قدر کرتی ہے۔ گیری بالڈی کی شروع کی کامیابیوں نے اٹلی کے لوگوں میں قومیت کے جذبے کو ایسا اُبھارا کہ ہر وقت رضاکاروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور وہ گیری بالڈی کے گُنوں کا گیت گاتے ہوئے شمال کی طرف بڑھنے لگے۔ اس گیت کا مفہوم یہ تھا:

ادھڑ گئی ہیں قبریں\
مُردے دُور دُور سے آتے اُٹھ کر\
لے تلواریں ہاتھوں میں\
اور آن کا پرچم ساتھ لیے\
جنگ کے لیے تیار ہو رہی ہیں روحیں شہیدوں کی\
بے جان انسانوں کے دِلوں کو\
مادرِ وطن اٹلی کی روح گرما رہی ہے\
آؤ اِن کا ساتھ دو\
ملک کے نوجوانو\
تم چلو انھیں کے پیچھے پیچھے\
آؤ لہرا دو پرچم اپنا\
اور جنگی نقاروں پر چوٹیں دو\
آجاؤ سب لے کر ٹھنڈی فولادی تلواریں

لیکن ہو آگ دِلوں میں بھری ہوئی
آجاؤ سب لے کر اٹلی کی امیدوں کی کرنیں
اٹلی سے باہر ہو
او غیر ملکی تو باہر نکل
ہمارے پیارے وطن اٹلی سے باہر

قومی ترانے، وہ خواہ کہیں کے ہوں، ان میں کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ کابور نے گیری بالڈی کی کامیابیوں سے فائدہ اٹھایا اور ان سب کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۶۱ء میں پیڈمانٹ کا وکٹر ایمینوئل اٹلی کا بادشاہ بن گیا۔ روم پر ابھی تک فرانسیسی فوجوں کا قبضہ تھا اور وینس پر آسٹریاوالوں کا۔ دس سال کے اندر وینس اور روم اٹلی میں مل گئے اور روم دارالخلافہ بن گیا۔ آخر اٹلی ایک متحدہ ملک ہو گیا لیکن میزنی کو اس سے خوشی نہیں ہوئی۔ اس نے ساری زندگی جمہوریت کے لیے جان کھپائی تھی۔ اور اب اٹلی صرف پیڈمانٹ کے وکٹر ایمینوئل کی سلطنت بن کر رہ گیا۔ یہ صحیح ہے کہ نئی حکومت دستوری حکومت تھی اور وکٹر ایمینوئل کے بادشاہ بننے کے فوراً بعد ہی ٹورن میں پارلیمنٹ کا اجلاس بھی ہوا۔

اس طرح اٹلی کی قوم نے دوبارہ غیر ملکی حکومت سے نجات پالی۔ یہ تین آدمیوں میزنی، گیری بالڈی اور کابور —— کی کرامات تھی۔ ان تینوں میں سے اگر ایک بھی اس میں شامل نہیں ہوتا تو شاید اس آزادی کو آنے میں ابھی بہت دیر لگتی۔

اٹلی کی آزادی کی لڑائی کے دنوں میں انگریز عوام کی ہمدردیاں گیری بالڈی اور اس کے سُرخ پوشوں کے ساتھ تھیں اور کتنے ہی انگریز شاعروں نے اس لڑائی پر جوشیلی نظمیں کہی تھیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جہاں انگریزوں کے مفاد کی ٹکر نہیں ہوتی وہاں اکثر ان کی ہمدردیاں آزادی کے لیے لڑنے والی قوموں کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ یونان آزادی کے لیے لڑتا ہے تو وہ اپنے شاعر بائرن اور دوسرے لوگوں کو بھیج دیتے ہیں۔ اُس وقت اٹلی کے بارے میں سوِن برن؛ میری ڈیتھ اور الزبیتھ بیرٹ براؤننگ نے بہت خوب صورت نظمیں کہی تھیں۔ میری ڈیتھ نے تو اس موضوع پر ناول بھی لکھے تھے۔

بسمارک

اُنیسویں صدی کے وسط کے آس پاس پرشا میں ایک آدمی اُٹھا جو آگے چل کر نہ صرف جرمنی پر بلکہ سارے یورپ کی سیاست پر حاوی ہوگیا۔ یہ آدمی پرشا کا ایک زمیندار تھا اور اس کا نام آٹو وان بسمارک تھا۔ وہ واٹرلو کی جنگ کے سال (۱۸۱۵ء) میں پیدا ہوا تھا اور اس نے مختلف درباروں میں کئی سال سیاسی سفیر کے فرائض انجام دیے تھے۔ ۱۸۶۲ء میں وہ پرشا کا وزیر اعظم بنا اور اس کے فوراً ہی بعد اس نے اپنا سکہ جمانا شروع کردیا۔ وزیر اعظم بننے کے ایک ہفتے کے اندر اس نے اپنی ایک تقریر کے دوران کہا تھا "اس زمانے کے بڑے مسائل تقریروں اور اکثریت کی تجویزوں سے نہیں بلکہ فولاد اور خون سے حل ہوں گے۔"

فولاد اور خون! شہرت حاصل کرنے والے یہ دو لفظ سچ مچ اُس کی اُس حکمتِ عملی کی بُنیاد تھے، جسے اُس نے دوراندیشی اور سختی کے ساتھ نبھایا۔ اُسے جمہوریت سے نفرت تھی اور وہ پارلیمنٹوں اور عوامی آئین ساز انجمنوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اُن کی حیثیت اُس کے نزدیک آثارِ قدیمہ کی سی تھی۔ مگر اُس کے جوہر اور اس کی صلاحیتیں ایسی تھیں کہ اُس کے زمانے کو اپنی مرضی کے سامنے جُھکا لیا۔ اُس نے جدید جرمنی کی تعمیر کی اور اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپ کی تاریخ کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ فلسفیوں اور سائنس دانوں کا جرمنی تو پیچھے رہ گیا اور خون اور فولاد والا

اور فوجی مہارت والا جدید جرمنی، یورپ کے برِ اعظم پر چھانے لگا۔ اس وقت ایک مشہور جرمن نے کہا تھا۔ بسمارک جرمنی کو اونچا اٹھا رہا ہے مگر جرمنوں کو نیچے دھکیل رہا ہے۔ جرمنی کو یورپ اور بین الاقوامی معاملات میں بڑی طاقت بنانے کی اس کی پالیسی سے جرمن لوگ بہت خوش ہوتے تھے اور بڑھتی ہوئی قوم پرستی کی چکاچوند میں وہ بسمارک کے ہر طرح کے تشدد کو برداشت کرنے کے لیے خوشی سے تیار تھے۔

جب بسمارک کے ہاتھ میں عنانِ حکومت آئی اُس وقت اس کے ذہن میں یہ واضح تصور تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس کے سامنے اپنا ایک سوچا سمجھا منصوبہ بھی تھا۔ وہ مستعدی کے ساتھ اس منصوبے پر کاربند رہا اور اس میں اُسے بے مثال کامیابی ملی۔ وہ جرمنی کا اور جرمنی کے توسط سے پرشا کا سارے یورپ میں اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت نپولین سوئم کے ماتحت فرانس یورپ کا سب سے مضبوط اور طاقت ور ملک سمجھا جاتا تھا۔ آسٹریا بھی اس کا ہم پلّہ مانا جاتا تھا۔ پرانے ڈھنگ کی بین الاقوامی سیاسیات اور حکمتِ علی کے ایک باب کی حیثیت سے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بسمارک دوسری طاقتوں کو کس طرح کھیل کھلاتا تھا اور ایک ایک کرکے سب سے باری باری نبٹتا تھا۔ سب سے پہلی چیز، جس کا اُس نے عزم کیا تھا، وہ یہ تھی کہ جرمنوں کی لیڈرشپ کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کر دیا جائے۔ پرشا اور آسٹریا کی پرانی لاگ ڈانٹ ہمیشہ جاری نہیں رہنے دی جا سکتی تھی۔ اس سوال کا کوئی قطعی فیصلہ پرشا کے حق میں ہونا چاہیے تھا اور آسٹریا کو محسوس کر لینا چاہیے تھا کہ اس کی حیثیت دوسرے درجے کی رہے گی۔ آسٹریا کے بعد فرانس کی باری تھی (جب میں پرشا، آسٹریا اور فرانس کی بات کرتا ہوں تو میری مراد وہاں کی حکومتوں سے ہے۔ یہ حکومتیں کم و بیش مطلق العنان حکومتیں تھیں اور وہاں کی پارلیمنٹوں کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں تھا)

پس بسمارک نے اپنی فوجی مشنری کو خاموشی سے مستحکم کر لیا۔ اسی درمیان تیسرے نپولین نے آسٹریا پر حملہ کرکے اُسے شکست دے دی۔ اس شکست کے نتیجے کے

طور پر گیری بالڈی نے جنوبی اٹلی میں فوجی کارروائی کی اور اٹلی ہمیشہ کے لیے آزاد ہوگیا۔
یہ سب باتیں بسمارک کے حق میں تھیں، کیوں کہ ان سے آسٹریا کمزور پڑ گیا تھا۔ جب روسی پولینڈ میں قومی بغاوت ہوئی تو بسمارک نے زار کو یہ تجویز بھیجی کہ ضرورت ہو تو پولینڈ کو گولی کا نشانہ بنانے میں اس کی مدد کو وہ آ جائے۔ یہ ایک شرمناک تجویز تھی، اس سے مستقبل میں یورپ کی کسی الجھن میں زار کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا اس کا مقصد پورا ہوگیا۔ آسٹریا سے مل کر اس نے ڈنمارک کو شکست دی اور پھر جلدی ہی اس نے آسٹریا کی طرف رخ کیا۔ اس کے لیے اس نے چالاکی سے فرانس اور اٹلی کی حمایت حاصل کر لی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں کچھ ہی دنوں کے اندر پرشا نے آسٹریا کو دبا دیا۔ جرمن لیڈر شپ کا سوال طے کر لینے کے بعد اس نے یہ ظاہر کر دیا کہ پرشا ہی اس کا لیڈر ہے اور پھر اس نے بڑی عقل مندی سے آسٹریا کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا تاکہ کوئی رنجش باقی نہ رہے۔ اب پرشا کی قیادت میں شمالی جرمنی کا وفاق بنانے کا راستہ صاف ہوگیا (آسٹریا اس میں شامل نہیں تھا) بسمارک اس وفاق کا چانسلر بنا۔ آج کل جہاں ہمارے کچھ سیاسیات اور قانون کے عالم مہینوں اور سالوں تک وفاق اور اس کے دستور کے بارے میں مباحثے کرتے رہتے ہیں وہاں یہ دلچسپ اور قابل غور بات ہے کہ بسمارک نے شمالی جرمنی وفاق کا نیا دستور پانچ گھنٹے میں تحریر کر دیا تھا۔ یہی دستور چند معمولی ترمیموں کے ساتھ پچاس سال تک جرمنی کا دستور بنا رہا۔ یعنی جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء تک جب کہ وہاں جمہوریہ کا قیام ہوا۔

بسمارک نے اپنا بڑا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ دوسرا قدم فرانس کو نیچا دکھا کر سارے یورپ میں اپنی دھاک جمانا تھا۔ اس کی تیاری اس نے خاموشی سے کی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جرمنی کو متحد کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ وہ ایسا رویہ اختیار کیے رہا کہ یورپ کی دوسری طاقتیں اس کی طرف سے مشتبہ نہ ہونے پائیں۔ شکست خوردہ آسٹریا کے ساتھ بھی ایسا نرم سلوک کیا گیا کہ اس کی نفرت قریب قریب دور ہوگئی۔ انگلینڈ اور فرانس کی رقابت تاریخ میں مشہور تھی۔ انگلینڈ تیسرے نپولین کے ہوس ناک منصوبوں کو

شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس لیے فرانس کے خلاف کسی بھی طرح کی لڑائی میں انگلینڈ کی ہمدردیاں حاصل کرنا بسمارک کے لیے مشکل نہیں تھا۔ جب وہ جنگ کے لیے پوری طرح تیار ہوگیا تو اُس نے اپنا کھیل اتنی ہوشیاری سے کھیلا کر ۱۸۷۰ء میں نپولین سوم کو ہی پرشا کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا پڑا۔ یورپ کو ایسا محسوس ہوا کہ پرشا کی بے قصور حکومت حملہ آور فرانس کے تشدّد کا شکار ہوئی ہے۔ پیرس کے لوگ "برلن چلو! برلن چلو!" چلّانے لگے اور نپولین سوم نے اپنے دل میں بہت اطمینان سے سمجھ لیا کہ وہ اپنی فاتح فوج کے ساتھ جلدی ہی برلن پہنچ جائے گا۔ مگر ہونا کچھ اور تھا۔ بسمارک کی منظم فوج نے فرانس کی شمال مشرقی سرحد پر حملہ کیا اور فرانس کی فوجوں کے چھکے چھڑا دیے۔ چند ہی ہفتے میں سیڈان کے مقام پر خود شہنشاہ نپولین سوم اور اس کی فوج جرمنوں کے ہاتھوں قید ہوگئی۔

اس طرح دوسرا فرانسیسی سامراج ختم ہوا اور فوراً ہی پیرس میں جمہوری نظام قائم ہوگیا۔ نپولین سوم کے زوال کے بہت سے اسباب تھے۔ خاص وجہ یہ تھی کہ اپنی تشدّد آمیز پالیسی کی وجہ سے وہ عوام میں اپنی مقبولیت بالکل کھو چکا تھا۔ غیر ملکیوں سے جنگ کر کے اس نے عوام کا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔ مصیبت میں پھنسے ہوئے شہنشاہوں اور حکومتوں کا یہ بہت منہ لگا طریقہ ہے مگر نپولین سوم اس میں زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ ہاں، جنگ نے اس کی بوالہوسی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضرور ختم کر دیا۔

پیرس میں قومی تحفّظ کی حکومت بنی۔ اُس نے پرشا کے سامنے امن کی تجویز رکھی، لیکن بسمارک کی شرطیں اتنی شرم ناک تھیں کہ تقریباً ساری فوجوں کے تباہ و برباد ہو جانے پر بھی انھیں لڑائی جاری رکھنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ جرمن فوجیں بہت دنوں تک ورسائی میں اور پیرس کے چاروں طرف محاصرہ کیے پڑی رہیں۔ آخر کار پیرس نے ہتھیار ڈال دیے اور نئی جمہوریہ نے شکست تسلیم کر کے بسمارک کی سخت شرائط منظور کر لیں۔ جنگ کے ہرجانے کی بھاری رقم دینا منظور کیا گیا اور جس بات سے فرانس کو سب سے

زیادہ چوٹ پہنچی، وہ یہ تھی کہ آلسیس اور لورین کے صوبے دو سو سال سے زیادہ فرانس کے قبضے میں رہنے کے بعد جرمنی کے حوالے کر دینے پڑے۔

مگر پیرس کا محاصرہ اُٹھنے سے پہلے ہی ورسائی میں ایک نئے سامراج کی داغ بیل پڑ گئی۔ ۱۸۷۰ء کے ستمبر میں تو نپولین سوم کے فرانسیسی سامراج کا خاتمہ ہوا اور ۱۸۷۱ء کی جنوری میں ورسائی کے سولھویں لوئی کے شاہی محل کے عظیم الشان دیوان خانے میں متحدہ جرمنی کا اعلان ہوا۔ اور پرشا کا بادشاہ قیصر کے نام سے شہنشاہ بنا۔ جرمنی کے سب راجاؤں اور نمایندوں نے وہاں جمع ہو کر اپنے نئے شہنشاہ کو تعظیم دی۔ اب پرشا کے ہاہن جالرن کا شاہی خاندان حکمراں ہو گیا اور متحدہ جرمنی دنیا کی ایک بڑی طاقت بن گیا۔

اِدھر ورسائی میں جشن اور خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور اُدھر پاس ہی پیرس پر رنج وغم اور مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ یکے بعد دیگرے کئی کئی مصیبتوں کے آنے سے لوگ ہکا بکا رہ گئے تھے۔ کوئی معقول انتظام نہ ہونے سے بدنظمی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ قومی مجلس میں شاہ پسندوں کی بہت بڑی تعداد منتخب ہو کر آ گئی تھی اور یہ لوگ بادشاہت کو دوبارہ قائم کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی راہ کا کانٹا صاف کرنے کے لیے قومی رضا کاروں کے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی، کیوں کہ یہ جماعت جمہوریت پسندوں کی سمجھی جاتی تھی۔ شہر کے سب جمہوریت پسند اور انقلابی عناصر کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا مطلب ملک میں دوبارہ مطلق العنانی اور تشدد پسندی کو جگہ دینا ہے۔ اس لیے ۱۸۷۱ء کے مارچ میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی اور پیرس کے ’کیمون‘ یعنی پنچایتی راج کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایک طرح کی میونسپلٹی تھی اور اسے فرانس کے انقلاب سے تحریک ملی تھی۔ مگر اس میں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا۔ ذرا غیر واضح شکل میں ہی سہی، اس میں اُن اشتراکی خیالوں کی جھلک موجود تھی جو اُس وقت اُبھر رہے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کیمون روس کی سوویتوں کی ابتدائی شکل تھی۔

مگر ۱۸۷۱ء کا یہ پیرس کمیون بس تھوڑے ہی دنوں ٹکا۔ شاہ پسندوں اور اونچے متوسط طبقے کے لوگوں نے عوام کی اس بغاوت سے ڈر کر پیرس کے اُس حصّے پر گھیرا ڈال دیا جو کمیون کے قبضے میں تھا۔ پاس ہی درسائی اور دوسرے مقامات پر جرمن فوجیں چُپ چاپ سب دیکھتی رہیں۔ جو فرانسیسی سپاہی جرمنوں کی قید سے چھوٹ کر پیرس لوٹے وہ اپنے پُرانے افسروں کے ساتھ ہو گئے اور کمیون کے خلاف لڑنے لگے۔ انھوں نے کمیون حامیوں پر حملے کیے اور آخر کار مئی ۱۸۷۱ء میں ایک دن انھیں شکست دے کر پیرس کی سڑکوں پر تیس ہزار مردوں اور عورتوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ بعد میں کمیون کے حامیوں میں سے پکڑے ہوئے لوگوں کو بھی بے رحمی کے ساتھ گولیوں کا نشانہ بنادیا گیا۔ اس طرح پیرس کے کمیون کا خاتمہ ہوا۔ اس واقعے سے یورپ میں بڑی سنسنی پھیلی۔ اس سنسنی کے پھیلنے کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ کمیون (پنچایت) کا بہت بے رحمی کے ساتھ خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ بلکہ یہ بھی تھا کہ یہ اُس وقت کے رائج طریقوں کے خلاف پہلا اشتراکی انقلاب تھا۔ غریبوں نے دولت مندوں کے خلاف پہلے بھی کتنی ہی بار ہتھیار اُٹھائے تھے۔ لیکن جس نظام کی وجہ سے وہ غریب تھے، اُسے بدلنے کا اُنھوں نے خیال نہیں کیا تھا۔ یہ کمیون جمہوری اور اقتصادی دونوں طرح کا انقلاب تھا اور اس وجہ سے یورپ میں اشتراکی تصوّر کے فروغ میں یہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرانس میں کمیون کے تشدد آمیز خاتمے نے اشتراکی خیالوں کو ایک دھچکا لگایا اور پھر اُنھیں دوبارہ اُبھرنے میں بہت دیر لگی۔

حالاں کہ کمیون کو دبا دیا گیا۔ مگر فرانس شہنشاہیت کے اور زیادہ تجربوں سے بچ گیا۔ کچھ مدّت کے اندر وہ یقینی طور پر جمہوری نظام کی طرف مائل ہو گیا اور ۱۸۷۵ء کی جنوری میں وہاں ایک نئے دستور کے ماتحت تیسری جمہوریہ کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ فرانس کی جمہوریت اعلیٰ متوسط طبقے کی جمہوریت ہے۔ اُس کی باگ ڈور متمول متوسط طبقے کے ہاتھ میں ہے۔

۱۸۷۰-۷۱ء کی جرمن لڑائی کی مار کے بعد فرانس پھر پنپ اُٹھا اور اُس نے

ہرجانے کی بھاری رقم بھی ادا کردی، لیکن فرانس کے عوام کو جس طرح ذلیل کیا گیا تھا اُس سے لوگوں کے دلوں میں غم وغصہ تھا۔ وہ غیرت مند لوگ ہیں اور باتوں کو بہت دن تک یاد رکھتے ہیں۔ اس لیے انتقام کا جذبہ انھیں ستانے لگا۔ آلسیس اور لورین کے ہاتھ سے چلے جانے کا انھیں خاص طور سے ملال تھا۔ بسمارک نے آسٹریا کو شکست دے کر اُس کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرکے عقل مندی دکھائی تھی، لیکن فرانس کے ساتھ اس کا سخت برتاؤ کوئی عقل مندی کی بات نہیں تھی۔ ایک غیرت مند دشمن کو نیچا دکھا کر اس نے ان سے ہمیشہ کے لیے عداوت مول لے لی۔ سیڈان کی لڑائی کے بعد ہی جب کہ لڑائی کا خاتمہ بھی نہیں ہوا تھا، کارل مارکس نے ایک پیشین گوئی کی کہ آلسیس پر قبضہ کرنے کے نتیجے میں دونوں ملکوں کے درمیان جانی دشمنی پیدا ہوگی اور مستقل امن وامان کے بجائے چند روزہ معاہدہ رہے گا۔ دوسرے کئی معاملوں کی طرح اس معاملے میں بھی مارکس کی پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی۔

جرمنی میں اب شاہی دیوان، بسمارک ہی سب کچھ تھا۔ سردست "فولاد اور خون" کی حکمتِ عملی کامیاب ہوگئی تھی۔ جرمنی نے اِس حکمتِ عملی کو تسلیم کرلیا تھا اور اعلیٰ اور فیاضانہ خیالوں کی قدر وقیمت گھٹ گئی تھی۔ بسمارک کی یہ کوشش تھی کہ اقتدار بادشاہ کے ہاتھ میں رہے، کیوں کہ اس کا جمہوریت میں یقین نہیں تھا۔ جیسے جیسے جرمنی کی صنعتی ترقی ہوتی جاتی تھی اور مزدور طبقہ زور پکڑتا جاتا تھا، ویسے ویسے یہ طبقہ کچھ بنیادی تبدیلیوں کی مانگیں پیش کرتا اور نئے مسائل پیدا کرتا جارہا تھا۔ بسمارک نے اس کی دو تدبیریں کیں، ایک طرف وہ مزدوروں کی حالت سدھارتا گیا اور دوسری طرف سوشلزم کو کچلتا رہا۔ اُس نے سماجی ترقی کے قانون کے ذریعے مزدوروں کے سامنے چارہ ڈال کر انھیں اپنی طرف ملانے یا کم سے کم اپنے مطالبات میں بہت شدت دکھانے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اسی طرح جرمنی نے مزدوروں کے لیے بڑھاپے کی پنشنیں، بیمے اور علاج معالجے اور ان کی حالت سدھارنے کے قانون بنا کر اس سمت سب سے پہلے قدم اُٹھایا، جب کہ انگلینڈ کی صنعتیں اور مزدور تحریکیں جرمنی سے

پُرانی ہونے کے باوجود اس سلسلے میں زیادہ کچھ نہیں کر پائی تھیں۔ اس حکمتِ عملی کو کچھ کامیابی تو ملی، لیکن پھر بھی مزدوروں کی تنظیم زور پکڑتی گئی۔

مزدوروں کے سنگٹھن بڑھنے لگے اور ۱۸۷۵ء میں سب نے مل کر سوشلسٹ جمہوری جماعت بنائی۔ بسمارک سوشلزم کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو برداشت نہیں کر سکا۔ کسی نے شہنشاہ کو قتل کرنے کی کوشش کی اور بسمارک کو سوشلسٹوں پر ظلم ڈھانے کا اچھا بہانہ مل گیا۔ ۱۸۷۸ء میں ہر طرح کی اشتراکی سرگرمیوں کو دبانے کے لیے سوشلسٹ دشمن قانون بنائے گئے۔ جہاں تک سوشلسٹوں کا تعلق تھا ان کے لیے ایک طرح کا فوجی قانون جاری ہو گیا اور ہزاروں کو ملک بدر یا قید و بند کی سزائیں دی گئیں۔ ملک بدر کیے ہوئے بہت سے لوگ امریکا چلے گئے اور وہاں جا کر سوشلزم کے پہلے مبلّغ بنے۔ جمہوری سوشلسٹ پارٹی کو سخت صدمہ تو پہنچا مگر وہ ختم نہیں ہوئی اور آگے چل کر وہ پھر زور پکڑ گئی۔ بسمارک کی ظلم و تشدد کی پالیسی اُسے مار نہ سکی۔ اُلٹے اس پالیسی کی کامیابی خود اسی کے حق میں مضر ثابت ہوئی۔ جیسے جیسے اس جماعت کی طاقت بڑھتی گئی اس کی تنظیم بہت وسیع ہوتی گئی۔

بسمارک کی ماہرانہ حکمتِ عملی نے آخیر دم تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اپنے زمانے کی بین الاقوامی سیاست سے وہ من چاہا کھیل کھیلتا رہا۔ یہ سیاست اُس وقت بھی اور آج بھی سازشوں اور مکر و فریب کا ایک عجیب و غریب جال ہے۔ اس میں تمام باتیں چھُپ کر اور پسِ پردہ کی جاتی ہیں۔ اگر یہ باتیں کھُلے عام ہوں تو زیادہ دن نہیں ٹک سکتیں۔ بسمارک نے آسٹریا اور اٹلی کو ملا کر "سہ طاقتی گٹھ جوڑ" کے نام سے ایک گٹ بنایا؛ کیوں کہ اب اُسے فرانس والوں کی طرف سے انتقام لینے کا اندیشہ ہونے لگا تھا۔ اس طرح دونوں فریق اسلحہ جمع کرنے، سازشیں کرنے اور ایک دوسرے کو آنکھیں دکھانے میں لگے رہے۔

۱۸۸۸ء میں شہنشاہ ولیم دوئم کے نام سے ایک نوجوان جرمنی کا قیصر ہوا۔ اُس کے دماغ میں یہ خیال بہت شدّت سے بیٹھ گیا تھا کہ وہ بہت زبردست آدمی ہے۔

وہ اسی زعم میں بہت جلدی بسمارک سے لڑ پڑا۔ اس مردِ آہن دیوان، کو اُس کے بڑھاپے میں عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ اس پر اُسے بہت غصہ آیا۔ آنسو پونچھنے کے لیے اُسے پرنس کا خطاب دے دیا گیا۔ مگر بادشاہوں کی طرف سے اسے جو خوش فہمیاں تھیں اب وہ دور ہو چکی تھیں۔ شرم و غیرت کے مارے وہ اپنی جاگیر میں تنہا رہنے لگا۔ ایک دوست سے اس نے کہا تھا "میں نے جب عہدہ سنبھالا تھا اُس وقت میرا دل حکومت سے وفاداری اور شہنشاہ سے عقیدت مندی کے جذبے سے سرشار تھا لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ خزانہ اب دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے تین شہنشاہوں کا ننگا ناچ دیکھ لیا ہے اور یہ منظر مجھے کچھ دل کش نہیں معلوم ہوا!"

یہ بدمزاج بوڑھا کچھ دن اور جیتا رہا اور ۱۸۹۸ء میں ۸۳ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ قیصر کے ہاتھوں برخاست ہونے کے بعد بلکہ موت کے بعد بھی اُس کا سایہ جرمنی پر قائم رہا اور اس کی روح اُس کے وارثوں اور جانشینوں کو گرماتی رہی۔ مگر اُس کے بعد آنے والے لوگ اُس کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے۔

چند مشہور مصنّف

ادب اور فنون کے ذریعے کسی قوم کی اصل روح کی جتنی گہری واقفیت حاصل ہوتی ہے، اتنی عوام کی خارجی سرگرمیوں سے نہیں ہوتی۔ ادب اور فنون ہمیں پاکیزہ اور گہری فکر کی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ جس پر وقتی ہنگاموں، بوالہوسیوں اور وقتی رنج و خوشی کا اثر نہیں پڑتا۔ مگر آج شاعر اور فن کار کو مستقبل کا پیغام بر بہت کم سمجھا جاتا ہے اور انھیں کوئی اعزاز نہیں دیا جاتا۔ اگر انھیں کچھ اعزاز ملتا بھی ہے تو عام طور سے ان کے مرنے کے بعد۔

میں یہاں بس چند نام گنواؤں گا اور وہ بھی اُنیسویں صدی کے ابتدائی زمانے سے متعلق۔ یاد رہے کہ یورپ کے کئی ملکوں کا ادبی خزانہ اُنیسویں صدی کے شاہ کاروں سے بھرا پڑا ہے۔

گوئیٹے تو اصل میں اٹھارویں صدی کا تھا، کیوں کہ اس کی پیدائش ۱۷۴۹ء میں ہوئی تھی، مگر اس نے ۸۳ سال کی لمبی عمر پائی اور اس طرح اس نے اگلی صدی کے ایک تہائی حصّے کو بھی دیکھا تھا۔ گوئیٹے نے اپنی زندگی کا ایک حصّہ یورپ کی تاریخ کے ایک سب سے زیادہ ہنگامی زمانے میں گزارا تھا۔ اُس نے اپنے ملک کو نپولین کی فوجوں کے ہاتھوں بے عزّت ہوتے دیکھا تھا۔ خود اسے اپنی زندگی میں بھی بہت سی تکلیفیں اُٹھانی پڑی تھیں لیکن اُس نے رفتہ رفتہ زندگی کی مشکلات پر قابو حاصل کرلیا تھا۔

نپولین اُس سے پہلی بار اُس وقت ملا، جب اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ جب وہ دروازے میں کھڑا تھا تو اس کے چہرے پر اطمینان کی کچھ ایسی جھلک اور اُس کے خدوخال میں کچھ ایسی کشش تھی کہ نپولین کے منہ سے بے اختیار نکل پڑا "آدمی تو یہ ہے!" اُس نے کئی چیزوں میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ کیا کامیابی اور چابک دستی سے کیا۔ وہ فلسفی، شاعر، ڈراما نگار اور مختلف سائنسی علوم میں دل چسپی رکھنے والا شخص تھا۔ اِن سب کے علاوہ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک چھوٹے سے جرمن راجا کے دربار میں وزیر تھا۔ ہم تو اُسے سب سے زیادہ ایک ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس کی سب سے مشہور کتاب "فاؤسٹ" ہے۔ گوئٹے کی زندگی ہی میں اس کی شہرت دُور دُور پھیل گئی تھی اور ادب کے میدان میں تو اُس کے ہم وطن اُس سے دیوتا کی سی عقیدت رکھنے لگے تھے۔

گوئٹے کا ہم عصر شِلر نام کا ایک اور شخص تھا، جو عمر میں اُس سے چھوٹا تھا۔ یہ بھی ایک چوٹی کا شاعر تھا۔ اُس سے بھی کم عمر کا ہینرخ ہین تھا۔ وہ جرمن زبان کا دوسرا عظیم اور جادو بیان شاعر گزرا ہے۔ اس نے بہت ہی خوب صورت نظمیں لکھی ہیں۔ گوئٹے، شِلر اور ہین۔ یہ تینوں قدیم یونان کی اعلیٰ تہذیب کے رنگ میں شرابور تھے۔

جرمنی ایک مدت سے فلسفیوں کے ملک کے نام سے مشہور رہا ہے۔ اٹھارویں صدی کا عظیم جرمن فلسفی ایمانول کانٹ تھا۔ وہ صدی کے بدلنے تک بقیدِ حیات رہا۔ اس وقت اس کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔ فلسفے کے میدان میں دوسرا خاص نام ہیگل کا ہے۔ وہ کانٹ کے بعد ہوا ہے اور ایسا مانا جاتا ہے کہ کمیونزم کے فلسفے کے بانی کارل مارکس پر اُس کے خیالوں کا بہت اثر پڑا تھا۔ یہ تو فلسفیوں کی بات ہوئی۔

اُنیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بہت سے مشہور شاعر پیدا ہوئے، خاص طور سے انگلینڈ میں۔ روس کا سب سے مشہور قوم پرست شاعر پشکن اسی زمانے میں پیدا ہوا۔ ایک مقابلے میں وہ جوانی میں ہی مارا گیا۔ فرانس میں بھی کئی شاعر ہوئے

لیکن میں یہاں دو ہی کا ذکر کروں گا۔ ایک وکٹر ہیوگو تھا، جس کا جنم ۱۸۰۲ء میں ہوا تھا۔ اس نے بھی گوئٹے کی طرح ہی ۸۳ سال کی لمبی عمر پائی اور گوئٹے کی طرح اس کی بھی اپنے ملک میں ادب کے دیوتا کی طرح پرستش کی گئی۔ ادیب اور سیاست داں دونوں ہی حیثیت سے اس کی زندگی کافی تغیر پذیر رہی ہے۔ اوائل زندگی میں وہ بادشاہوں کا بہت پکا حمایتی تھا اور ایک طرح سے شہنشاہیت میں یقین رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بدلتا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۸ء میں وہ جمہوریت پسند بن گیا۔ جب لوئی نیپولین تھوڑی مدت کی دوسری جمہوریہ کا صدر رہا تو اس نے ہیوگو کو اس کے خیالات کی وجہ سے ملک بدر کر دیا۔ ۱۸۷۱ء میں وکٹر ہیوگو نے پیرس کے کیمون کی طرفداری کی۔ وہ قدامت پرست دائیں بازو سے رفتہ رفتہ مگر یقینی طور پر سوشلزم کے ترقی پسند بائیں بازو میں جا پہنچا۔ بیشتر دیکھا گیا ہے کہ لوگ ڈھلتی ہوئی عمر کے ساتھ قدامت پسند ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ہیوگو کے معاملے میں یہ بات اُلٹی ہوئی۔ مگر یہاں تو ایک ادیب کی حیثیت سے ہی ہمارا اس کا واسطہ ہے۔ وہ ایک چوٹی کا شاعر، ناول نگار اور ڈراما نگار تھا۔

دوسرا نام جس کا میں ذکر کروں گا آنرے دا بالزک کا ہے۔ یہ بھی وکٹر ہیوگو کا ہمعصر تھا، مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہ غضب کی قوت رکھنے والا ناول نگار تھا اور اپنی مختصر سی زندگی میں اس نے بہت سے ناول لکھ ڈالے۔ اس کی کہانیوں میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ایک ہی سے کردار اُن میں آتے ہیں۔ اپنے ناولوں میں اُس وقت کی فرانسیسی زندگی کی پوری عکاسی کرنا اُس کا مقصد تھا۔ اس نے اپنی تمام کتابوں کا نام "انسانیت کا مذاق" رکھا۔ یہ بہت بلند حوصلہ تصور تھا۔ اور اگرچہ اس کے لیے اُس نے سالہا سال محنت کی مگر جس زبردست کام کا اُس نے بیڑا اُٹھایا تھا، وہ پورا نہ کر سکا۔

اُنیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں انگلینڈ میں تین بصیرت مند شاعروں کے نام خاص طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ تینوں ہمعصر تھے اور تینوں ہی کم عمری میں

ایک ایک کر کے تین سال کے اندر مر گئے۔ یہ کیٹس، شیلی اور بائرن تھے کیٹس کو غربت اور مایوسیوں سے جدو جہد کرنی پڑی جب ۱۸۲۱ء میں ۲۶ سال کی عمر میں روم میں اس کی موت ہوئی، اس وقت لوگ اُسے نہیں جانتے تھے، حالاں کہ اُس نے کچھ نظمیں تو بہت ہی خوب صورت لکھی تھیں۔ کیٹس متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ دل چسپ بات تو یہ ہے کہ اگر روپے پیسے اور دولت کی کمی کی وجہ سے اس کے راستے میں رکاوٹیں آئیں تو سوچا جا سکتا ہے کہ غریبوں کے لیے شاعر اور ادیب بننا کس قدر مشکل تھا۔

شیلی بہت ہر دل عزیز شخصیت کا مالک تھا عنفوانِ شباب سے ہی اُس کے دل میں ایک آگ بھری ہوئی تھی وہ آزادی کا حامی تھا "شہریت کی ضرورت" کے موضوع پر ایک مضمون لکھنے کی وجہ سے اُسے آکسفورڈ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ شاعروں کے لیے، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، اُس نے، اور کیٹس نے بھی، اپنی مختصر زندگی تخیلات کی دنیا میں گم ہو کر ہی گزار دی اور دنیاوی مشکلات کی کچھ بھی پرواہ نہ کی۔ کیٹس کی موت کے سال بھر بعد وہ اٹلی کے ساحلی سمندر میں ڈوب کر مر گیا۔ اُس کی مختصر نظموں میں سے ایک نظم یہاں دی جا رہی ہے۔ یہ اُس کی بہترین تخلیقات میں سے تو ہرگز نہیں ہے لیکن یہ ہماری موجودہ تہذیب میں غریب مزدور کی بدقسمتی کو اُجاگر کرتی ہے۔ اس کا قریب قریب وہی حشر ہوتا تھا جو پرانے زمانے میں غلاموں کا ہوتا تھا۔ اِس نظم کو لکھے ہوئے سو سال سے زیادہ مدّت گزر چکی ہے، مگر آج کے حالات پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے اس کا عنوان "بدنظمیوں کا نقاب" ہے :-

آزادی کیا ہے ؟ یہ تو تم
خوب بتا سکتے ہو
ہے کیا چیز غلامی ؟
وہ تمھارے ہی ضمیر کی آواز ہے
یہی غلامی ہے

کہ کام تم کرتے رہو مزدوری سے لے کر،
بس اتنی کہ جس سے
تمہارا دم تمھارے جسم میں اٹکا رہے،
اور تم
ایک قیدی کی طرح
ظالموں کے ظلم کی خاطر
رات دن گھٹتے رہو
بن جاؤ تم
کرگھے، ہل، تلوار، پھاوڑے، ان کے
اور جان کھپا دو ان کی خاطر
مت دیکھو تم اپنی مرضی
بس لگے رہو ان کی خاطر
یہی غلامی ہے کہ تمھاری اولادیں
بھوک سے تڑپیں اور ان کی مائیں
سوکھ سوکھ کر کانٹا ہو جائیں
دیکھو میرے کہتے ہی کہتے
سردی کی چلیں ہوائیں ٹھنڈی
جن سے مرنے لگے غریب بے چارے
تم ترس رہے ہو ان روٹی کے ٹکڑوں کو
جن کو دھن وان پھینک رہا ہے
خوش ہو ہو کر
اپنے کتے کے آگے
موٹے کتے جو اس کی آنکھوں کے نیچے

شکم سیر ہو مست پڑے ہیں سوتے
ہے یہی غلامی کہ اس بندھن میں
بندھنا ہے تم کو
اور تمھارے ضمیر کی آواز کو بھی
جس سے رہے نہ تم کو قابو
اپنی مرضی پر اپنی خواہش پر
اور بنو تم ویسے ہی
جیسا کہ لوگ تمھیں بنانا چاہیں
اور اگر ان سب کو سہتے سہتے
بے بس ہو کر
چپکے چپکے رو رو کر
تم ان کی شکایت لاؤ زبان پر
تو ان کے نوکر بپھر کر
روند ڈالتے
گھوڑوں کی ٹاپوں سے
تم کو اور تمھاری بیویوں کو
اور تمھارے خون کی بوندیں
گھاس پر بکھا دیتے
جیسے شبنم کی بوندیں

بائرن نے بھی آزادی کے خوب صورت نغمے گائے ہیں۔ مگر یہ آزادی قوم پرستی کا نقاب اوڑھے ہوئے ہے شیلی کی نظم کی طرح اس میں اقتصادی حالات کی ترجمانی نہیں ہے۔ وہ شیلی کی موت کے دو سال بعد ترکی کے خلاف یونان کی آزادی کی لڑائی میں

مارا گیا۔ اسے نوجوانی میں ہی وہ شہرت نصیب ہوگئی جو کیٹس اور شیلی کو نصیب نہیں ہوئی۔
لندن کی سوسائٹی نے اُسے سر پر بٹھایا لیکن پھر نیچے بھی لا گرایا۔

اسی زمانے کے آس پاس دو اور مشہور شاعر ہوئے۔ یہ دونوں ان تینوں نوجوان دوستوں سے زیادہ عرصے زندہ رہے۔ ورڈس ورتھ نے (۱۷۷۰ء سے ۱۸۵۰ء) ۸۰ سال کی لمبی عمر پائی۔ اس کا شمار انگریزی کے چوٹی کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُسے قدرتی مناظر سے بہت لگاؤ تھا۔ اُس کی بیشتر نظمیں فطری حسن کی ترجمان ہیں۔ دوسرا شاعر کولرج تھا۔ اِس کی کچھ نظمیں بہت اچھی ہیں۔

اُنیسویں صدی کے شروع میں تین مشہور ناول نگار بھی ہوئے۔ والٹر اسکاٹ ان میں سب سے ممتاز تھا۔ اس کے ویورلی ناول بہت مشہور ہوئے ہیں۔ دوسرے دو ناول نگار تھیکرے اور ڈکنس تھے۔ مگر میرے خیال میں دونوں اسکاٹ سے کہیں اونچے درجے کے ہیں۔ تھیکرے کا جنم ۱۸۱۱ء میں کلکتہ میں ہوا تھا اور اس نے ابتدائی پانچ چھے سال یہیں گزارے تھے۔ اس کی چند کتابوں میں ہندوستانی نوابوں کا ذکر ملتا ہے۔ جو حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ وہ انگریز تھے جو بہت زیادہ دولت جمع کر کے خوب سُرخ اور تن و توش والے ہو جاتے تھے اور پھر رنگ رلیاں منانے کے لیے انگلینڈ لوٹ جاتے تھے۔ اُنیسویں صدی کے شروع کے ادیبوں کے بارے میں میں بس اتنا ہی لکھنا چاہتا ہوں۔ یہ تذکرہ بہت ہی تشنہ ہے۔ اس موضوع کا واقف کار اِس پر بہت دل چسپ اور دل کش انداز میں لکھ سکتا ہے۔

میں اِس مضمون کو گوئٹے کے فاؤسٹ سے ایک نظم نقل کر کے مکمل کر دوں گا۔
یہ جرمن زبان سے ترجمہ ہے۔

افسوس ہے افسوس ہے!
تو نے کیا ہے وار دُنیا پر،
گرایا ہے اُسے پستی پر،
کیا برباد ہے اس کو اور

اس کی بربادیوں سے کھیل کر
اُسے خلا میں پھینک دیا ہے
گویا کچل ڈالا اُسے
غیبی کسی طاقت نے۔
دُنیا کے اِن ٹھیکروں کو
ہم اُٹھائے جا رہے ہیں؛
گیت گاتے ہیں
لُٹی دل کشی کے
اور اُس حُسن کے
جس پر ڈاکہ ڈالا ہے کسی نے۔
او! اس دھرتی کے لال!
تعمیر کر اس کی دوبارہ،
اور پھر حسن اور دل کشی سے
اس کو سجا دے،
اور کر تعمیر اس کی اپنے دل میں
دے اُسے تو بلند اس کا مقام۔
پھر جگا تو زندگی کی روشنی کو،
لگا پھر دوڑ زندگی کے میدان میں،
پار کر جا راہ میں ہوں جو مشکلیں۔
لہرا اُٹھے آواز کا نغمہ
سب سے سُریلا سب سے مُدھر!

چارلس ڈارون

اُنیسویں صدی کے وسط یعنی ۱۸۵۱ء میں انگلینڈ میں ایک کتاب شائع ہوئی جس نے غیر استدلالی یا اعتقادی نظریے اور سائنٹفک نظریے کی تکرار کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ یہ کتاب چارلس ڈارون کی "جان دار مخلوق کی ابتدا" (ORIGIN OF SPECIES) تھی۔ ڈارون کا شمار بہت بڑے سائنس دانوں میں نہیں ہے۔ اُس نے جو کچھ لکھا اس میں کوئی بہت نئی بات نہیں تھی۔ ڈارون سے پہلے طبقات الارض اور طبعی علوم کے بہت سے ماہروں نے بھی اس موضوع پر بہت کام کیا تھا اور بہت سا مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ پھر بھی ڈارون کی کتاب سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا اثر بہت وسیع پیمانے پر مترتب ہوا۔ دوسری سائنسی تصنیفات کے مقابلے میں اس کتاب نے سماجی نظریے میں تبدیلی پیدا کرنے میں سب سے زیادہ مدد دی۔ اس نے ایک ذہنی انقلاب برپا کر دیا اور ڈارون کو شہرت بخشی۔

علم الطبیعات کے ایک ماہر کی حیثیت سے ڈارون جنوبی امریکا اور بحرالکاہل میں اِدھر اُدھر خوب گھوما تھا اور اُس نے اِس سلسلے میں کافی مواد اکٹھا کر لیا تھا۔ اِس کا استعمال کر کے اُس نے یہ دکھایا کہ جان داروں کی ہر ایک نسل کس طرح قدرت کے ایک متعینہ اصول ـــــ اصول انتخاب کے ماتحت بدلتی ہوئی ترقی یافتہ شکل

اختیار کرتی گئی ہے۔ اس وقت تک عام طور سے لوگوں کا یہی خیال تھا کہ انسان اور دوسری مخلوقوں کی تشکیل خدا نے ان کی موجودہ شکل میں الگ الگ کی ہے اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی یا یہ کہ ایک جان دار مخلوق بدل کر دوسری مخلوق کی شکل نہیں لے سکتی۔ ڈارون نے بہت سے ثبوت فراہم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ جان دار مخلوق کا ایک طبقہ دوسرے طبقے میں لازمی طور سے بدلتا ہے اور ترقی کا یہ فطری عمل ہے۔ یہ تبدیلی فطری انتخاب کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ اگر کسی ذرا سی تبدیلی سے کسی جاندار طبقے کو ذرا بھی فائدہ ملا یا دوسروں کے مقابلے میں زندہ رہنے میں اس سے کچھ زیادہ مدد ملی تو وہ تبدیلی ان کے اندر آہستہ آہستہ مستقل اور دائمی شکل اختیار کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیل شدہ طبقے کے جان دار زیادہ تعداد میں زندہ رہیں گے اور کچھ دنوں بعد اس تبدیل شدہ نسل کی بہتات ہو جائے گی اور یہ دوسری نسلوں کا صفایا کر دے گی۔ اس طریقے سے ایک کے بعد ایک تبدیلی اور تغیّر ہوتے چلے جائیں گے اور کچھ مُدّت کے بعد تقریباً ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح وقت پا کر تنازع الابقاء کے اصول کے ماتحت فطری انتخاب کے عمل کے ذریعے بہت سی نئی نسلیں پیدا ہوتی رہیں گی اس اصول کا پودوں، جانوروں اور انسانوں تک پر اطلاق ہوگا۔ اس نظریے کے مطابق یہ ممکن ہے کہ آج حیوانات اور نباتات کی جو مختلف نسلیں دکھائی دے رہی ہیں اُن سب کا پُرکھا ایک ہی رہا ہو۔

کچھ ہی سال بعد ڈارون نے اپنی دوسری کتاب "انسان کا ارتقاء" شائع کی جس میں اُس نے اس نظریے کا نسلِ انسانی پر اطلاق کر کے دکھایا۔ ارتقاء اور فطری انتخاب کا یہ نظریہ اب بیشتر لوگوں نے تسلیم کر لیا ہے۔ اگرچہ ٹھیک اُسی شکل میں نہیں جس شکل میں ڈارون اور اُس کے پیرو کاروں نے اُسے دریافت اور مرتب کیا تھا۔ دراصل جانوروں کی نسل سدھارنے اور پودوں اور پھلوں کے اُگانے میں انتخاب کے اس اصول کا عملی طور پر استعمال کرنا لوگوں کے لیے ایک آسان بات بن گئی ہے۔

آج کل کے مختلف بیش قیمت جانور اور پودے مصنوعی طریقوں سے پیدا کی ہوئی نئی نسلوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ اگر انسان تھوڑی مدت میں اس طرح مصنوعی تبدیلی کر کے نئی نسلیں پیدا کر سکتا ہے تو لاکھوں اور کروڑوں سال کی مدت میں فطرت اس سلسلہ میں کیا کچھ نہیں کر سکی ہو گی؟ لندن کے ساؤتھ کینسنگٹن میوزیم جیسے کسی علم الطبیعات کے عجائب گھر کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح نباتات اور حیوانات ہمیشہ اپنے آپ کو قدرتی حالات کے مطابق ڈھالتے چلے جا رہے ہیں۔

آج یہ سب باتیں ہمیں مسلّم نظر آتی ہیں۔ لیکن ستر سال پہلے یہ حالت نہیں تھی۔ اس وقت مغرب کے زیادہ تر لوگوں کا یہی عقیدہ تھا کہ بائیبل کے تذکرے کے مطابق کائنات کا وجود عیسیٰ مسیح سے ۴۰۰۴ سال قبل ہوا۔ ہر ایک پیڑ، پودے اور جان دار الگ الگ پیدا کیے گئے اور سب سے آخر میں انسان بنایا گیا۔ وہ مانتے تھے کہ سیلابِ نوح آیا تھا اور نوح کی کشتی میں سارے جان داروں کے جوڑے اس لیے رکھے گئے تھے کہ کسی بھی جان دار مخلوق کا وجود ختم نہ ہونے پائے۔ یہ سب باتیں ڈارون کے نظریے سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ ڈارون اور طبقات الارض کے ماہرین جب زمین کی عمر کا ذکر کرتے تھے تو ۶۰۰۰ سال کی مختصر مدت کے بجائے کروڑوں سال کی بات کرتے تھے۔ اس طرح لوگوں کے ذہنوں میں زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی اور بہت سے آدمیوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ کیا کریں۔ ان کا عقیدہ انھیں ایک بات ماننے کی تلقین کرتا تھا اور ان کی عقل دوسری بات ماننے پر مجبور کرتی تھی۔ جب انسان پرانی روایات میں اندھا یقین رکھتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو مجبور اور بے بس سا محسوس کرتے ہیں اور انھیں کھڑے ہونے کے لیے کہیں ٹھوس زمین دکھائی نہیں دیتی مگر کسی دھچکے سے اگر ہمیں حقیقت کا علم ہو جائے تو وہ دھچکا اچھا ہوتا ہے۔

انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں سائنس اور مذہب کے درمیان خوب نوک جھونک رہی۔ اس کے نتیجے کے بارے میں تو کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا

تھا۔ صنعت و حرفت اور ٹکنالوجی کی نئی دنیا کا دارو مدار سائنس پر تھا اس لیے سائنس کا دامن چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ سائنس کی برابر فتح ہوتی چلی گئی اور "فطری انتخاب" اور "تنازع الالبقا" کی اصطلاحیں زبان زد ہو گئیں۔ بہت سے لوگ ان کا مطلب پوری طرح سمجھے بغیر ہی اِن فقروں کو استعمال کرنے لگے۔

ڈارِون نے اپنی کتاب "انسان کی نسل" میں یہ بتایا تھا کہ انسان اور بندروں کی کچھ ذاتیں اصلاً شاید ایک رہی ہوں گی۔ یہ بات ارتقاء کے مختلف مراحل کی مثال پیش کر کے ثابت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اِس سے "کھوئی ہوئی کڑی" کا ایک عام مذاق چل پڑا اور عجیب بات یہ ہوئی کہ حکمراں طبقوں نے بھی ڈارون کے نظریے کو توڑ مروڑ کر اُس سے اپنے مطلب کی بات نکال لی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ اس نظریے سے ان کی برتری کا ایک اور ثبوت بھی مل گیا ہے۔ زندگی کی جدو جہد میں سب سے قابل ہونے کی وجہ سے وہ بچ گئے تھے اس لیے تنازع الالبقاء اور فطری انتخاب کے اصولوں کے ماتحت وہ سب سے اوپر آ گئے اور حکمراں طبقہ بن گئے! ایک طبقے کا دوسرے طبقے پر یا ایک قوم کا دوسری قوم پر تسلّط جمانے کے حق میں یہ ایک نیا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ سامراجی طاقت اور سفید نسل کی برتری کے لیے یہ ایک اور دلیل بن گئی اور مغرب کے بہت سے لوگ سمجھنے لگے کہ دوسروں پر جتنا زیادہ دھونس جمائیں گے اور جتنے زیادہ طاقتور اور ظالم بن کر رہیں گے انسانی زندگی کی قدر و قیمت میں ان کا درجہ اتنا ہی اونچا ہونا ممکن ہو گا۔ یہ نظریہ صحت مند نہیں ہے۔ مگر اس سے ایشیا اور افریقہ میں مغرب کی سامراجی طاقتوں کے رویّے کا راز کچھ کچھ کھلتا ہے۔

بعد میں کچھ سائنس دانوں نے ڈارِون کے نظریے پر تنقید کی ہے۔ لیکن اس کا نظریہ اپنے وسیع معنوں میں آج بھی صحیح مانا جاتا ہے۔ اس کے نظریے کی وسیع پیمانے پر مقبولیت کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں کا ارتقائی نظریے میں یقین ہو گیا ہے۔ اس نظریے کا یہ مطلب تھا کہ یہ انسانی سماج اور دنیا اپنے کمال کی طرف بڑھ رہی ہے اور دن دن ترقّی کرتی جا رہی ہے۔ ترقّی اور آگے بڑھنے کا یہ تصوّر

صرف ڈارون کے نظریے کا ہی نتیجہ نہیں تھا۔ سائنٹیفک تحقیق کے سارے رجحان نے اور صنعتی انقلاب کے نتیجے کے طور پر اور اُس کے بعد رونما ہونے والی تمام تبدیلیوں نے لوگوں کا ذہن اس کے لیے ہموار کر دیا تھا۔ ڈارون کے نظریے نے اس کی ایک طرح سے تصدیق کر دی اور لوگ سوچنے لگے کہ انسانی ترقّی کی آخری منزل کچھ بھی ہو وہ پے در پے فتح حاصل کرتے ہوئے فخر کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ترقّی کا یہ تصوّر بالکل نیا تھا۔ گزرے ہوئے زمانے میں یورپ، ایشیا یا کسی بھی قدیم تہذیب میں ایسا کوئی تصوّر رہا ہو، ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ یورپ میں ٹھیک صنعتی انقلاب کے زمانے تک لوگ ماضی کو درخشاں اور مثالی زمانہ مانتے تھے۔ یونان اور روم کی کلاسیکی تصنیفات کا پُرانا زمانہ بعد کے زمانوں سے برتر اور بہتر مانا جاتا تھا۔ لوگ ایسا ماننے لگے تھے کہ بنی نوع انسان تنزلی کے راستے پر گامزن ہے یا کم سے کم اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہو رہی ہے۔

ہندوستان میں بھی تنزلی اور ماضی کی درخشاں تصویر کی قریب قریب ایسی ہی کہانی ہے۔ ہندوستانی پُران بھی طبقات الارض کے ماہرین کے قائم کئے ہوئے زمانوں کی طرح کائنات کی بہت لمبی مدّت مانتے ہیں مگر وہ بھی "ست یگ" سے شروع کر کے "کل جگ" پر آتے ہیں۔

اِس لیے ہم دیکھتے ہیں انسانی ترقّی کا تصوّر بالکل نیا ہے۔ قدیم تاریخ کا ہمیں جتنا کچھ علم ہے، اس سے ہمیں اس بات کا یقین ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا علم ابھی بہت محدود ہے اور ممکن ہے اِس علم میں اضافہ ہونے پر ہمارا نظریہ بدل جائے۔ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں اس ترقّی کے بارے میں جتنی گرمجوشی تھی اتنی شاید آج نہیں رہی ہے۔ اگر ترقّی کا نتیجہ یہی ہو کہ پچھلی عالمگیر جنگ کی طرح ہم ایک دوسرے کو بڑے پیمانے پر تباہ و برباد کریں تب تو اس "ترقّی" میں کچھ نہ کچھ کھوٹ ضرور ہے۔ دوسری بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ڈارون کے تنازع الابقا کی منطق کا یہ لازمی مطلب نہیں ہے کہ زندگی کی جدوجہد میں برتر ہی زندہ رہتا ہے۔ یہ سب تو

عالموں کے مفروضات ہیں۔ ہمارے لیے تو غور کرنے کی بات صرف یہ ہے کہ غیر تغیر پذیر سماج کے پرانے اور عام خیال کو انیسویں صدی کی جدید سائنسی معلومات نے ایک طرف ڈھکیل دیا اور اس کی جگہ یہ خیال پھیل گیا کہ سماج تغیر پذیر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ترقی کا تصور بھی سامنے آیا اور اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں سماج درحقیقت اتنا بدل گیا ہے کہ اسے پہچانا نہیں جا سکتا۔

جب میں ڈارون کا جان دار نسلوں کے ماخذ کا نظریہ بتا رہا ہوں تو یہ جاننا اور بھی دلچسپ ہوگا کہ اس موضوع پر ایک چینی فلسفی نے ۲۵۰۰ سال پہلے کیا لکھا تھا۔ اس کا نام ژون ژے تھا اور اس نے عیسیٰ سے چھ سو سال پہلے بدھ کے زمانے کے آس پاس لکھا تھا:۔

"سب جان دار مخلوق کی پیدائش ایک ہی نسل سے ہوئی ہے۔ اس ایک بنیادی نسل میں رفتہ رفتہ اور برابر تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ جس کے نتیجے میں جان داروں کی مختلف شکلیں سامنے آئیں۔ یہ تبدیلی ان جان داروں میں یکایک نہیں پیدا ہوگئی۔ بلکہ اس کے برخلاف پشت در پشت رفتہ رفتہ ہونے والی تبدیلیوں سے یہ فرق پیدا ہوا۔"

یہ اصول ڈارون کے اصول سے کافی ملتا جلتا ہے اور حیرت کی بات ہے کہ عمرانیات کا یہ قدیم چینی مفکر ایسے نتیجے پر پہنچ گیا جس کی دوبارہ دریافت کرنے میں دنیا کو ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔

انیسویں صدی جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی تبدیلیوں کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔ سائنس نے حیرت انگیز کارنامے دکھائے اور تحقیق و ایجاد کی کبھی نہ ختم ہونے والی دنیا کی رنگا رنگی نے لوگوں کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا۔ ان میں سے تار، ٹیلیفون، موٹر اور پھر ہوائی جہاز جیسی کتنی ہی ایجادوں نے عوام کی زندگی میں بے پناہ تبدیلیاں لا دی ہیں۔ سائنس نے دور آسمان اور آنکھوں کو نہ دکھائی دینے والے ایٹم کو ناپنے کی ہمت کی۔ اس نے انسان کی تھکا دینے والی مشقت کم کر دی اور کروڑوں

انسانوں کی زندگی میں آسائشیں میسّر کردیں۔ سائنس کی وجہ سے دنیا کی اورخاص طور سے صنعتی ملکوں کی آبادی میں زبردست اضافہ ہوگیا۔ ساتھ ہی سائنس نے بربادی کے کامل طریقے بھی ایجاد کرڈالے۔ مگر اس میں سائنس کو قصوروار نہیں ٹھیرایا جاسکتا۔ اس نے تو قدرت پر قابو پانے کے لیے انسان کی قوّت بڑھادی۔ مگر اِس تمام قوّت کو حاصل کرنے کے بعد انسان یہ نہیں سمجھ پایا کہ اپنے اوپر قابو کیسے پایا جاتا ہے۔ اس لیے اُس نے بہت سے شرم ناک کام کیے اور سائنس کی دین کو بےکار گنوادیا۔ لیکن سائنس کی ترقّی کا یہ سفر برابر جاری رہا اور اس نے ڈیڑھ سو سال کے اندر ہی دُنیا کی ایسی کایا کلپ کردی، جیسی پچھلے ہزاروں سال میں بھی نہیں ہوپائی تھی۔ سچ پچ سائنس نے ہر ملک میں اور زندگی کے ہر شعبے میں ہمہ گیر انقلاب برپا کردیا ہے۔

سائنس کے میدان میں یہ ترقّی اب بھی جاری ہے اور اُس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ اِس کے لیے کوئی ٹھہرنے کا مقام نہیں ہے۔ ایک ریلوے لائن بنتی ہے مگر جب تک کہ وہ چالو ہو، پرانی پڑجاتی ہے۔ وقت آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایک مشین خرید کر کھڑی کی جاتی ہے کہ سال دو سال کے اندر اُس سے بہتر اور کارگر مشینیں بننے لگتی ہیں۔ یہ دَوڑ بےتحاشا جاری ہے۔

جمہوریت کے علمبردار

اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں انگلینڈ میں ایک معرکے کی کتاب شائع ہوئی۔ یہ ایڈم اسمتھ کی "دیلتھ آف نیشنز" (قوموں کی دولت) تھی۔ یہ کتاب سیاسیات پر نہیں تھی۔ بلکہ سیاسی اقتصادیات پر تھی۔ اس وقت کے دوسرے سبھی علوم کی طرح یہ علم بھی مذہب اور اخلاقیات کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اس موضوع سے متعلق بہت سی باتیں گڈمڈ تھیں۔ ایڈم اسمتھ نے اِس موضوع کی سائنٹفک ڈھنگ پر تشریح و توضیح کی اور تمام اخلاقی الجھنوں کو نظر انداز کر کے اقتصادیات پر اثر انداز ہونے والے مخصوص اصولوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اقتصادیات میں اس بات سے بحث کی جاتی ہے کہ فرد یا کسی ملک کی آمدنی اور خرچ کا انتظام کیسے کیا جاتا ہے۔ وہ کیا پیدا کرتے ہیں اور کیا صرف کرتے ہیں اور آپس میں اور دوسرے ملکوں اور قوموں کے ساتھ اِن کے کیا تعلقات ہیں۔ ایڈم اسمتھ کا یقین تھا کہ یہ سارے مخصوص اور پیچیدہ عمل کچھ مقررہ اور متعینہ اصولوں کے ماتحت چلتے ہیں۔ انھیں اصولوں کی اس نے اپنی کتاب میں وضاحت کی ہے۔ اِس کا یہ بھی یقین تھا کہ صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ تاکہ اِن اصولوں میں خلل نہ واقع ہو۔ اِس وقت فرانس میں جو نئے جمہوری خیال اُبھر رہے تھے ان سے ایڈم اسمتھ کی کتاب کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن انسانوں اور قوموں پر اثر انداز ہونے والے

ایک بہت اہم مسئلے کی سائنٹفک تشریح کی۔ اس کی کوشش اِس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ لوگ ہر چیز کو قدیم مذہبی نظریے سے دیکھنا چھوڑ کر ایک نئی سمت میں بڑھ رہے تھے۔ ایڈم اسمتھ علم اقتصادیات کا جنم داتا مانا جاتا ہے جس نے اُنیسویں صدی کے مختلف انگریز ماہرینِ اقتصادیات کو مشعلِ راہ دکھائی ہے۔

اقتصادیات کا یہ نیا علم عالموں اور کچھ تعلیم یافتہ لوگوں تک ہی محدود رہا۔ لیکن اسی درمیان نئے جمہوری خیال تیزی سے پھیل رہے تھے۔ امریکا اور فرانس کے انقلابات نے انھیں بہت مقبول بنا دیا تھا۔ ان کا زبردست پروپیگنڈا ہوا۔ امریکا کی آزادی کا اعلان اور فرانس کے شہری حقوق کے اعلان نامے کے دل کش الفاظ اور فقروں نے لوگوں کے دلوں میں گہری ہلچل مچادی۔ ان سے کروڑوں مصیبت زدوں کے دل پھڑک اُٹھے۔ اُن کے لیے یہ نجات کا پیام لے کر آئے۔ دونوں اعلانوں میں ہر فرد کی آزادی اور مساوات اور اطمینان سے رہنے کے حق کا ذکر تھا۔ لیکن جان سے بھی زیادہ عزیز یہ حقوق صرف فخریہ اور زوردار الفاظ میں اعلان کر دینے سے ہی حاصل نہیں ہو گئے۔ آج اِن اعلان ناموں کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حقوق کا استعمال کرنے والوں کی تعداد آج بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن اِن اصولوں کا اعلان اپنی جگہ خود ایک غیر معمولی اور زندگی بخشنے والی بات ہے۔

دوسرے ملکوں کی طرح یورپ میں بھی اور دوسرے مذہبوں کی طرح عیسائی مذہب میں بھی قدیم تصور یہی تھا کہ عذاب اور تکلیف ہر انسان کو لازمی طور سے جھیلنا پڑتی ہے۔ مذہب نے گویا اس دُنیا میں غربت اور مصیبت کو صرف مستقل ہی نہیں بلکہ باعزت مقام دے دیا تھا۔ مذہب کے تمام انعامات آخرت کے لیے تھے۔ یہاں تو ہمیں یہی نصیحت دی جاتی تھی کہ صبر و قناعت کے ساتھ اپنی قسمت کی لکھے کو جھیلتے رہیں اور کسی بنیادی تبدیلی کے پیچھے نہ پڑیں۔ خیرات دینے یعنی غریبوں کو ٹکڑے ڈالنے کے رجحان کو بڑھاوا دیا جاتا تھا۔ مگر مفلسی پیدا

کرنے والے نظام کا خاتمہ کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ آزادی اور مساوات کا تصور بھی چرچ اور سماج کے بیجا حقوق کے خلاف پڑتا تھا۔

جمہوریت نے کبھی یہ نہیں کہا کہ سب انسان حقیقت میں برابر ہیں اور ایسا کہا بھی نہیں جا سکتا تھا، کیوں کہ اتنا تو ظاہر ہی ہے کہ انسان انسان میں فرق ہوتا ہے ـــــ فطری فرق جن کی وجہ سے کچھ لوگ دوسروں سے طاقت ور ہوتے ہیں، ذہنی فرق جس سے کچھ لوگ دوسروں سے زیادہ ذہین اور قابل بن جاتے ہیں اور اخلاقی فرق، جو کچھ لوگوں کو خود غرض بناتا ہے اور کچھ لوگوں کو اس کے برعکس بناتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اِن میں سے بہت سے فرق مختلف طرح کی زندگی گزارنے اور تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہوتے ہوں۔ دو برابر قابلیت والے لڑکوں یا لڑکیوں میں سے ایک کو اچھی تعلیم دی جائے، اور دوسرے کو بالکل تعلیم نہ دی جائے تو کچھ سال بعد دونوں میں زبردست فرق پیدا ہو جائے گا۔ یا ایک کو اچھی غذا دی جائے، اور دوسرے کو خراب اور ناکافی خوراک ملے تو پہلے کی باڑھ ٹھیک ڈھنگ پر ہوگی اور دوسرا کمزور، مریض اور لاغر رہے گا۔ اس لیے غذا، ماحول اور تعلیم و تربیت انسانوں میں بہت فرق پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اگر سب کو ایک ہی طرح کی تعلیم اور سہولتیں ملیں تو یہ فرق آج سے بہت کم ہو جائے۔ لیکن جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے، وہ مانتی ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جانا چاہیے کہ گویا اس کی سیاسی اور سماجی حیثیت برابر کی ہے۔ اگر جمہوریت کے اس اصول کو پوری طرح مان لیا جائے، تو ہم بہت سے انقلابی نتیجوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس اصول سے ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکمراں انجمن یا پارلیمنٹ کے انتخاب میں ہر آدمی کو ووٹ دینے کا اختیار ہونا چاہیے۔ ووٹ دینے کا حق سیاسی اقتدار کی علامت ہے اور یہ مان لیا گیا ہے کہ اگر ہر آدمی کو ووٹ کا حق ہو تو اُسے سیاسی اقتدار میں برابر کا حق مل جائے گا۔ بالغ حق رائے دہندگی کا مطلب یہ ہے کہ ہر بالغ شخص کو ووٹ دینے کا حق ہو۔ بہت دنوں تک عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا

اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب عورتوں نے خاص طور سے برطانیہ میں اِس بارے میں زبردست احتجاج کیا تھا۔ بیشتر ترقی یافتہ ملکوں میں آج کل عورتوں اور مردوں دونوں کو ووٹ کا حق حاصل ہے۔

مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ جب زیادہ تر لوگوں کو ووٹ کا حق مل گیا تو انھیں معلوم ہوا کہ اِس سے ان کی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا ہے۔ ووٹ کا حق مل جانے پر بھی انھیں حکومت میں یا تو کچھ بھی اختیار نہیں ملا یا بہت تھوڑا اختیار ملا۔ بھوکے آدمی کے لیے رائے دہندگی کا حق کس کام کا؟ اصل اقتدار تو ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو اِن کی مفلسی سے فائدہ اٹھا سکتے تھے اور انھیں مجبور کرکے اپنا اُلّو سیدھا کر لیتے تھے۔ ووٹ کے حق سے جس سیاسی اقتدار کے ملنے کا خیال تھا اقتصادی اقتدار کی بنیاد پر اس کی تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے وہ خیالِ خام ثابت ہوا شروع کے جمہوریت پسندوں کے وہ شاندار خواب، کہ رائے دہندگی کا حق ملتے ہی مساوات قائم ہو جائے گی، منتشر ہو گئے۔

مگر یہ بات تو بہت بعد میں ہوئی۔ شروع کے دنوں میں یعنی اٹھارویں صدی کے آخیر اور اُنیسویں صدی کے شروع میں جمہوریت پسندوں میں بہت جوش تھا۔ جمہوریت سب کو آزاد اور برابر کی حیثیت کا شہری شمار کرنے والی تھی اور حکومت سب کا بھلا چاہنے والی! اٹھارویں صدی کے بادشاہوں اور حکمرانوں نے جیسی من مانی کی تھی اور مطلق العنانیت کا جیسا غلط استعمال کیا تھا، اس کے خلاف بہت احتجاج ہوا۔ اس سے ان لوگوں کو اپنے اعلان ناموں میں افراد کے حقوق کا بھی اعلان کرنا پڑا۔

انگلینڈ جو اٹھارویں صدی میں سیاسی فکر اور رجحانات کے اعتبار سے پچھڑا ہوا تھا امریکا اور فرانس کے انقلابات سے بہت متاثر ہوا۔ اس پر پہلا اثر تو اِس اندیشے سے ہوا کہ نئے جمہوری خیالوں سے ملک میں سماجی انقلاب نہ برپا ہو جائے۔ حکمراں طبقہ پہلے بھی زیادہ مطلق العنان اور قدامت پرست ہو گیا۔

پھر بھی تعلیم یافتہ اور ذہین لوگوں میں نئے خیالات پھیلتے گئے۔ ٹامس پین، اس زمانے کی ایک زبردست انگریز شخصیت گزری ہے۔ آزادی کی لڑائی کے وقت وہ امریکا میں تھا۔ اس نے امریکا کے لوگوں کی مدد کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ امریکی لوگوں کا خیال مکمل آزادی کے حق میں بدل دینے میں اس شخص کا بھی کچھ ہاتھ تھا۔ انگلینڈ واپس آنے پر اس نے انقلابِ فرانس کے حق میں "انسان کے حقوق" (رائٹ آف مین) نام کی ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب میں اس نے شہنشاہیت پر حملہ کیا اور جمہوریت کی حمایت کی۔ اس کی وجہ سے حکومتِ برطانیہ نے اسے باغی قرار دے دیا۔ اُسے بھاگ کر فرانس چلا جانا پڑا۔ پیرس میں وہ بہت جلد قومی مجلس کا ممبر بن گیا مگر ۱۷۹۳ء میں جیکوبن لوگوں نے اُسے قید کر لیا۔ کیوں کہ اس نے سولھویں لوئی کے قتل کی مخالفت کی تھی۔ پیرس کے جیل خانے میں اُس نے "استدلال کا زمانہ" (دی ایج آف ریزن) نام کی دوسری کتاب لکھی۔ اس میں اس نے مذہبی نظریات کی تنقید کی۔ روبس پیری کی موت کے بعد اُسے پیرس جیل سے رہا کر دیا گیا۔ پین چوں کہ وہ خود برطانوی عدالت کی حدودِ اختیارات سے باہر تھا اس لیے اس کتاب کو چھاپنے کے جرم میں اُس کے انگریز ناشر کو سزا دے دی گئی۔ ایسی کتاب سماج کے لیے خطرناک سمجھی گئی، کیوں کہ غریبوں کو اپنی حالت پر قانع رکھنے میں مذہب کو سب سے زیادہ مددگار سمجھا جاتا تھا۔ پین کی کتاب کے کئی ناشر جیل بھیج دیے گئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ یہ دل چسپ بات ہے کہ شاعر شیلی نے اس سزا کے خلاف جج کو ایک خط لکھا تھا۔

اُنیسویں صدی کے نصف اوّل میں جمہوری خیالات خوب پھیلے۔ یورپ میں ان کا سرچشمہ انقلابِ فرانس تھا۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے، پھر بھی انقلاب کے تصوّرات بدستور قائم رہے۔ یہ جمہوری تصوّرات شہنشاہیت اور مطلق العنانیت کے خلاف عقلی بغاوت تھی۔ لیکن لوگوں کے لیے پرانے تصوّرات کو چھوڑنا اور نئے تصوّرات کو اختیار کرنا غیر معمولی حد تک مشکل ہوتا ہے۔ وہ

اپنی آنکھوں اور اپنے ذہنوں کو بند کر لیتے ہیں اور کسی طرف دیکھنے سے ہی انکار کر دیتے ہیں خواہ پرانی باتوں سے انھیں نقصان ہی پہنچ رہا ہو، تب بھی اُن سے چپکے رہنے کے لیے جد و جہد کرتے ہیں۔ قدامت پرستی میں بڑی زبردست طاقت ہوتی ہے۔ اپنے کو بہت ترقی یافتہ سمجھنے والے بائیں بازو کے لوگ بھی اکثر پرانے اور فضول خیالوں سے چپکے رہتے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اس سے ترقی کی رفتار دھیمی پڑ جاتی ہے اور اکثر و بیشتر اصل حالات لوگوں کے سوچنے کے ڈھنگ سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر انقلاب کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔

بیسویں سال تک جمہوریت پسندوں کا کام صرف انقلاب فرانس کے تصورات اور اس کی روایات کو برقرار رکھنا ہی رہا۔ جمہوریت پسندوں نے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نہیں ڈھالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدی کے بدلتے بدلتے یہ خیال کمزور پڑ گیا اور بعد میں بیسویں صدی میں تو بہتوں نے اُسے نامنظور کر دیا۔

شروع کے جمہوریت پسندوں کا استدلال اور عقل کا سہارا لینا قدرتی بات تھی۔ فکر اور تقریر کی آزادی کی ان کی مانگ کا قدامت پرست مذہب اور اُس کے علوم کے ساتھ کسی طرح کی مفاہمت کا ہونا ناممکن تھا۔ اس طرح جمہوری اصولوں اور سائنس نے مل کر مذہبی علوم کے قدامت پرست شکنجوں کو ڈھیلا کیا۔ لوگ بائیبل کا تجزیہ کرنے کی بھی ہمت کرنے لگے، گویا وہ کوئی عام کتاب تھی اور ایسی چیز نہیں تھی جسے کسی طرح کے شک و شبہہ کے بغیر محض عقیدت مندی کی بنا پر تسلیم کر لیا جائے۔ بائیبل کی اس تنقید کو اعلیٰ درجے کی تنقید کہا گیا۔ اِن ناقدین نے یہ نتیجہ نکالا کہ بائیبل مختلف زمانوں کے مختلف لوگوں کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ان کا یہ بھی نظریہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کا ارادہ کوئی مذہبی فرقہ چلانے کا نہیں تھا۔ اس تنقید سے کتنے ہی پرانے عقیدے متزلزل ہو گئے۔

سائنس اور جمہوری تصورات کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ مذہب کی پرانی بنیادیں کمزور ہوتی گئیں۔ پرانے مذہب کی جگہ پُر کرنے کے لیے نئے ڈھنگ کی فلسفیانہ کتابیں تصنیف کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسی ہی ایک کوشش آگسٹ کامتے نام کے ایک فرانسیسی فلسفی نے کی تھی۔ اس کا زمانہ ۱۷۹۸ء سے ۱۸۵۷ء تک ہے۔ کامتے نے محسوس کیا کہ پرانے مذہبی علوم اور قدامت پرست مذہب کا زمانہ گزر چکا، مگر اُسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ سماج کو لازمی طور سے کسی نہ کسی مذہب کی ضرورت ہے۔ اس لیے اُس نے "انسانیت" کے مذہب کی تجویز کی اور اس کا نام "مذہب ثبوتیت" (POSITIVISIM) رکھا۔ اس کی بنیاد محبت، نظم و ضبط اور انسانی ترقی پر رکھی گئی۔ اس میں کوئی بات مافوق الادراک نہیں تھی۔ اس کی بنیاد سائنس پر تھی۔ انیسویں صدی کے دوسرے تمام رائج خیالوں کی طرح اس خیال کے پیچھے بھی بنی نوع انسان کی ترقی کا تصور کارفرما تھا۔ کامتے کے مذہب پر معدودے چند لوگوں کا ہی یقین رہا، مگر یورپ کی فکر و نظر کی دنیا پر اس کا کافی وسیع اثر پڑا۔ انسانی سماج اور تہذیب انسانی کی تشریح و توضیح کرنے والے عمرانی علوم کا مطالعہ اسی کا شروع کیا ہوا سمجھنا چاہیے۔

انگریز فلسفی اور ماہر اقتصادیات جان اسٹورٹ مل، (۱۸۰۶ء سے ۱۸۷۳ء) کامتے کا ہم عصر تھا۔ گر وہ کامتے کی موت کے بہت دنوں بعد تک زندہ رہا۔ مل پر کامتے کی توضیحات اور اشتراکی تصورات کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ ایڈم اسمتھ کی تشریحات کو مرکز مان کر سیاسی اقتصادیات کا جو مکتبِ خیال انگلینڈ میں بن گیا تھا اُسے مل نے نئی سمت میں لے جانے کی کوشش کی۔ اُس نے اقتصادی تصورات میں کچھ اشتراکی اصولوں کو جگہ دلائی۔ مگر اس کی سب سے زیادہ شہرت "افادیتِ اجتماعی" کے فلسفے کے موجد کی حیثیت سے ہے۔ افادیتِ اجتماعی کا اصول نیا تھا جو انگلینڈ میں کچھ دنوں پہلے بھی چل چکا تھا مگر اُسے زیادہ اہمیت مل نے ہی دی۔ جیسا کہ اس کے نام سے پتہ چلتا ہے، اِس

اصول کی بنیاد فلسفۂ افادیت پر تھی۔ افادیت پرستوں کا بنیادی اصول تھا "زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سکھ چین"۔ بھلائی بُرائی کا بس یہی معیار تھا۔ جو کام جتنا زیادہ سکھ اور چین کو بڑھانے والا ہوتا، وہ اتنا ہی اچھا سمجھا جاتا جو جتنا دکھ بڑھانے والا ہوتا، وہ اتنا ہی بُرا مانا جاتا۔ سماج اور حکومت کی بہتر تنظیم کی بنیاد زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ آرام بہم پہنچانا مانی گئی۔ یہ نظریہ اس سے پہلے مساوات والے جمہوری نظریے سے مختلف تھا۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے زیادہ سے زیادہ آرام کے لیے تھوڑے سے لوگوں کی قربانی یا اذیت یقینی ہو سکتی ہے۔ اس طرح اکثریت کے اختیارات کو ہی جمہوریت کا معیار قرار دیا گیا۔

جان اسٹورٹ مِل افراد کی آزادی کے جمہوری تصور کا حامی تھا۔ اُس نے "آزادی پر" (آن لبرٹی) نام کی ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جو کافی مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں تقریر اور ضمیر کی آزادی کی حمایت کی گئی ہے۔

ایسے آدمی کا قدامت پرست مذہب یا مطلق العنانیت کے ساتھ سمجھوتہ نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے اُنیسویں صدی کے مغربی یورپ کے کچھ مشہور مفکّرین کے نام گنا دیے ہیں تاکہ ذہن و فکر کی نشوونما کی سمت کا اندازہ ہو جائے۔ ان ناموں کی حیثیت فکر و نظر کی دُنیا میں سنگِ میل کی ہے مگر ان لوگوں کا اور عام طور پر شروع کے جمہوری اصولوں کے حامیوں کا اثر قریب قریب سماج کے ذہین طبقوں تک ہی محدود تھا۔ ذہین لوگوں کے طبقے سے چھن کر وہ کسی حد تک دوسرے لوگوں میں بھی پہنچ گیا تھا۔ اگرچہ اِس جمہوری تصور کا عوام پر براہِ راست بہت معمولی اثر پڑا، لیکن بالواسطہ اثر خوب ہوا۔ حقِ رائے دہندگی کی مانگ جیسے کچھ معاملوں میں تو اس کا براہِ راست اثر بھی پڑا۔

کارل مارکس

اُنیسویں صدی کے وسط میں یورپ کی مزدور اور سوشلسٹ دُنیا میں ایک اچھوتی اور دل کش شخصیت والا شخص سامنے آیا۔ یہ کارل مارکس تھا۔ مارکس ایک جرمن یہودی تھا۔ اُس کی پیدائش ۱۸۱۸ء میں ہوئی تھی۔ اُس نے قانون، تاریخ اور فلسفے کا مطالعہ کیا۔ ایک اخبار نکالنے کی وجہ سے اس کا جرمنی کے افسروں سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ پیرس چلا آیا، جہاں وہ نئے نئے لوگوں کے تعلق میں آیا۔ اُس نے سوشلزم اور لاحکومیت یا نراج (ANARCHISM) پر نئی نئی کتابیں پڑھیں اور وہ سوشلسٹ خیال کا حامی بن گیا۔ وہیں پیرس میں فریڈرک اینجلس نام کے ایک اور جرمن سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اینجلس انگلینڈ سے آکر بس گیا تھا اور وہاں کپڑے کی بڑھتی ہوئی صنعت میں ایک دولت مند کارخانہ دار بن گیا تھا۔ اینجلس بھی موجودہ سماجی حالات سے بدظن اور غیر مطمئن تھا اور اس کا دماغ چاروں طرف پھیلی ہوئی غریبی اور لوٹ کھسوٹ سے نجات کے راستے کی جستجو میں لگا ہوا تھا۔ رابرٹ اوون کی اصلاحی کوششیں اُسے بہت اچھی لگیں اور اس کے خیالات سے متاثر ہو کر وہ اوون کا معتقد بن گیا۔ پیرس کے سفر نے، جس کے نتیجے میں کارل مارکس سے اُس کی پہلی ملاقات ہوئی، اُس کے خیالوں کو بھی بدل دیا۔ اُس وقت سے مارکس اور اینجلس گہرے دوست اور ساتھی

ہو گئے۔ دونوں ہم خیال تھے۔ دونوں ایک ہی مقصد کے لیے دل وجان سے لگ کر کام کرنے لگے۔ عمر بھی قریب قریب دونوں کی برابر تھی۔ ان کا تعاون اتنا گہرا تھا کہ جو کتابیں انھوں نے شائع کیں ان میں سے بیشتر ان دونوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھیں۔

فرانس کی اس وقت کی حکومت نے مارکس کو پیرس سے نکال دیا۔ یہ لوئی فلپ کا زمانہ تھا۔ مارکس لندن چلا گیا اور وہاں کئی سال تک رہا۔ وہاں وہ برٹش میوزیم کی کتابوں کو پڑھنے میں ڈوبا رہتا۔ اُس نے محنت کر کے اپنے خیالوں کو ٹھوس شکل دی اور پھر اُن پر مضامین لکھنے لگا مگر وہ کورا معلّم یا فلسفی نہیں تھا جو بیٹھا بیٹھا اصول گڑھا کرتا ہو اور دنیا کی باتوں سے سروکار نہ رکھتا ہو۔ جہاں اُس نے سوشلسٹ تحریک کے مبہم تصوّرات کو واضح شکل دی اور اُس کے صاف صاف مقصد متعین کیے وہاں اُس نے یورپ میں مزدوروں اور اُن کی تحریکوں کو منظّم کرنے میں عملی حیثیت سے اور مستعدی کے ساتھ حصّہ لیا۔ ۱۸۴۸ء میں، جو یورپ کا انقلابی سال کہلاتا ہے، جو واقعات رُونما ہوئے ان کا مارکس کے دل پر قدرتی طور پر بہت اثر ہوا۔ اُسی سال اس نے اور اینجلس نے ایک مشترکہ اعلان نامہ شایع کیا جو بہت مشہور ہو چکا ہے۔ یہ کمیونسٹ مینی فسٹو تھا۔ جس میں انھوں نے ان تصوّرات کی توضیح و تشریح کی جو فرانس کے عظیم انقلاب کی اور بعد میں ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۸ء کی بغاوتوں کی تہ میں موجود تھے۔ انھوں نے اِس اعلان نامے میں یہ بھی بتلایا کہ وہ تصوّرات نہ تو حقیقی صورتِ حال کے لیے کافی تھے اور نہ اُن سے مطابقت رکھتے تھے۔ انھوں نے اس وقت کی آزادی مساوات اور اخوّت کے جمہوری نعروں پر تنقید کی اور یہ دکھایا کہ عوام کے لیے یہ باتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں اور یہ صرف متوسّط طبقے کی حکومت پر پاک بازی کا جھوٹا ملمع چڑھانے کے مترادف ہیں۔ آگے چل کر انھوں نے مختصراً سوشلزم کے اپنے تصوّرات کی وضاحت کی اور اعلان نامے کے آخیر میں انھوں نے سارے مزدوروں سے ان لفظوں میں اپیل کی "دُنیا کے

مزدورو ایک ہو جاؤ۔ تمھیں کھونا کچھ نہیں ہے سوائے اپنی غلامی کی زنجیروں کے اور پانے کو تمھارے لیے ساری دُنیا پڑی ہے "۔

یہ اپیل ایک دعوتِ عمل تھی۔ اس کے بعد مارکس نے اخباروں اور رسالوں کے ذریعے مستقل پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا اور مزدور تنظیموں کو متحد کرنے کی رات دن کوشش کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے یورپ میں مصیبت کا کوئی دور آتا دکھائی دے رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ مزدور اُس کے لیے تیار رہیں، تاکہ وہ اس سے پورا فائدہ اُٹھا سکیں۔ اُس کے اشتراکی نظریے کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام بیچ بیچ ایسی مصیبت کا زمانہ لائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ ۱۸۵۴ء میں نیویارک کے ایک اخبار میں مارکس نے لکھا تھا :۔

" پھر بھی ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یورپ میں چھٹی طاقت بھی ہے جو خاص خاص موقعوں پر، پانچوں نام نہاد " بڑی طاقتوں " پر اپنی برتری رکھتی ہے اور ان سب کو تھرّا دیتی ہے۔ یہ طاقت انقلاب کی ہے۔ بہت دن خاموش اور تنہا رہنے کے بعد اب مصیبت اور بھوک اسے پھر لڑائی کے میدان میں جانے کے لیے للکار رہی ہیں۔ صرف ایک اشارے کی ضرورت ہے۔ پھر تو یورپ کی چھٹی اور سب سے بڑی طاقت چمکتا ہوا زرہ بکتر پہنے اور ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے میدان میں نکل پڑے گی۔ یہ اشارہ آنے والی یورپ کی جنگ سے مل جائے گا "۔

یورپ کے اگلے انقلاب کے بارے میں مارکس کی پیشین گوئی صحیح نہیں ثابت ہوئی۔ اُس کے لکھنے کے ساٹھ سال بعد اور ایک عالم گیر جنگ کے بعد کہیں جاکر یورپ کے ایک حصّے میں انقلاب آیا۔ یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ پیرس کی کمیون حکومت کی شکل میں ۱۸۷۱ء میں انقلاب کی جو کوشش ہوئی، وہ بہت بے دردی کے ساتھ کچل دی گئی تھی۔

۱۸۶۴ء میں مارکس لندن میں ایک ملا جُلا جلسہ بُلانے میں کامیاب ہوا۔ اُس میں مختلف پارٹیوں کے لوگ، جو اپنے کو سوشلسٹ کہتے تھے، جمع ہوئے۔ ایک طرف تو

یورپ کے کئی غلام ملکوں کے جمہوریت پسند اور محبِّ وطن لوگ تھے، جو سوشلزم میں عقیدت تو رکھتے تھے مگر اُسے "دور کی کوڑی" سے تشبیہ دیتے تھے۔ ان کی زیادہ دلچسپی فوری طور پر ملک کی آزادی حاصل کرنے میں تھی۔ دوسری طرف لاحکومیت (نراج) میں یقین رکھنے والے لوگ تھے جو فوراً لڑائی مول لینا چاہتے تھے۔ جلسے میں مارکس کے علاوہ دوسرا بااثر شخص لاحکومیت کا حامی رہنما باکونن تھا۔ وہ کئی سال سائبیریا میں قید رہ کر تین سال پہلے فرار ہوکر آیا تھا۔ باکونن کے مقلدین خاص طور پر جنوبی یورپ کے اٹلی اور اسپین وغیرہ ملکوں سے آئے ہوئے تھے، جہاں ابھی بڑی صنعتوں کو فروغ نہیں ہوا تھا۔ مارکس کے مقلدین صنعتی ملکوں سے، خاص طور سے جرمنی سے آئے تھے، جہاں مزدوروں کی حالت اچھی تھی۔ اس طرح مارکس ایک بڑھتے ہوئے، متحد اور کچھ خوش حال مزدور طبقے کا نمائندہ تھا اور باکونن غریب اور غیر منظم مزدوروں اور ذہین اور غیر مطمئن لوگوں کا۔ مارکس کا کہنا تھا کہ جب تک کچھ کر گزرنے کی گھڑی آئے۔ اُس وقت تک صبر کے ساتھ سنگٹھن کو مضبوط کیا جائے اور مزدوروں کو سوشلسٹ نظریوں کی معلومات کرائی جائے۔ باکونن اور اس کے ساتھی فوراً ہی کارروائی کرنے کے حق میں تھے۔ سب باتوں کو دیکھتے ہوئے جیت مارکس کی ہوئی۔ بین الاقوامی مزدور انجمن کا قیام ہوا۔ یہ مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی تنظیم تھی۔

تین سال بعد یعنی ۱۸۶۷ء میں مارکس کی مایۂ ناز تصنیف "کیپٹل" (داس کیپیٹل) جرمن زبان میں شایع ہوئی۔ لندن میں اُس نے کئی سال تک جو عرق ریزی کی تھی یہ اُس کا نتیجہ تھی۔ اس میں اُس نے رائج اقتصادی اصولوں کی تشریح و توضیح کرکے ان کی تنقید کی اور اپنے اشتراکی نظریے کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی۔ یہ ایک سائنٹفک کتاب تھی۔ اس نے ساری غیر متعین اور اونچے نصب العین کی باتوں سے قطع نظر کرکے آزادانہ اور سائنٹفک طریقے سے تاریخ اور اقتصادی زندگی کے ارتقا کی تشریح کی۔ اُس نے خاص طور سے بڑی مشینوں اور صنعتی تہذیب کے ارتقاء پر بحث کی اور اس نے تاریخی ارتقا، تاریخ اور طبقاتی کشمکش کے بارے میں

کچھ دور رس اور مؤثر نتائج اخذ کئے۔ مارکس کا یہ نیا، مکمل، واضح اور مدلل سوشلزم اسی لیے "سائنٹفک سوشلزم" کہلایا، کیوں کہ یہ اُس مبہم اور اونچے آدرش والے سوشلزم سے مختلف تھا جو اب تک رائج تھا۔ مارکس کی "کیپٹل" کوئی معمولی کتاب نہیں ہے۔ اس میں اور تفریح طبع کی دوسری کتابوں میں بیّن فرق ہے۔ پھر بھی یہ اُن تھوڑی سی انی گنی کتابوں میں سے ہے، جنھوں نے بہت سے لوگوں کے سوچنے کے ڈھنگ اور ان کے سارے خیالات اور تصوّرات کو ہی بدل دیا ہے اور اس طرح انسانی ترقّی پر اثر انداز ہوئی ہیں۔

۱۸۷۱ء میں پیرس کیمون کا افسوس ناک حادثہ ہوا۔ بالارادہ کیا جانے والا شاید یہ پہلا اشتراکی انقلاب تھا۔ اس سے یورپ کی حکومتیں خوف زدہ ہو گئیں اور مزدور تحریکوں کی طرف سے ان کا رویّہ سخت ہو گیا۔ دوسرے سال مارکس کی قائم کی ہوئی مزدوروں کی بین الاقوامی انجمن کا اجلاس ہوا۔ مارکس اس کا صدر دفتر نیویارک لے جانے میں کامیاب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مارکس کا مقصد یہی تھا کہ باکونن کے لاحکومیت کے خیال کے ماننے والوں سے پیچھا چھوٹے، دوسری بات شاید یہ بھی تھی کہ چوں کہ پیرس کیمون کی وجہ سے یورپی حکومتوں میں غم و غصّہ تھا اس لیے اُس نے سوچا کہ یہاں کے مقابلے میں نیویارک زیادہ محفوظ جگہ رہے گی مگر انجمن کے لیے اپنے اصل میدان میں کام کرنے والے مرکزوں سے اتنا دُور رہنا ممکن نہیں تھا اس کی ساری طاقت یورپ میں تھی اور یورپ میں بھی مزدور تحریک بُرے دن گزر رہے تھے۔ اس لیے پہلی بین الاقوامی انجمن دھیرے دھیرے ختم ہو گئی۔

مارکس ازم یا مارکس کا سوشلزم یورپ کے سوشلسٹوں میں، خاص طور سے جرمنی اور آسٹریا میں پھیلا، جہاں یہ عام طور پر سماجی جمہوریت (سوشل ڈیماکریسی) کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن انگلینڈ میں اس کا خیر مقدم اتنے تپاک سے نہیں ہوا۔ اس وقت یہ ملک اتنا خوش حال تھا کہ یہاں کسی ترقّی پسند سماجی اصول کے لیے

گنجائش نہیں تھی۔ انگریزی ڈھنگ کے سوشلزم کی نمائندہ فیبئین سوسائٹی تھی جس کے سامنے تدریجی ڈھنگ سے آہستہ آہستہ تبدیلی لانے کا بہت نرم پروگرام تھا۔ فیبئین لوگوں کا مزدوروں سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ تو ترقی پسند اور حوصلہ مند خیالوں والے ذہین طبقے کے لوگ تھے۔

فرانس میں کیمون کے بعد سوشلزم کو دوبارہ پنپنے میں رفتہ رفتہ بارہ سال لگ گئے مگر وہاں اُس کی شکل بالکل نئی ہوگئی۔ یہ تحریک لاحکومیت اور سوشلزم دونوں کے میل کا نتیجہ تھی اسے سینڈیکل اِزم یا کسبی اشتراکیت کہتے ہیں۔

سوشلسٹ اصول یہ تھا کہ چوں کہ ریاست سماج کی نمائندہ جماعت ہے اس لیے پیداوار کے ذرائع، یعنی زمین، کارخانوں وغیرہ پر اسی کی ملکیت اور کنٹرول ہونا چاہیے۔ اختلاف رائے صرف اس بات پر تھا کہ یہ کنٹرول کس حد تک ہو؟ ظاہر ہے کہ چھوٹے چھوٹے اور گھریلو اوزار و آلات جیسی بہت سی ذاتی چیزوں کو سماجی ملکیت بنانا عجیب سی بات ہے۔ مگر اس بات پر سوشلسٹوں میں اتفاق رائے تھا کہ جس چیز کا استعمال دوسروں کی محنت سے نجی فائدہ اٹھانے میں کیا جا سکتا ہے اُسے سماجی ملکیت یعنی سارے قوم کی ملکیت بنا دینا چاہیے۔ لاحکومیت کے حامیوں کی طرح کسبی اشتراکیت یا "سینڈیکل اِزم" کو ماننے والے بھی ریاست کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس کے اختیارات کو کم سے کم کر دینے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر صنعت پر اُس صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کی انجمن کا کنٹرول رہے۔ خیال یہ تھا کہ الگ الگ انجمنیں اپنے اپنے نمائندے چُن کر بڑی مجلس میں بھیجیں گی۔ یہ مجلس سارے ملک کے معاملات کو سنبھالے گی اور بڑے پیمانے پر کام کاج کے لیے ایک طرح کی پارلیمنٹ ہو گی۔ مگر اُسے کسی صنعت کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ہوگا۔ یہ حالات پیدا کرنے کے لیے سینڈکل اِزم کے ماننے والے عام ہڑتال کا پروپگنڈا کرتے تھے۔ یعنی وہ ملک کے کاروبار کو ٹھپ کروا کر اپنا مقصد پورا کرنا چاہتے تھے۔ مارکس کے مقلدین سینڈکل اِزم سے بالکل متفق

نہیں تھے۔ مگر انوکھی بات یہ ہے کہ مارکس کے مرنے کے بعد سینڈکل اِزم کے ماننے والے اُسے اپنی جماعت کا ہی آدمی جتانے لگے۔

کارل مارکس کا ۱۸۸۳ء میں انتقال ہوا۔ اس وقت تک انگلینڈ جرمنی اور دوسرے صنعتی ملکوں میں طاقت ور مزدور انجمنیں بن گئی تھیں۔ برطانیہ کی صنعت کے اچھے دن بیت چکے تھے اور جرمنی اور امریکا کے بڑھتے ہوئے مقابلے میں وہ ٹک نہیں پا رہی تھی۔ امریکا کے پاس البتہ قدرتی وسائل کا خزانہ بھرا پڑا تھا۔ جن سے وہاں تیزی کے ساتھ صنعتی ترقی ہونے میں مدد ملی، جرمنی میں سیاسی مطلق العنانی کے ساتھ کمزور اور بے اختیار پارلیمنٹ کا پردہ بھی لگا ہوا تھا۔ بسمارک کے عہد میں اور اُس کے بعد بھی جرمن حکومت نے صنعت و حرفت کی طرح طرح سے حوصلہ افزائی کی اور مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لیے سماجی اصلاح کے قانون بنا کر مزدور طبقے کو خوش رکھنے کی کوشش کی، اسی طرح انگریزی لبرل پارٹی نے کچھ سماجی قانون پاس کر کے کام کے گھنٹے کم کر دیے اور مزدوروں کی حالت پہلے سے کچھ بہتر کر دی۔ جب تک خوش حالی رہی اُس وقت تک ان تدابیر سے کام چل گیا اور انگریز مزدور امن پسند بنے رہے اور عقیدت مندی کے ساتھ لبرل پارٹی کو ووٹ دیتے رہے۔ مگر ۱۸۸۰ء کے بعد دوسرے ملکوں کے مقابلے نے خوش حالی کے لمبے دور کا خاتمہ کر دیا اور انگلینڈ میں تجارتی کساد بازاری شروع ہوگئی۔ مزدوروں کی اُجرت گھٹ گئی۔ اِس لیے مزدوروں میں پھر بے داری پیدا ہوئی اور فضا میں انقلابی رجحانات پنپنے لگے۔ انگلینڈ میں بہت سے لوگوں کی نگاہیں 'مارکس ازم' کی طرف دوڑنے لگیں۔

ملکہ وکٹوریہ اور اُس کے وزیر اعظم

اُنیسویں صدی دراصل برطانوی عظمت کی صدی تھی۔ اِس صدی کے بیشتر حصّے میں وکٹوریہ انگلینڈ کی ملکہ تھی۔ وہ جرمنی کے ہنوور گھرانے سے تعلّق رکھتی تھی۔ اِس گھرانے نے اٹھارویں صدی میں برطانوی تختِ حکومت کو جارج نام کے کئی بادشاہ دیے۔ وکٹوریہ ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئی۔ اُس وقت وہ ۱۸ سال کی لڑکی تھی۔ اُس نے صدی کے اختتام (سنہ ۱۹۰۰ء) تک یعنی ۶۳ سال تک حکومت کی۔ انگلینڈ میں اس لمبے دَور کو بیشتر دَورِ وکٹوریہ —— (VICTORIAN —— PERIOD) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اِس لیے ملکہ وکٹوریہ نے یورپ میں اور دوسرے ملکوں میں مختلف بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتے دیکھیں۔ اِس نے پُرانے راستے کے مٹتے نشانات اور نئے راستوں کی لکیریں بنتی دیکھیں۔ اُس نے یورپ کے انقلابات، فرانس میں ہونے والی تبدیلیاں اور اٹلی کی سلطنت اور جرمنی کے سامراج کو وجود میں آتے دیکھا۔ موت سے پہلے وہ ایک طرح سے یورپ کے شہنشاہوں کی دادی مانی جانے لگی تھی۔ یورپ میں وکٹوریہ کا ہمعصر ایک اور بادشاہ تھا۔ اُس کی بھی ویسی ہی تاریخ ہے۔ یہ آسٹریا کے ہیپسبرگ شاہی خاندان کا شہنشاہ فرانسس جوزف تھا۔ جب انقلاب کے سال یعنی ۱۸۴۸ء میں وہ اپنے منتشر سامراج کی گدّی پر بیٹھا اُس وقت

اس کی بھی عمر ۸۱ سال کی تھی۔ اس نے ۶۸ سال تک حکومت کی اور کسی نہ کسی طرح آسٹریا، ہنگری اور اپنے ماتحت دوسرے علاقوں کو ایک رشتے میں باندھے رکھا۔ لیکن جنگِ عظیم نے اس کا اور اس کے سامراج کا خاتمہ کر دیا۔

وکٹوریہ اُس سے زیادہ خوش قسمت تھی۔ اپنے دورِ حکومت میں اُس نے انگلینڈ کی طاقت کو بڑھتے ہوئے اور سامراج کو پھیلتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ تخت نشین ہوئی تو کیناڈا میں گڑبڑ مچی ہوئی تھی۔ اس نوآبادی میں کھلی بغاوت ہو رہی تھی اور وہاں کے بہت سے باشندے انگلینڈ سے الگ ہو کر اپنے پڑوسی ملک متحدہ امریکا سے مل جانا چاہتے تھے۔ مگر انگلینڈ نے امریکا کی جنگ سے سبق سیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً ہی کیناڈا والوں کو خود اختیاری کا بہت کچھ حق دے کر مطمئن کر دیا۔ کچھ ہی مدّت میں وہ رفتہ رفتہ مکمّل خود اختیار نوآبادی بن گیا۔ سامراج میں یہ نئے قسم کا تجربہ تھا کیوں کہ آزادی اور سامراج کا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ مگر انگلینڈ کو حالات سے مجبور ہو کر ایسا کرنا پڑا، ورنہ وہ کیناڈا کو کھو بیٹھتا۔ کیناڈا کے زیادہ تر باشندے انگریز نسل کے تھے۔ اس لیے اپنے آبائی ملک کے ساتھ وہ زبردست لگاؤ رکھتے تھے۔ ادھر اس نئے ملک میں لق و دق زرخیز میدان بے کار پڑے ہوئے تھے۔ اس کی آبادی بھی بہت کم تھی۔ اِس لیے اُسے اپنی ترقّی کے لیے انگلینڈ کے تیّار مال پر اور انگریزی سرمایہ پر بہت زیادہ منحصر رہنا پڑتا تھا اس وجہ سے اُس وقت دونوں ملکوں کے مفاد میں کوئی ٹکراؤ نہیں تھا اور ان کے درمیان اپنے ڈھنگ کا نرالا اور نیا رشتہ قائم ہوا۔

اِس صدی میں آگے چل کر غیر انگریزی نوآبادیوں کو خود اختیاری سونپنے کا یہ طریقہ آسٹریلیا میں بھی برتا گیا۔ صدی کے وسط تک جو آسٹریلیا محض قیدیوں کے رکھنے کی جگہ تھی اب وہی صدی کے اخیر میں انگریزی سامراج کے اندر آزاد نوآبادی قرار دے دیا گیا۔

دوسری طرف ہندوستان میں انگریزی شکنجہ اور مضبوط کر دیا گیا اور ملک کے

قبضہ بڑھانے کے لیے جنگ کے بعد جنگ کر کے ہندوستان میں سامراج کو پھیلایا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کچل دی گئی اور ہندوستان کو سامراج کی پوری طاقت کا احساس کرا دیا گیا۔ دراصل ہندوستان میں برطانوی سامراج قائم تھا اور دُنیا کے سامنے اس حقیقت کا اعلان کرنے کے لیے ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کی ملکہ کا خطاب اختیار کیا۔ مگر ہندوستان کے علاوہ دُنیا کے مختلف حصّوں میں اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے ملک انگلینڈ کے ماتحت تھے۔

برطانوی حکومت کی شکل وہ تھی جسے "دستوری شہنشاہیت" یا "تاج شاہی جمہوریت" کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاج دارِ ملک کے پاس اصل اقتدار کچھ بھی نہیں تھا اور وہ پارلیمنٹ کا اعتماد حاصل کی ہوئی وزارت کا صرف ترجمان ہوتا تھا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے وہ وزیروں کے ہاتھ کی کٹھ پُتلی ہوتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ وہ سیاست سے بالاتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیز عقل اور مضبوط ارادہ رکھنے والا کوئی شخص کٹھ پُتلی بن کر نہیں رہ سکتا۔ انگریز شہنشاہوں اور بیگمات کو عوامی معاملات میں دخل دینے کے بہت موقع ملتے ہیں۔ عام طور پر یہ باتیں پسِ پردہ ہوتی ہیں اور عوام کو یا تو کچھ معلوم ہی نہیں ہو پاتا یا اگر معلوم بھی ہوتا ہے تو بہت دِنوں بعد۔ کھلی دست اندازی پر بہت بے اطمینانی پھیل سکتی ہے اور بادشاہت کے لالے پڑ سکتے ہیں۔ دستوری شہنشاہ میں جو خوبی ہونا ضروری ہے وہ ہے معاملہ فہمی۔ اگر یہ خوبی اِس میں موجود ہو تو پھر اس کا کام چل سکتا ہے اور وہ عوامی زندگی پر مختلف طریقے سے اثر انداز ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انگلینڈ میں شاہی دربار نے انگریزوں کے مزاج کو ڈھالنے اور ان میں سماج کی طبقاتی تفریق کو تسلیم کرانے میں بہت اثر ڈالا ہے۔ یا شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جہاں دنیا کے سارے بڑے بڑے ملکوں سے شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا ہے وہاں انگلینڈ میں اس کے کسی طرح بچے رہنے کی وجہ یہی ہے کہ وہاں لوگوں نے اونچے اور نیچے طبقات کے فرق کو تسلیم کر رکھا

ہے۔

برطانوی پارلیمنٹ، پارلیمنٹوں کو جنم دینے والی کہلاتی ہے۔ اس کی زندگی کافی طویل اور عظمت کے لحاظ سے بہت بلند رہی ہے۔ بہت سی باتوں میں بادشاہ کی من مانی اور مطلق العنانیت سے ٹکر لینے میں اس نے سب سے پہلے قدم اٹھایا تھا۔ اس شہنشاہی حکومت کی جگہ پارلیمنٹ کا چندسری اقتدار قائم ہوا، یعنی مٹھی بھر زمیندار اور حکمراں طبقے کی حکومت ہوئی۔ پھر جمہوریت کا جلوس بڑی دھوم دھام کے ساتھ نکلا اور بڑی جدوجہد کے بعد آبادی کی اکثریت کو پارلیمنٹ کی عوامی مجلس (HOUSE OF COMMONS) کے ممبروں کو چننے کا اختیار ملا۔ عمل کے میدان میں اس کا نتیجہ عوام کے "سچے" اقتدار کی شکل میں نہیں نکلا بلکہ دولت مندوں، کارخانہ داروں، مل مالکوں کے ہاتھ میں پارلیمنٹ کی باگ ڈور آگئی۔ عوامی اقتدار کی جگہ سرمائے کا اقتدار قائم ہو گیا۔

برطانوی پارلیمنٹ نے نظم و نسق چلانے اور قانون بنانے کے کام کے لیے ایک عجیب و غریب طریقہ چلایا۔ یہ دو جماعتی طریق کار کہلاتا ہے۔ ان دونوں جماعتوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ان کے اصول بھی مختلف نہیں تھے۔ دونوں دولت مندوں کی جماعتیں تھیں اور اس وقت کے سماجی نظام کو مانتی تھیں۔ ایک جماعت میں پرانے زمیندار طبقے کے لوگ زیادہ تھے تو دوسرے میں دولت مند کارخانہ داروں کی اکثریت تھی۔ مگر یہ ناگ راج اور سانپ راج کا ہی فرق تھا۔ پہلے وہ ٹوری اور وہگ کہلاتے تھے۔ بعد میں انیسویں صدی میں ان کا نام قدامت پسند (CONSERVATIVE PARTY) اور اعتدال پسند (LIBERAL) جماعت پڑ گیا۔

یورپ کے دوسرے ملکوں کے حالات مختلف تھے۔ وہاں بیچ بیچ الگ الگ پروگراموں پر مبنی مختلف مکتبِ خیال کی جماعتیں پارلیمنٹوں کے اندر اور باہر بڑی سرگرمی سے کام کرتی تھیں مگر انگلینڈ میں تو گھر کی سی بات تھی۔

اختلاف بھی ایک طرح کا اشتراک بن گیا تھا اور دونوں جماعتیں باری باری سے
با اقتدار اور مخالف جماعتیں بنتی رہتی تھیں۔ دولت مندوں اور غریبوں کی اصل
کشمکش اور طبقاتی کشمکش پارلیمنٹ میں ظاہر نہیں ہوتی تھی کیوں کہ دونوں ہی
دولت مندوں کی جماعتیں تھیں۔ عوام کو اشتعال دلانے والے نہ تو کوئی مذہبی
سوال تھے اور نہ دوسرے یورپی ممالک کی طرح کے نسلی یا قومی سوال تھے۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں انگلینڈ کی سیاسی جماعتوں کے دو
بڑے رہنما ڈزرائیلی اور گلیڈ اسٹون تھے۔ ڈِزرائیلی جو بعد میں ارل آف بیکنس
فیلڈ ہوگیا، قدامت پسند جماعت کا لیڈر تھا۔ وہ کئی بار وزیر اعظم بنا۔ اس کے
لیے یہ ایک کرامات ہی تھی کیوں کہ وہ یہودی تھا اور یہودیوں کو انگریز پسند نہیں
کرتے۔ لیکن صرف اپنی قابلیت اور جوشِ عمل کی بِنا پر اُس نے اپنے خلاف
تعصبات پر فتح پائی اور وہ راستہ چیر کر سب کے آگے نکل آیا۔ وہ سامراج
پھیلانے کا بہت بڑا حامی تھا۔ وکٹوریہ کو قیصرِ ہند اسی نے بنایا۔ گلیڈ اسٹون
ایک پُرانے دولت مند انگریز گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ وہ اعتدال پسند
جماعت کا رہنما بن گیا۔ وہ کئی بار وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز ہوا۔ جہاں تک
سامراج اور غیر ملکی حکمتِ عملی کا تعلق تھا، گلیڈ اسٹون اور ڈزرائیلی میں کوئی
بنیادی فرق نہیں تھا، مگر ڈزرائیلی اپنی سامراجیت کی بات بے لاگ کہتا تھا۔
اور گلیڈ اسٹون جو اپنے مزاج سے پورا انگریز تھا، اصلیت کو لچھے دار باتوں اور
نیک نصیحتوں کی تہ کر میں لپیٹ دیتا تھا۔ وہ ایسا ظاہر کرتا تھا کہ جو کچھ بھی وہ کرتا
ہے اُس میں خدا ہی اس کا سب سے بڑا مشیر ہوتا ہے۔ بلقان میں ترکوں کے
مظالم کے خلاف اُس نے بہت بڑی تحریک چلائی اور ڈزرائیلی نے صرف
مخالفت کی خاطر ترکوں کی جانب داری کی۔ قصور اس میں اصل میں ترکوں اور
بلقان میں رہنے والی مختلف قوموں دونوں کا ہی تھا۔ دونوں ہی اپنی اپنی باری
پر قتل و غارت گری اور مظالم سے باز نہیں آتے تھے۔

گلیڈ اسٹون نے آیرلینڈ کے لیے حکومتِ خود اختیاری کی بھی حمایت کی۔ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ انگریزوں کی مخالفت اتنی شدید تھی کہ خود اعتدال پسند جماعت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک حصّہ قدامت پسند جماعت سے جا ملا جو اتحاد پسند جماعت کہلانے لگی تھی کیوں کہ یہ لوگ آیرلینڈ کے ساتھ اتحاد کا رشتہ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ "ہوم رول" بل پارلیمنٹ میں گر گیا اور اُسی کے ساتھ گلیڈ اسٹون کا زوال شروع ہو گیا۔ اس کے سات سال بعد ۱۸۹۳ء میں جب گلیڈ اسٹون کی عمر ۸۴ سال کی تھی، وہ دوبارہ وزیرِ اعظم بنا۔ اُس نے دوسری بار "ہوم رول" بل پیش کیا اور وہ ہاؤس آف کامنس میں قلیل اکثریت سے پاس ہوا، لیکن ہاؤس آف لارڈس نے اِس بل کو نامنظور کر دیا۔

اَبراہَم لِنکَن

شمالی امریکا میں غلامی کے دستور کو ختم کرنے کے لیے جو تحریک چلی اس کا روحِ رواں ولیم لائڈ گیری سن تھا۔ ۱۸۳۱ء میں گیری سن نے غلامی کے رواج کے خلاف تحریک کی حمایت کے لیے "لبریٹر" نام کا ایک رسالہ نکالا۔ اس کے پہلے ہی شمارے میں اُس نے یہ بات واضح کر دی کہ اس معاملے میں وہ کوئی سمجھوتا نہیں کرے گا اور نہ کسی قسم کی نرمی برتے گا۔

لیکن یہ باغیانہ جذبہ تھوڑے سے لوگوں تک ہی محدود تھا۔ جو لوگ غلامی کے دستور کے خلاف تھے، ان میں سے بیشتر لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ جہاں غلامی کا دستور رائج ہے وہاں اس میں دخل دیا جائے۔ پھر بھی شمال اور جنوب کے درمیان کشیدگی بڑھتی ہی گئی۔ کیوں کہ اُن کے اقتصادی مفاد جُدا گانہ تھے اور ساحلی ٹیکس کے سوالوں پر خاص طور سے ٹکرا گئے تھے۔

۱۸۶۰ء میں اَبراہم لِنکَن ممالک متحدہ امریکا کا پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔ اس کا انتخاب جنوب والوں کی کنارہ کشی کی نشان دہی کرنے لگا۔ لِنکَن غلامی کے رواج کا دشمن تھا۔ مگر اُس نے اِس کے باوجود اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ جہاں غلامی پہلے سے موجود ہے وہاں اُسے نہیں چھیڑا جائے گا۔ لیکن وہ اِس بات کے لیے بہرحال تیار نہیں تھا کہ یہ دستور نئی ریاستوں میں بھی رائج کیا جائے

یا اسے کوئی قانونی حیثیت دی جائے۔ اس یقین دہانی سے جنوب والوں کو اطمینان نہیں ہوا اور ایک ایک کرکے کئی ریاستیں متحدہ امریکا سے کنارہ کش ہوگئیں۔ متحدہ امریکا کا شیرازہ بکھر جانے کے قریب تھا۔ نئے صدر کے سامنے یہ نہایت تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ اُس نے جنوبی ریاستوں کو اِس طرح کنارہ کش ہونے سے باز رکھنے کی ایک اور کوشش کی۔ انھیں ہر طرح کی یقین دہانی کرائی کہ غلامی کا دستور جاری رہنے دیا جائے گا۔ اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ غلامی کے رواج کو (جہاں جہاں وہ موجود ہے) دستور میں شامل کرکے اُسے مستقل حیثیت دینے کے لیے بھی تیار ہے۔ اصل میں وہ امن و امان برقرار رکھنے کی خاطر کسی بھی حد تک جانے کو رضامند تھا۔ مگر وہ ایک بات منظور نہیں کرسکتا تھا اور وہ تھی متحدہ امریکا وفاق کے شیرازے کا منتشر ہونا۔ کسی ریاست کا وفاق سے کنارہ کش ہونے کا حق وہ قطعی ماننے کو تیار نہیں تھا۔

خانہ جنگی سے بچنے کی لنکن کی ساری کوششیں ناکام رہیں۔ جنوب نے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کرلیا اور گیارہ ریاستیں علیحدہ بھی ہوگئیں۔ ان کے ساتھ کچھ اور پڑوسی ریاستوں کی ہمدردیاں بھی شامل تھیں۔ وفاق سے الگ ہونے والی ریاستیں اپنے آپ کو متحد ریاستیں (کنفیڈریشن اسٹیٹس) کہنے لگیں اور انھوں نے جیفرسن ڈیوس کو اپنا صدر منتخب کرلیا۔ ۱۸۶۱ء کے اپریل میں خانہ جنگی چھڑ گئی اور پورے چار سال تک چلتی رہی۔ اِس خانہ جنگی میں کتنے ہی بھائی اپنے بھائیوں سے اور کتنے ہی دوست اپنے دوستوں سے لڑے۔ جیسے جیسے جنگ کے شعلے پھیلتے گئے بڑی فوجیں کھڑی ہوتی گئیں۔ شمال والوں کے پاس بہت سی سہولتیں تھیں۔ اُن کے پاس دولت بھی زیادہ تھی اور آبادی بھی کافی تھی۔ وہ تیار مال بنانے والا صنعتی علاقہ تھا، اس لیے اُس کے وسائل بہت زیادہ تھے۔ اس کے پاس ریلیں بھی زیادہ تھیں۔ لیکن جنوب والوں کی طرف اچھے سپاہی اور ہوشیار سپہ سالار تھے جن میں جنرل لی خاص تھا۔ اِس لیے

ابتدا میں ساری فتوحات جنوب کے ہاتھ رہیں۔ لیکن آخیر میں جنوب لڑتے لڑتے کمزور ہوگیا۔ شمال کے بحری بیڑوں نے جنوب کا تعلق ان کی یورپ کی منڈی سے منقطع کر دیا اور کپاس اور تمباکو کی برآمد کو روک دیا۔ اس سے جنوب کے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے۔ لیکن اس کا لنکا شائر پر بھی بہت تباہ کن اثر ہوا۔ وہاں کپاس نہ پہنچنے سے بہت سی ملیں بند ہوگئیں۔ لنکا شائر کے مزدور بے کار ہو گئے اور بھاری مصیبتوں میں پڑ گئے۔

اس جنگ میں برطانوی عوام کی ہمدردیاں عام طور سے جنوب والوں کے ساتھ تھیں۔ کم سے کم دولت مند طبقے کی ہمدردیاں تو جنوب والوں کے ساتھ تھیں ہی۔ بائیں بازو کے لوگ شمال والوں کے حق میں تھے۔

خانہ جنگی کی خاص وجہ غلامی نہیں تھی۔ میں کہہ چکا ہوں کہ لنکن آخیر تک یہ یقین دہانی کراتا رہا کہ غلامی کا چلن جہاں پہلے سے موجود ہے وہاں وہ اُسے ماننے کے لیے تیار ہے، اس جھگڑے کی بنیاد تو در اصل جنوب اور شمال کے جدا جدا اور کسی حد تک باہم مخالف اقتصادی مفاد تھے۔ آخیر میں لنکن کو وفاق کے اتحاد کے لیے لڑنا پڑا۔ جنگ چھڑ جانے کے بعد بھی لنکن نے غلامی کے رواج کے بارے میں کوئی قطعی اعلان نہیں کیا، کیوں کہ اُسے اندیشہ تھا کہ شمال میں غلامی کے حق میں جو بہت سے لوگ رائے رکھتے ہیں وہ اس سے بدک نہ جائیں۔ ہاں جیسے جیسے لڑائی چلتی گئی، ویسے ویسے اُس کی رائے میں صفائی اور پختگی آتی گئی۔ پہلے اُس نے یہ تجویز رکھی کہ کانگریس، مالکوں کو معاوضہ دے کر غلاموں کو آزاد کر دے۔ بعد میں اُس نے معاوضہ دینے کا خیال ترک کر دیا اور بالآخر ستمبر ۱۸۶۲ء میں اُس نے جو "آزادی کا اعلان نامہ" نکالا، اس میں یہ اعلان کر دیا کہ ۱۸۶۳ء کی پہلی جنوری سے حکومت سے بغاوت کرنے والی سبھی ریاستوں کے غلام آزاد ہو جانے چاہئیں۔ اس اعلان نامے کو نکالنے کا خاص مقصد شاید یہ تھا کہ وہ جنگ میں جنوب والوں کو کمزور کر دینا چاہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

چالیس لاکھ غلام آزاد ہو گئے اور اِس بات کی یقین کی حد تک امید ہو چلی تھی کہ یہ لوگ "متحد ریاستوں" میں انتشار برپا کر دیں گے۔

جب جنوب والے پست ہو گئے تو ۱۸۶۵ء میں خانہ جنگی ختم ہوئی۔ جنگ تو ویسے بھی خطرناک چیز ہے مگر خانہ جنگیاں اس سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ چار سال کی اِس بھیانک خانہ جنگی کا بار سب سے زیادہ ابراہم لنکن کو برداشت کرنا پڑا اور اس کا جو پھل نکلا وہ بہت کچھ اُس کی مستقل مزاجی اور ہمت کا نتیجہ تھا۔ وہ ساری ناامیدیوں اور مصیبتوں کے باوجود ہمت نہیں ہارا۔ اُسے صرف جیتنے کی ہی دُھن نہیں تھی بلکہ وہ چاہتا تھا کہ جس وفاق کے اتحاد کی خاطر وہ لڑ رہا تھا وہ اوپری اتحاد نہ ہو بلکہ دِلوں کا سچّا اتحاد ہو۔ اس لیے جنگ میں فتح پانے ہی اُس نے شکست خوردہ جنوب والوں کے ساتھ بہت فیّاضانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ لیکن جنگ کے بعد کچھ ہی دن گزرے تھے کہ کسی سرپھرے نے اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا۔

ابراہم لنکن کا شمار امریکا کے بلند حوصلہ بہادروں میں ہے۔ دُنیا کی عظیم شخصیتوں میں اِس کا خاص مقام ہے۔ اس کی پیدائش غریب گھرانے میں ہوئی تھی۔ اُس نے اسکول یا مکتب میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ جو کچھ تعلیم اُس نے حاصل کی وہ بیشتر اُس کی اپنی محنت کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنی اَن تھک محنت کی وجہ سے ایک عظیم سیاست داں اور مقرّر بن گیا اور سخت مصیبتیں جھیل کر وہ اپنے ملک کی نیّا کو طوفان سے باہر نکال لایا۔

لنکن کی موت کے بعد امریکا کی کانگریس نے جنوب کے سفید فاموں کے ساتھ اتنی رواداری نہیں دکھائی، جتنی کہ لنکن دکھاتا۔ ان جنوبی سفید فاموں کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں اور بہتوں کا حق رائے دہندگی تک چھین لیا گیا۔ ادھر حبشیوں کو شہریت کے پورے حقوق دے کر اس بات کو امریکا کے دستور میں شامل کر لیا گیا۔ یہ قانون بھی بنا دیا گیا کہ کوئی ریاست کسی فرد کو اُس کی نسل و رنگ یا پہلے کی غلامی کی وجہ سے

حق رائے دہندگی سے محروم نہیں رکھ سکتی۔

حبشی لوگ اب دستوری اور قانونی حیثیت سے آزاد ہو گئے اور انھیں ووٹ دینے کا حق مل گیا لیکن اِس سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوا کیوں کہ ان کی اقتصادی حالت بدستور گری رہی۔ آزاد کیے گئے حبشیوں کے پاس اپنی کوئی جائداد نہیں تھی اور یہ ایک مسئلہ بن گیا کہ ان کا کیا کیا جائے۔ اُن میں سے کچھ لوگ شمال کے شہروں میں جا بسے لیکن بیشتر اپنی ہی جگہ پر رہے اور وہ جنوب میں اپنے پُرانے گورے مالکوں کی مٹھی میں اُسی طرح دبے رہے۔ وہ پُرانی باڑیوں میں روزانہ مزدوروں کی طرح کام کرتے تھے اور جو مزدوری ان کے گورے مالک دے دیتے تھے وہ انھیں لینی پڑتی تھی۔ جنوب کے سفید فاموں نے تشدّد اور مظالم کے ذریعے حبشیوں کو ہر طرح دبائے رکھنے کے لیے اپنے آپ کو منظم بھی کر لیا۔ انھوں نے "کیو کلکس کلین" نام کی ایک عجیب و غریب خفیہ جماعت بنا لی۔ اس کے ممبر نقاب پہن پہن کر حبشیوں کو ڈراتے پھرتے تھے اور انھیں انتخابات میں ووٹ دینے سے بھی روکتے تھے۔

گزشتہ پچاس سال میں حبشیوں نے کچھ ترقّی کی ہے۔ بہتوں کے پاس کچھ جائداد بھی ہو گئی ہے اور ان کے کچھ اچھے تعلیمی ادارے بھی قائم ہیں۔ پھر بھی وہ یقینی طور پر غلام قوم ہیں۔ متحدہ امریکا میں ان کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ کے قریب یعنی کل آبادی کا تقریباً دسواں حصّہ ہے۔ جہاں ان کی تعداد کم ہے وہاں انھیں برداشت کر لیا جاتا ہے، جیسا کہ شمالی علاقوں میں ہوتا ہے مگر جیسے ہی ان کی تعداد بڑھنے لگتی ہے ان پر مصیبت آجاتی ہے اور انھیں یہ محسوس کرا دیا جاتا ہے کہ ان کی حالت پہلے کے غلاموں سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ ہوٹلوں، ریستورانوں، گرجا گھروں، کالجوں، باغوں، غسل کرنے کے سمندری گھاٹوں، ٹرام گاڑیوں اور دوکانوں تک میں سبھی جگہ انھیں اچھوتوں کی طرح سفید فاموں سے الگ رکھا جاتا ہے۔

کبھی کبھی سفید فاموں اور حبشیوں میں زبردست فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے ہیں۔
جنوب میں اکثر "لینچ" کرنے کی خطرناک وارداتیں ہوتی رہتی ہیں یعنی کسی آدمی پر مجرم ہونے کا شبہہ کرکے ایک ہجوم اسے پکڑ لیتا ہے اور مار ڈالتا ہے۔ انھیں دنوں میں ایسے حادثات بھی ہوئے ہیں کہ سفید فاموں کے جھنڈ کے جھنڈ نے حبشیوں کو کسی ستون سے باندھ کر زندہ جلا دیا۔

یوں تو سارے امریکا میں ہی مگر خاص طور پر جنوبی ریاستوں میں حبشیوں پر اب بھی بہت مصیبتیں ہیں۔ اکثر جب مزدوروں کا ملنا دشوار ہوجاتا ہے تو جنوب کی کچھ ریاستوں میں بے گناہ حبشیوں کو کسی فرضی جرم میں پھانس کر جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور پھر ان قیدی مزدوروں کو خانگی ٹھیکے داروں کو کرایے پر دیا جاتا ہے۔ یہ چیز تو بہت بری ہے ہی، مگر اس کے ساتھ کی کچھ اور باتیں بھی ہیں جو دل کو ہلا دیتی ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ محض قانونی آزادی ہی کوئی بڑی چیز نہیں ہوتی۔

لینن

روس کا ۱۹۰۵ء کا انقلاب بڑی بے رحمی سے دبا دیا گیا تھا زار کی حکومت مطلق العنانیت اور ظلم و تشدد کے اپنے پرانے راستے پر چلتی رہی۔ مارکس وادیوں کو اور خاص طور سے بولشیویکوں کو کچل دیا گیا اور سبھی خاص خاص آدمی جس میں مرد و عورت دونوں شامل تھے یا تو سائبیریا کی تعزیری بستیوں میں تھے یا ملک بدر کر دیے گئے تھے۔ لیکن بیرون ملکوں میں رہنے والے ان مٹھی بھر لوگوں نے بھی لینن کی رہنمائی میں اپنا پروپیگنڈا اور مطالعہ جاری رکھا۔ یہ سب کے سب پکے مارکس وادی تھے۔ لیکن مارکس کا اصول انگلینڈ یا جرمنی جیسے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کے لیے سوچ کر وضع کیا گیا تھا۔ روس ابھی تک قرون وسطیٰ کا زراعتی ملک بنا ہوا تھا۔ اس کے بڑے شہروں میں صنعتوں کا صرف ایک حاشیہ ہی قائم ہوا تھا۔ اس لیے لینن نے مارکسیزم کے بنیادی اصولوں کو اس وقت کے روس کے حالات کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ اس موضوع پر اس نے بہت کچھ لکھا۔ لینن یہ مانتا تھا کہ کوئی کام ہو وہ ماہروں اور جان کاروں کے ذریعے کیا جانا چاہیے۔ اگر انقلاب لانے کے لیے کوشش کرنی تھی تو لینن کی رائے میں پہلے اس کے لیے لوگوں کو پوری طرح تیار کرنا ضروری تھا۔ تاکہ جب عملی کارروائی کا وقت آئے تو وہ صاف طور پر سوچ سکیں کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ لینن اور اس کے ساتھیوں نے ۱۹۰۵ء کے انقلاب کے

کچل دیے جانے کے بعد کے تاریک زمانے کو آئندہ کی کارروائی کے لیے تیار کرنے میں صرف کیا۔

۱۹۱۴ء سے ہی روس کا شہری مزدور طبقہ بیدار ہونے لگا تھا۔ ان میں دوبارہ انقلابی تحریک بیدار ہو رہی تھی۔ بہت سی سیاسی ہڑتالیں ہوئیں اس وقت جنگ چھڑ گئی اور لوگوں کی ساری توجہ اس کی طرف مرکوز ہو گئی اور سب سے زیادہ ترقی پسند مزدور، سپاہی بنا کر مورچوں پر بھیج دیے گئے۔ لینن اور اس کی جماعت نے شروع سے ہی جنگ کی مخالفت کی (اُس وقت بیشتر روسی لیڈر ملک بدر تھے)۔

میدانِ جنگ میں روسی فوجوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ روسی سپہ سالار نااہل تھے۔ روسی سپاہی جن کے پاس اچھے اور مکمل ہتھیار نہیں تھے اور جنھیں اکثر نہ تو گولی بارود ملتی تھی اور نہ بروقت کمک پہنچتی تھی، لاکھوں کی تعداد میں دشمنوں کے سامنے جھونک دیے جاتے اور اس طرح موت کے منہ میں لقمہ بنا دیے جاتے تھے۔ اسی درمیان پیٹرو گراڈ میں اور کچھ دوسرے بڑے شہروں میں زبردست نفع خوری چل رہی تھی۔ سٹہ بازی کا بازار گرم تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر جنگ چلتی رہتی تو اِن کا من چاہا ہو جاتا! لیکن سپاہی، مزدور اور کسان طبقہ (جو سپاہی دیتا تھا) بھوکا، غیر مطمئن اور بہت خستہ حال ہو گیا تھا۔

زار نیکولس بڑا احمق آدمی تھا وہ اپنی ملکہ زارینا کے اثر میں تھا۔ زارینا بھی ویسی ہی احمق مگر اُس سے زیادہ ضدّی تھی۔ ان دونوں نے اپنے چاروں طرف نکموں، لفنگوں اور احمقوں کو جمع کر رکھا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اِن پر انگلی بھی اٹھاتا۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ گری گوری راس پٹن (راس پٹن کے معنی ہیں گندہ کتا) نام کا ایک بے ہودہ غنڈہ زارینا کا منظورِ نظر بن گیا اور زارینا کے توسط سے زار کا بھی۔ راس پٹن ایک غریب کسان تھا، جو گھوڑوں کی چوری کے معاملے میں ماخوذ تھا۔ اس نے پاک بازی کا چولا پہن کر فقیری کا نفع بخش پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

ہندوستان کی طرح روس میں بھی پیسہ کمانے کا یہ آسان دھندا تھا۔ اُس نے اپنے بال بڑھانے شروع کیئے۔ بالوں کے ساتھ اُس کی شہرت بھی بڑھنے لگی، یہاں تک کہ شاہی دربار میں اُس کی رسائی ہوگئی۔ زار اور زارینا کا اکلوتا بیٹا بیماری کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا۔ راس پٹن نے کسی طرح زارینا کو یہ یقین دلادیا کہ وہ اُسے صحت مند بنادے گا۔ بس اُس کی قسمت کھُل گئی اور کچھ ہی دنوں میں زار اور زارینا پر اُس کا رُعب جم گیا۔ بڑے بڑے عہدوں پر تقرر اس کی مرضی سے ہونے لگا۔ اس کی زندگی بدکاریوں سے بھری ہوئی تھی، وہ بڑی بڑی رشوتیں لیتا تھا لیکن اس کے باوجود اُس نے سالہا سال تک اپنا رُعب داب قائم رکھا۔

اس نے سب کے دِلوں میں نفرت پیدا ہوگئی یہاں تک کہ اعتدال پسند لوگ اور اُمراء بھی دبی زبان میں خفگی کا اظہار کرنے لگے۔ شاہی محل کے اندر انقلاب لانے یعنی زار کو زبردستی بدل ڈالنے کا ذِکر بھی چلنے لگا۔ اِسی درمیان زار نیکولس نے خود کو اپنی فوج کا سپہ سالارِ اعظم بنالیا۔ وہ ہر چیز کو تہس نہس کر رہا تھا۔

۱۹۱۶ء کے آخری دنوں میں زار کے خاندان کے ایک شخص نے راس پٹن کو قتل کر ڈالا۔ لوگوں نے ایک بَلا سے نجات پانے کی حیثیت سے اس اقدام کا خیرمقدم کیا لیکن اِس کے بعد زار کی خفیہ پولس کا ظلم و تشدّد اور بھی بڑھ گیا۔

حالات نازک ہونے لگے۔ قحط پڑ گیا اور پیٹرو گراڈ میں غلّے کے لیے بلوے اور فساد ہوگئے پھر مارچ ۱۹۱۷ء کے شروع میں مزدوروں کے دُکھ تکلیف سے غیر متوقع طور پر انقلاب کی آگ یکایک بھڑک اُٹھی۔ ۸ مارچ سے ۱۲ مارچ تک، پانچ دنوں کے اندر اس انقلاب کی شاندار فتح ہوئی۔ یہ کوئی راج محل کا معاملہ نہیں تھا نہ یہ کوئی منظّم اور سوچا سمجھا انقلاب ہی تھا جس کا منصوبہ چوٹی کے لیڈروں نے بہت احتیاط اور دانش مندی سے تیّار کیا ہو۔

انقلاب کی یہ لہر نیچے سے خود بخود اُبھری تھی، جس کا سرچشمہ سب سے زیادہ پِسے ہوئے مزدور تھے۔ یہ انقلاب کسی ظاہرا منصوبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اندھے کی طرح

ٹٹول ٹٹول کر خود اپنا راستہ بنایا تھا۔ بولشیوک پارٹی کے مقامی لوگ اور دیگر انقلابی جماعتیں حیرت میں رہ گئیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس انقلاب کی کس طرح رہنمائی کریں۔ عوام نے خود ہی پہل کی اور جیسے ہی ان لوگوں نے پیٹروگراڈ میں تعینات سپاہیوں کو اپنی طرف بلالیا، انھیں فتح مل گئی۔ اس انقلاب پسند جم غفیر کو تخریب پسندوں کا غیر منظم ہجوم سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ اِس انقلاب کے بارے میں سب سے اہم حقیقت یہ تھی کہ اِس میں تاریخ میں پہلی بار کارخانوں کے مزدور طبقے نے، جسے پرولتاری طبقہ نام دیا گیا ہے، انقلاب کی رہنمائی کی تھی۔ اِن مزدوروں کے ساتھ حالاں کہ اس وقت کوئی اونچے درجے کا رہنما نہیں تھا (لینن اور دوسرے لیڈر یا تو قید تھے یا ملک بدر کر دیے گئے تھے)، پھر بھی اِن میں لینن کی جماعت کے تیار کیے ہوئے بہت سے غیر معروف رضاکار ضرور تھے۔ کارخانوں کے اِن بیسوں اَن جان مزدوروں نے اِس انقلاب کو سہارا دے کر تقویت پہنچائی اور اُسے ایک متعینہ سمت دکھائی۔ یہاں ہم کارخانوں کے لوگوں کی وہ شکل دیکھتے ہیں، جو اِس عملی کارروائی میں سامنے آئی تھی، جس کی مثال دُنیا میں کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملی۔

۸ مارچ کو انقلاب کی پہلی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ عورتیں اس کی رہنمائی کرتی ہیں اور کپڑے کے کارخانوں کی مزدورنیاں باہر نکل آتی ہیں۔ وہ بازاروں میں مظاہرے کرتی ہیں۔ دوسرے دن ہڑتالوں کا زور بڑھ جاتا ہے، بہت سے مزدور بھی کارخانوں کے باہر نکل آتے ہیں۔ روٹی کی پکار مچائی جاتی ہے اور "ظلم و تشدد مُردہ باد" کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ مظاہرین کو کچلنے کے لیے افسران قزاقوں کو بھیجتے ہیں جو بہت پہلے سے ہی زار شاہی کی پشت پناہی کرتے آئے تھے۔ قزاق ہجوم کو دھکے مار مار کر منتشر کرتے ہیں مگر گولیاں نہیں چلاتے۔ مزدور قزاقوں کے اس رویے کی اصلیت کو بھانپ لیتے ہیں کہ وہ لوگ اپنے نقلی سرکاری چہروں کے پسِ پردہ اصل میں اِن سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ اُن کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ اِن کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ قزاقوں سے بھائی چارہ بڑھانے

کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن پولیس سے نفرت کی جاتی ہے اور ان پر پتھر برسائے جاتے ہیں۔ تیسرے دن یعنی ۱۰ر مارچ کو قزاقوں کے ساتھ بھائی چارے کا جذبہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ افواہ پھیل جاتی ہے کہ لوگوں پر گولیاں چلانے والی پولیس نے قزاقوں پر گولیاں چلائیں۔ پولیس بازاروں سے ہٹ جاتی ہے۔ مزدور عورتیں سپاہیوں کے پاس جاتی ہیں اور ان سے دل سوز لہجے میں اپیل کرتی ہیں۔ سپاہیوں کی سنگینیں آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔

اگلا دن، ۱۱ر مارچ، اتوار ہوتا ہے۔ مزدور لوگ شہر کے بیچ میں جمع ہوتے ہیں اور پولیس ان پر خفیہ جگہوں سے گولیاں چلاتی ہے۔ کچھ فوجی سپاہی بھی لوگوں پر گولیاں چلاتے ہیں۔ اِس پر وہ لوگ اس پلٹن کی بارکوں میں جاکر سخت احتجاج کرتے ہیں۔ پلٹن کا دل پسیج اُٹھتا ہے اور وہ اپنے غیر کمیشنی افسروں کی ماتحتی میں عوام کے تحفظ کے لیے نکل پڑتے ہیں، وہ پولیس پر گولیاں چلاتے ہیں۔ پلٹن کو گرفتار کیا جاتا ہے۔ مگر اب حالات قابو سے باہر تھے۔ ۱۲ر مارچ کو بغاوت کی یہ چنگاری دوسری پلٹنوں میں بھی پھیل جاتی ہے اور وہ اپنی بندوقیں اور مشین گنیں لے کر نکل پڑتی ہیں۔ بازاروں میں خوب گولیاں چلتی ہیں۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون کس پر گولی چلا رہا ہے۔ پھر سپاہی اور مزدور جاکر کچھ وزیروں (باقی فرار ہوچکے ہوتے ہیں) پولیس والوں اور خفیہ محکمے کے عملے کو گرفتار کر لیتے ہیں اور جیلوں میں پڑے ہوئے پرانے سیاسی قیدیوں کو رِہا کر دیتے ہیں۔

پیٹرو گراڈ میں انقلاب کو بہت شان دار طریقے سے کامیابی مل چکی تھی۔ جلدی ہی ماسکو نے بھی اِس کی تقلید کی۔ گاؤں کے لوگ ان واقعات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ کسان طبقے نے اِس نظام کو تسلیم کر لیا مگر کچھ زیادہ گرم جوشی کے ساتھ نہیں۔ اس کے لیے تو دو ہی اہم سوال تھے، زمین کا مالک بننا اور امن چین کے ساتھ رہنا۔

زار کا کیا ہوا؟ ہنگاموں سے بھرپور اس دَور میں اِس پر کیا گزری؟ وہ

پیڑوگراڈ میں نہیں تھا۔ وہ وہاں سے بہت دور ایک چھوٹے سے شہر میں موجود تھا۔ جہاں سے سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت سے وہ فوجوں کی کمان سنبھالے ہوئے تھا لیکن اس کا وقت اب پورا ہو چکا تھا، وہ ایک پکے ہوئے پھل کی طرح چپ چاپ بغیر کسی کوشش کے ٹوٹ کر گر پڑا۔ قوت اور عظمت کا نشان زار، روس کا سب سے بڑا مطلق العنان حکمراں جس کے سامنے لاکھوں انسان تھر تھر کانپتے تھے وہ زار یعنی روس کا معصوم باپ تاریخ کے ردّی خانے میں گم ہو گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب ایک نظام اپنا وقت پورا کر چکا ہوتا ہے، تو وہ کس طرح ڈھے جاتا ہے۔ جب زار نے پیڑوگراڈ میں مزدوروں کی ہڑتالوں کا اور دنگے فساد کا حال سُنا تو اس نے فوجی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ فوج کی کمان سنبھالنے والے سپہ سالار نے اس کا اعلان تو کر دیا، مگر یہ اعلان نہ تو شہر میں گشت کرایا گیا اور نہ کہیں اسے آویزاں کیا گیا، کیوں کہ اس کام کو کرنے والا ہی کوئی نہ ملا۔ زار نے اب بھی اِن حادثات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے پیڑوگراڈ کی طرف جانا چاہا۔ ریل کے مزدوروں نے راستے میں اس کی گاڑی روک لی۔ زارینا نے، جو اس وقت پیڑوگراڈ سے باہر ایک بستی میں تھی، زار کو ایک تار بھیجا۔ تار گھر نے اس پر "پانے والے کا پتہ نا معلوم" پنسل سے لکھ کر واپس لوٹا دیا۔

مورچے پر لڑنے والے سپہ سالاروں نے اور پیڑوگراڈ میں رہنے والے اعتدال پسند لیڈروں نے کچھ تو ان واقعات سے خوف زدہ ہو کر اور کچھ اس افراتفری کی نذر ہونے سے جو کچھ بچ سکے، اُسے بچانے کی امید لے کر زار سے تخت و تاج سے دست بردار ہو جانے کی درخواست کی۔ زار نے ایسا ہی کیا اور اپنے ایک رشتے دار کو اپنا وارث مقرر کر دیا۔ لیکن اب کوئی زار نہیں ہونے والا تھا۔ روما نوف کا شاہی خاندان تین سو سال کی مطلق العنان حکومت کے بعد روسی اسٹیج سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

اُمراء، جاگیردار اور اعلیٰ متوسط طبقے اور اعتدال پسند اور اصلاح پسند

لوگ بھی مزدور طبقے کی اس انقلابی چنگاری کو دہشت سے دیکھ رہے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ جس فوج پر وہ بھروسہ کرتے تھے، وہ فوج بھی مزدوروں سے جاملی تو وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار سمجھنے لگے۔ ابھی تک وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے، کہ جیت کس کی ہوگی، کیوں کہ اس بات کا بھی امکان تھا کہ زار مورچے پر سے فوج لے کر پھر آڈٹے اور اس کی مدد سے اس بلوے کو کچل دے۔ اس لیے ایک طرف تو مزدوروں کے خوف نے اور دوسری طرف زار کے ڈر نے اور اسی کے ساتھ اپنی چمڑی بچانے کی فکر نے ان کی حالت بہت غیر بنا دی تھی۔ اِس وقت ایک "دوما" (پارلیمنٹ) موجود تھی۔ جس میں زمیں دار اور اعلیٰ متوسّط طبقے کے نمائندے تھے۔ مزدور بھی کسی حد تک اِسے تسلیم کرتے تھے، لیکن اِس نازک دَور میں کچھ کرنے یا آگے قدم بڑھانے کے بجائے اس کے صدر اور ممبر مارے ڈر کے خاموش بیٹھے رہے اور یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ انھیں کیا کرنا ہے۔

اِسی درمیان سوویت کی شکل بننے لگی۔ مزدوروں کے نمائندوں کے علاوہ سپاہیوں کے نمائندے بھی اس میں شامل کر لیے گئے اور نئی سوویت نے عظیم الشّان شاہی محل کے ایک حصّے پر قبضہ کر لیا، جس کا کچھ حصّہ "دوما" نے گھیر رکھا تھا۔ مزدوروں اور سپاہیوں کا اپنی فتح کی وجہ سے حوصلہ بڑھا ہوا تھا۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اِس فتح کے بعد وہ کیا کریں؟ انھوں نے اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ مگر اس اقتدار کا استعمال کون کرے؟ انھیں یہ بات نہیں سوجھی کہ سوویت خود یہ کام کر سکتی ہے۔ انھوں نے یہ مان لیا کہ متوسط طبقہ ہی اقتدار کا اہل ہے۔ اس لیے سوویت کا ایک وفد پیر گھسیٹتا "دوما" کے پاس یہ کہنے کے لیے گیا کہ وہ انتظامِ حکومت کا کام سنبھال لے۔ دوما کے صدر اور ممبروں نے سمجھا کہ یہ لوگ انھیں گرفتار کرنے آئے ہیں! وہ لوگ اس سے پیدا ہونے والے خطرات سے ڈرتے تھے۔ لیکن کرتے بھی کیا؟ سوویت کے وفد نے اصرار کیا۔ ان لوگوں کو انکار کرتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ اِس لیے ڈرتے ڈرتے دوما کی ایک کمیٹی نے

اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا منظور کر لیا اور باہر کی دُنیا کو یہ معلوم ہوا کہ دعا ہی اس انقلاب کی قیادت کر رہی ہے۔ یہ کچھ عجیب سی بات تھی اگر ہم کسی کہانی میں اسے پڑھیں تو ہمیں یقین نہیں ہو سکتا کہ ایسی باتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اصل واقعات اکثر خیالی قصّوں سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں۔

دوما کی کمیٹی نے جو کام چلاؤ یا عارضی حکومت قائم کی، وہ بہت ہی کٹّر قسم کے لوگوں کی جماعت تھی۔ اس کا وزیر اعظم شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی عمارت کے دوسرے حصّے میں سوویت کی بیٹھکیں ہوتی تھیں اور یہ عارضی حکومت کے کاموں میں برابر رخنہ اندازی کرتی رہتی تھی۔ لیکن ابتدا میں خود سوویت پُرجوش خیال کی حامی نہیں تھی اور اس میں بولشوکوں کی تعداد مُٹھی بھر تھی۔ اس طرح ایک دوعملی قائم تھی یعنی ایک طرف یہ "کام چلاؤ حکومت" تھی اور دوسری طرف "سوویت" اور ان دونوں کے پیچھے انقلاب پسندوں کا جمِ غفیر تھا، جو اس انقلاب کو بروئے کار لایا تھا اور اس سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ نئی حکومت سے، بھوک اور جنگ و جدال سے اُکتائے ہوئے لوگوں کو جو رہنمائی ملی وہ صرف اتنی تھی کہ انھیں جنگ کو اس وقت تک جاری رکھنا چاہیے جب تک وہ جرمنی کو شکست نہ دے لیں۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ کیا اسی کے لیے انھوں نے انقلاب کی مصیبتیں جھیلی تھیں اور زار کو نکال باہر کیا تھا!

ٹھیک اسی وقت، اپریل کو لینن منظرِ عام پر نمودار ہوا۔ جنگ کے شروع سے آخر تک وہ سوئٹزرلینڈ میں رہا تھا اور جیسے ہی اس نے انقلاب کی خبر سُنی وہ روس آنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ مگر وہ آتا کیسے! انگریز اور فرانسیسی اُسے اپنے اپنے ملک سے ہو کر گزرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور نہ جرمنی یا آسٹریا ہی اس کے لیے رضامند تھے۔ بالآخر جرمنی کی حکومت خود اپنے ہی مطلب سے راضی ہو گئی کہ لینن ایک مہر بند گاڑی میں بیٹھ کر سوئٹزرلینڈ کی سرحد سے روسی سرحد تک جرمنی سے ہوتا ہوا گزر جائے۔ انھیں امید تھی، اور یہ امید بالکل بے بنیاد

نہیں تھی کہ لینن کے روس پہنچنے سے "کام چلاؤ حکومت" اور جنگ کی موافقت کرنے والے دوسرے گروہ کمزور پڑ جائیں گے۔ کیوں کہ لینن جنگ کا مخالف تھا اور وہ لوگ اس کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ انھیں یہ خیال نہیں ہوا کہ یہ انجان سا انقلابی بالآخر سارے یورپ کو اور ساری دُنیا کو ہلا ڈالے گا۔

لینن کا ذہن شک و شبہات سے پاک تھا۔ اس کے سامنے کوئی بات غیر واضح نہیں تھی۔ اس کی تیز نظریں عوام کے دِلوں کی تہ تک پہنچ جاتی تھیں۔ اس کا سُلجھا ہوا ذہن سوچے سمجھے ہوئے اصولوں کو تغیر پذیر حالات میں برت سکتا تھا اور اس میں حسب حال تبدیلیاں لا سکتا تھا۔ اس کی مضبوط قوّتِ ارادی فوری نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے سوچے سمجھے راستوں کو پکڑے رہتی تھی۔ جس دن وہ پہنچا اسی دن اس نے بولشوک پارٹی کو جھنجھوڑ ڈالا ان کے ناکارہ پن کی مذمت کی اور پُرجوش جملوں میں انھیں سمجھایا کہ ان کا اصل کام کیا تھا۔ اس کی تقریر برقی لہر تھی جو تڑپا بھی دیتی ہے اور حرارت بھی پیدا کر دیتی ہے۔ جو انقلابی تحریک ابھی تک مناسب رہنمائی اور اچھا رہنما نہ ملنے کی وجہ سے اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھی اُسے بالآخر ایک رہنما مل ہی گیا۔ وقت کے تقاضے نے ایک مناسب حال شخصیت پیدا کر دی تھی۔

لینن کے آتے ہی سارا نقشہ بدل گیا۔ لینن میں رہنمائی کا سچّا جوہر موجود تھا، اس نے فوراً ہی حالات کی نبض پہچان لی اور ایک سچے رہنما کی حیثیت سے مارکس کے پروگراموں کو اُس کے مطابق ڈھال لیا۔ غریب کسان طبقے کے تعاون سے مزدور طبقے کی حکومت قائم کرنے کے لیے اب سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف لڑائی چھیڑی جانے والی تھی۔ بولشوکوں کے اس وقت تین نعرے یہ تھے (۱) عوامی جمہوریہ (۲) زمینداری اور جاگیرداری کا خاتمہ اور (۳) مزدوروں سے دن میں آٹھ گھنٹے کام۔ ان نعروں نے فوراً ہی کسان اور مزدور طبقوں کے سامنے اپنی جدوجہد کا ایک مقصد پیدا کر دیا۔ ان کے لیے اب یہ ایک غیر واضح اور بے بنیاد آدرش نہیں رہا۔ جدوجہد

اب ان کے لیے زندگی اور اُمید کی پیام بر بن گئی۔

لینن کی پالیسی یہ تھی کہ بولشوک لوگ مزدوروں کی اکثریت کو اپنی طرف ملالیں اور اس طرح "سوویت" پر قبضہ کرلیں۔ اور پھر "سوویت" کام چلاؤ حکومت سے اقتدار چھین لے۔ وہ فوراً دوسرے انقلاب کے حق میں نہیں تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ عارضی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا وقت آنے سے پہلے مزدوروں اور سوویت کی اکثریت کو اپنی طرف ملالینا ضروری ہے۔ جو لوگ حکومت کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے تھے ان کی طرف سے اس کا رویہ بہت سخت تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ انقلاب کے ساتھ غداری ہے۔ اتنا ہی سخت رویہ ان لوگوں کے لیے اس نے اختیار کیا تھا جو لوگ مناسب موقع ہاتھ آنے سے پہلے ہی بڑھ کر اس حکومت کو اُلٹ دینا چاہتے تھے۔

"صبر و استقلال کے ساتھ اپنے عزم و ارادے پر مضبوطی سے ڈٹا ہوا اپنے مقصد کی کامیابی کا یقین رکھنے والے سچے عامل کی طرح، برف کا یہ ڈلا اپنے سینے میں دہکتی آگ چھپائے ہوئے اپنی مقررہ منزل کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔"

دونوں فریق کے سمجھوتہ پسند لوگوں نے عارضی حکومت اور سوویت کے درمیان کے جھگڑے کو ٹالنے کی خواہ کتنی کوششیں کی ہوں، مگر یہ جھگڑا رُکنے والا نہیں تھا۔ حکومت اپنے اتحادی مُلکوں کو، جنگ جاری رکھ کر اور روس کے دولت مند طبقہ کو اِن کی ملکیت کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش کرکے، خوش رکھنا چاہتی تھی۔ عوام سے زیادہ ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے سوویت نے کسانوں کے لیے آراضی کی مانگ اور مزدوروں کے لیے دن میں آٹھ گھنٹے کام وغیرہ کے قسم کی مانگوں کو محسوس کرلیا۔ اس طرح ہوا یہ کہ سوویت نے حکومت کو تو بے کار کردیا اور خود سوویت عوام کے ہاتھوں بے کار کر دی گئی۔ کیوں کہ عوام پارٹیوں اور ان کے لیڈروں سے زیادہ انقلابی تھے۔

یہ کوشش بھی کی گئی کہ حکومت سوویت کے ساتھ زیادہ تعاون کرکے چلے اور کرینسکی نام کا ایک انتہا پسند وکیل اور با اثر مقرر حکومت کا خاص رکن بنایا گیا۔

وہ ایک کل جماعتی حکومت بنانے میں کامیاب ہوا اور اس میں سوویت کی اکثریت والی پارٹی مین شیوک پارٹی کے بھی کچھ نمائندے شامل ہوئے۔ اس نے جرمنی کے خلاف ایک زوردار حملہ شروع کر کے انگلینڈ اور فرانس کو بھی خوش کرنے کی جی توڑ کوشش کی۔ مگر یہ دھاوا ناکام رہا کیوں کہ عوام اور فوج اب جنگ سے اکتا چکی تھی۔

اسی وقت پیٹروگراڈ میں کل روسی سوویت کانگریس کے اجلاس ہو رہے تھے اور ہر اجتماع کا رویّہ اپنے پہلے اجلاس سے زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ ان میں دن بہ دن زیادہ تعداد میں بولشوک منتخب ہو کر آنے لگے اور دونوں اہم جماعتوں یعنی مین شیوکوں اور سماجی انقلاب پسندوں (کسانوں کی ایک جماعت) کی اکثریت کم ہونے لگی۔ بولشیوکوں کا اثر بڑھ گیا۔ خاص طور سے پیٹروگراڈ کے مزدوروں میں تو بولشیوکوں کا زبردست اثر قائم ہو گیا۔ سارے ملک میں سوویتیں قائم ہو گئیں اور جب تک سرکاری احکامات پر سوویت کی دستخط شدہ منظوری نہ ہو جاتی اس وقت تک وہ انھیں نہ مانتے۔ "عارضی حکومت" کی کمزوری کی ایک وجہ یہ بھی کہ روس میں کوئی مضبوط متوسط طبقہ نہیں تھا۔

ادھر دارالسلطنت میں اقتدار کے لیے زور آزمائی جاری تھی، اُدھر کسان طبقے نے قانون شکنی شروع کر دی۔ ان کسانوں میں مارچ کے انقلاب کی طرف سے کوئی جوش و خروش نہیں تھا مگر وہ اس کے مخالف بھی نہیں تھے۔ وہ تو خاموش موقعے کی تلاش میں بیٹھے تھے۔ لیکن بڑے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں نے اِس ڈر سے کہ کہیں اِن کی جائدادیں ضبط نہ کر لی جائیں، اُنھیں چھوٹے چھوٹے پٹوں میں تقسیم کر دیا اور انھیں نقلی پٹّے داروں کو اس غرض سے دے دیا کہ انھیں وہ زمینداروں کی امانت کی طرح اپنے پاس رکھیں۔ انھوں نے اپنی بہت سی ملکیتیں غیر ملکیوں کے نام بھی کر دیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی زمینداریوں کو بچانے کی کوششیں کیں۔ کسانوں نے اسے بالکل پسند نہیں کیا اور انھوں نے حکومت سے کہا کہ قانونی احکامات جاری کر کے اس طرح کی زمینوں کا بیع نامہ روک دیا جائے۔ حکومت ٹال مٹول سے کام لینے لگی۔ وہ اس میں کر ہی کیا سکتی تھی، وہ کسی بھی جماعت کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس پر کسانوں نے

خود کارروائیاں کرنی شروع کردیں۔ محاذ سے واپس آئے ہوئے سپاہیوں نے (جو دراصل کسان ہی تھے) اس میں سب سے نمایاں حصّہ لیا۔ یہاں تک کہ کسانوں نے مشترکہ طور پر زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ جون تک اس کے اثرات سائبیریا کے زرخیز میدانوں تک جا پہنچے۔ سائبیریا میں بڑے بڑے زمیندار نہیں تھے۔ اس لیے کسانوں نے گرجوں اور خانقاہوں کی زمینوں پر قبضہ کرلیا۔

یہاں پر قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ بڑی بڑی جاگیروں کی یہ ضبطی کسانوں ہی کی طرف سے شروع ہوئی تھی اور بولشیوک انقلاب سے کئی مہینے پہلے شروع ہوئی تھی۔ لینن چاہتا تھا کہ زمین فوراً باقاعدگی کے ساتھ کسانوں کے نام کردی جائیں۔ وہ بے ڈھنگے اور غیر منظم اور وحشیانہ قسم کے قبضوں کے سخت خلاف تھا۔

لینن کی آمد کے ٹھیک ایک مہینے بعد ایک اور مشہور شخص جو ملک بدر کیا جا چکا تھا، پیٹرو گراڈ واپس آیا۔ یہ ترانسکی تھا۔ جو نیویارک سے واپس آیا تھا۔ راستے میں انگریزوں نے اسے روک لیا تھا۔ ترانسکی نہ تو پرانا بولشیوک تھا اور نہ اب وہ مینشیوک تھا۔ لیکن وہ بہت جلدی لینن کا ہمدرد اور ساتھی بن گیا۔ اس نے پیٹرو گراڈ کی سوویت کے ایک لیڈر کا درجہ حاصل کرلیا۔ وہ ایک اچھا مقرر اور اونچے درجے کا ادیب تھا۔ وہ ایک برقی بیٹری کی طرح تھا۔ جو قوّت و توانائی کا سرچشمہ ہوتی ہے۔

اس طرح پیٹرو گراڈ میں اور روس کے دوسرے شہروں اور گاوؤں میں انقلاب کا دم دم بدلتا ہوا ناٹک چلتا رہا۔ شیر خوار بچّہ بلوغت کی عمر کو پہنچا اور سیانا ہوگیا۔ جنگ کے بھیانک بوجھ کی وجہ سے ہر جگہ اقتصادی نظام درہم برہم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن منافع خور اب بھی جنگ کا منافع کمائے چلے جارہے تھے۔

کارخانوں میں اور سوویتوں میں بولشیوکوں کا اثر دن دن بڑھ رہا تھا۔ اس سے خبردار ہوکر کرینزکی نے انھیں دبا دینے کا ارادہ کیا۔ پہلے تو لینن کو بدنام کرنے کے لیے زبردست دھاوا بولا گیا اور کہا گیا کہ وہ جرمنوں کا ایجنٹ ہے۔ جو

روس والوں کو مصیبت میں پھنسانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ کیا وہ جرمن افسروں کی رضا مندی سے جرمنی میں سے ہو کر سوئزرلینڈ سے نہیں آیا؟ اس سے متوسّط طبقوں میں لینن بہت بدنام ہو گیا اور وہ اُسے مُلک سے بغاوت کرنے والا سمجھنے لگے۔ کرینزکی نے لینن کی گرفتاری کے لیے وارنٹ نکالا۔ لینن اس الزام کو بے بُنیاد ثابت کرنے کے لیے عدالت کے سامنے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھی اس پر راضی نہیں ہوئے، اور انھوں نے اسے روپوش ہو جانے کے لیے مجبور کر دیا۔ بہت سے دوسرے بولشیوک بھی گرفتار کر لیے گئے، اِن کے اخبار بند کر دیے گئے، جن مزدوروں کو ان کا ہمدرد سمجھا جاتا تھا، ان کے ہتھیار چھین لیے گئے، دوکام چلاؤ حکومت" کی طرف سے اِن مزدوروں کا رویّہ دن بدن سخت اور خطرناک ہوتا جارہا تھا اور اس کے خلاف وہ بار بار زبردست مظاہرے کیے جارہے تھے۔

ایک کے بعد ایک واقعات بہت تیزی کے ساتھ رُونما ہو رہے تھے سوویت یقینی طور پر حکومت کی حریف بنتی جارہی تھی۔ اکثر وہ یا تو سرکاری احکامات کو رد کر دیا کرتی تھی یا ان کے برعکس دوسری ہدایات جاری کر دیا کرتی تھی۔ اب اسمولنی انسٹی ٹیوٹ پیٹروگراڈ میں سوویت کا مرکز اور انقلاب کا صدر مقام تھا۔ یہ جگہ اس سے پہلے امراء کی لڑکیوں کا غیر سرکاری اسکول تھا۔

لینن پیٹروگراڈ کے باہر کی بستی میں آگیا اور بولشیوکوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب عارضی حکومت سے اقتدار چھین لینے کا وقت آگیا ہے۔ تمام منصوبہ بہت ہوشیاری سے بنا لیا گیا کہ کن اہم مقامات پر کس وقت اور کس طرح قبضہ کیا جائے۔ بلوے کے لیے نومبر کی ۷ تاریخ مقرر کی گئی۔ اس دن سوویتوں کی کل روسی کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا یہ تاریخ لینن نے مقرر کی تھی۔

۷ر نومبر کا دن آیا اور سوویت سپاہیوں نے جا کر سرکاری عمارتوں پر، خاص طور سے تار گھر، ٹیلیفون گھر اور سرکاری بینک جیسے اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ کسی نے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ ایک برطانوی ایجنٹ نے انگلینڈ کو جو سرکاری رپورٹ

بھیجی تھی، اس میں اس نے لکھا تھا "عارضی حکومت تو جیسے چھو منتر ہو گئی"۔

لینن اس نئی حکومت کا سردار یعنی صدر بنا اور ترانسکی وزیر خارجہ۔ ایک سال کے اندر ہی یہ دوسرا انقلاب بھی کامیاب ہو گیا۔ قابل توجہ بات یہ تھی کہ ابھی تک یہ پُرامن انقلاب تھا۔ اقتدار کی منتقلی میں بہت کم خون خرابہ ہوا۔ مارچ میں اس سے کہیں زیادہ لڑائی اور خون خرابہ ہوا تھا۔ مارچ کی انقلابی تحریک ازخود اٹھی تھی اور غیر منظم تھی۔ نومبر کے انقلاب کا منصوبہ خوب سوچ سمجھ کر بنایا گیا تھا۔ تاریخ میں پہلی بار غریب ترین طبقے، خاص طور سے مزدور طبقے، کے نمائندے کسی ملک کے حکمراں بنے۔ لیکن ان کو اتنی آسانی سے کامیابی ملنے والی نہیں تھی۔ اُن کے چاروں طرف طوفانی بادل منڈلا رہے تھے اور بہت ہیبت ناک شکل میں ان پر برس پڑنے والے تھے۔

لینن اور اس کی بولشیوک حکومت کے سامنے حالات کیا تھے؟ اگرچہ روسی فوج منتشر ہو گئی تھی اور اس کے لڑنے کا کوئی امکان نہیں تھا، مگر پھر بھی جرمنی کے ساتھ لڑائی جاری تھی۔ سارے ملک میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ سپاہیوں اور لٹیروں کے گروہ من مانی کرتے پھر رہے تھے۔ اقتصادی ڈھانچہ ٹوٹ چکا تھا۔ غذائی سامان کی بہت قلت تھی، لوگ بھوکے مر رہے تھے۔ چاروں طرف پرانے نظام کے ٹھیکیدار انقلاب کو کچل ڈالنے کی تاک لگائے بیٹھے تھے۔ اس وقت کی حکومت کی بنیاد سرمایہ داری کے نظام پر تھی اور بیشتر پرانے سرکاری ملازموں نے نئی حکومت سے تعاون کرنے سے گریز کیا۔ ساہوکاروں نے روپیہ دینا بند کر دیا۔ یہاں تک کہ تار گھر بھی تار نہیں بھیجتا تھا۔ یہ ایسے دشوار حالات تھے جو بڑے سے بڑے حوصلہ مند انسان کو دہلا دینے کے لیے کافی تھے۔

لینن اور اس کے ساتھیوں نے اس گاڑی کو چلانے کے لیے مل کر زور لگایا۔ سب سے زیادہ فکر انھیں جرمنی کے ساتھ صلح کی تھی اور انھوں نے فوراً جنگ بندی کا انتظام کیا۔ دونوں ملکوں کے نمائندے بریست لتووسک میں ملے۔ جرمن لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ بولشیوکوں میں لڑنے کی طاقت نہیں رہی ہے اس لیے انھوں نے

غرور اور حماقت میں آکر زبردستی کی بے جا مانگیں رکھیں۔ صلح کے لیے بے حد خواہش مند ہوتے ہوئے بھی بولشیوک لوگ اِس سے حیران رہ گئے اور ان میں سے بہتوں نے ان شرائط کو ٹھکرا دینے کا مشورہ دیا۔ لیکن لینن ہر قیمت پر صلح کے حق میں تھا۔

ادھر تو سوویت صلح کی شرطوں پر بات چیت کر رہی تھی، ادھر جرمنی نے پیٹروگراڈ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ انھوں نے اپنی صلح کی شرطیں پہلے سے بھی زیادہ سخت کر دیں۔ آخیر میں سوویت نے لینن کا مشورہ مان لیا اور مارچ ۱۹۱۸ء میں بریسٹ لتووسک کے معاہدے پر دستخط کر دیے، حالاں کہ وہ اِسے ناپسند کرتی تھی۔ اِس معاہدے کی رُو سے روس کا ایک بہت بڑا علاقہ جرمنی نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ لیکن سوویت کو تو کسی بھی قیمت پر صلح کر لینا منظور تھا، کیوں کہ لینن نے لکھ دیا تھا کہ فوج نے تو اپنی ٹانگوں سے (یعنی میدانِ جنگ سے بھاگ کر) صلح کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔

سوویت نے پہلے تو جنگِ عظیم میں اُلجھے ہوئے تمام ملکوں میں صلح کرانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اقتدار مل جانے کے دوسرے ہی دن اُنھوں نے ایک سرکاری اعلان نکالا، جس میں دنیا کے تمام ملکوں کے سامنے صلح کی تجویز رکھی گئی تھی۔ انھوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ زار کے دورِ حکومت کے تمام خفیہ معاہدوں کے تحت حاصل ہونے والی خصوصی مراعات کے دعووں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قسطنطنیہ ترکوں کے قبضے میں ہی رہنا چاہیے اور اس کے علاوہ بھی کوئی ملک کسی دوسرے ملک کے علاقے کو نہیں ہتھیائے۔ سوویت کی تجویز کا کسی نے جواب نہیں دیا، کیوں کہ جنگ میں اُلجھے ہوئے فریق اپنی اپنی فتح کی امیدیں قائم کیے ہوئے تھے اور دونوں جنگ کی لوٹ میں ہاتھ مارنا چاہتے تھے۔ اِس میں شک نہیں کہ اس تجویز کو پیش کرنے میں سوویت کا مقصد کسی حد تک صرف باہری پروپیگنڈا بھی تھا۔ وہ ہر ملک کے عوام پر اور جنگ سے اُکتائے ہوئے سپاہیوں کی جماعت پر اثر ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد عالم گیر انقلاب تھا وہ سمجھتے تھے کہ اسی طریقے سے وہ خود اپنے

انقلاب کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ سوویت کے اِس پروپیگنڈے کا فرانسیسی اور جرمن فوجوں پر بہت اثر پڑا۔

بریسٹ لتووسک کے معاہدے کو لینن ایک عارضی چیز سمجھتا تھا، جو زیادہ دن ٹکنے والی چیز نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ نو مہینے بعد، جیسے ہی اتحادی ملکوں نے مغربی مورچے پر جرمنی کے دانت کھٹے کیے گئے سوویت نے اِس معاہدے کو رد کر دیا۔ لینن تو صرف یہ چاہتا تھا کہ فوج کے تھکے ہوئے، مزدوروں اور کسانوں کو ذرا دم لینے کا موقع مل جائے تاکہ وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس جاکر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ انقلاب نے کیا بات پیدا کر دی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسان لوگ محسوس کریں کہ زمینداری ختم ہو گئی ہے اور وہ خود دھرتی کے مالک ہیں۔ اس سے وہ انقلاب کی قدر و قیمت سمجھنے لگیں گے اور اس کی حفاظت کی خواہش ان میں پیدا ہو گی۔ بس لینن کا یہی خیال تھا کیوں کہ وہ خوب جانتا تھا کہ خانہ جنگی شروع ہونے والی ہے۔ اس کی یہ پالیسی بعد میں بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ یہ کسان اور مزدور مورچے سے اپنے اپنے کھیتوں اور کارخانوں کو واپس لوٹے۔ وہ بولشیوک یا اشتراکی نہیں تھے، لیکن وہ انقلاب کے زبردست حامی بن گئے، کیوں کہ وہ اُس چیز کو نہیں چھوڑنا چاہتے تھے جو اِس انقلاب نے انھیں فراہم کر دی تھی۔

بولشیوک لیڈر اِدھر تو جرمنی سے کسی نہ کسی طرح صلح کی کوشش کر رہے تھے۔ ادھر انھوں نے اندرونی حالات پر بھی توجہ دینی شروع کی۔ مشین گنوں اور دوسرے فوجی ساز و سامان سے لیس بہت سے سابق فوجی افسر لوٹ مار کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ بڑے بڑے شہروں اور بازاروں میں دن دہاڑے لوٹ مار اور قتل و غارت گری مچا رہے تھے۔ پرانی دہشت پسند جماعتوں کے بھی کچھ ممبر تھے۔ جو سوویتوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور بہت گڑبڑی مچا رہے تھے۔ سوویت افسروں نے اِن ناپسندیدہ واقعات کو دبایا اور ان کا خاتمہ کر دیا۔

سوویت کی حکومت کو اس سے بھی بڑا خطرہ مختلف سرکاری محکموں کے ملازمین کی طرف سے پیدا ہوا، جن میں سے بہتوں نے بولشیوکوں کی ماتحتی میں کام کرنے یا انھیں کسی طرح کا تعاون دینے سے انکار کر دیا۔ لینن نے یہ قاعدہ بنایا کہ "جو کام نہیں کرے گا وہ کھانا بھی نہیں کھائے گا"۔ کام بند تو کھانا بھی بند۔ اس لیے سوویت سے تعاون نہ کرنے والے سرکاری ملازمین کو فوراً برخاست کر دیا گیا۔ ساہوکاروں نے اپنی تجوریاں کھولنے سے انکار کیا تو وہ ڈائنامائٹ سے اُڑا دی گئیں۔ لیکن پُرانے نظامِ حکومت کا ساتھ دینے والے ملازمین کی طرف سے احکامات کی حکم عدولی کی سب سے بڑی مثال اُس وقت دیکھنے میں آئی جب سپہ سالارِ اعظم نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اِسے فوراً برخاست کر دیا گیا اور پانچ منٹ کے اندر کرائی لینکو نام کے ایک نوجوان بولشیوک لفٹیننٹ کو سپہ سالارِ اعظم مقرر کر دیا گیا۔

سوویت حکومت کے پہلے نو مہینوں میں روس کے لوگوں کی زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہیں پیدا ہوا۔ بولشیوکوں نے طعن وطنز اور گالیاں سنیں اور پی گئے۔ بولشیوکوں کے مخالف اپنا اخبار نکالتے رہے۔ جنتا عام طور سے بھوکی مر رہی تھی، لیکن سرمایہ داروں کے پاس عیّاشی کے لیے دولت کا انبار جمع تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں امیر طبقے کے لوگ سوویت حکومت کے خاتمے کی امیدیں لگائے کھلے عام خوشیاں مناتے تھے۔ یہ لوگ، جو پہلے وطن دوستی کا واسطہ دے کر جرمنی کے خلاف جنگ جاری رکھنے کی خواہش رکھتے تھے، اب اپنی راجدھانی پر جرمنوں کا قبضہ ہو جانے کے امکانات پر بہت خوش نظر آتے تھے۔ سماجی انقلاب انھیں جس قدر بُرا معلوم ہوتا تھا اتنا بُرا بیرونی اقتدار نہیں معلوم ہوتا تھا یہ ایک عام بات ہے جو قریب قریب ہمیشہ ہوا کرتی ہے۔ اس وقت خاص طور سے جب کہ طبقات کے مفاد کا معاملہ درپیش ہو۔

اِس طرح عوام کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ حسب سابق زندگی

گذار رہے تھے۔ جب پیٹرو گراڈ پر جرمنوں کا خطرہ بڑھ گیا تھا، اُس وقت سوویت حکومت ماسکو منتقل ہو گئی تھی۔ اسی وقت سے ماسکو دارالسلطنت چلا آرہا ہے۔ اتحادی ملکوں کے سفیر ابھی تک روس ہی میں موجود تھے۔

مگر اس اوپری امن کی تہہ میں کئی طرح کے موافق اور مخالف دھارے بہہ رہے تھے۔ کسی کو بھی، یہاں تک کہ خود بولشیوکوں کو بھی زیادہ دن ٹکنے کی امید نہیں تھی۔ ہر آدمی سازشوں میں لگا ہوا تھا۔ جرمنوں نے جنوبی روس میں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی تھی اور صلح کے باوجود ان کی طرف سے سوویت کو خطرات لاحق تھے۔ اتحادی ملک البتہ جرمنوں سے نفرت کرتے تھے، مگر بولشیوکوں کو وہ اس سے بھی زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہاں امریکہ کے صدر ولسن نے ۱۹۱۸ء کے شروع میں سوویت کانگریس کو دلی مبارکباد کا پیغام بھیجا تھا۔ مگر بعد میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس پر پچھتایا اور اس نے اپنے خیالات بدل دیے۔ غرض یہ کہ اتحادی ملک انقلاب مخالف کارروائیوں کو بہت خاموشی کے ساتھ روپے پیسے اور دوسری طرح کی امداد دے رہے تھے۔ ماسکو غیر ملکی جاسوسوں سے بھرا پڑا تھا۔ برطانوی خفیہ محکمے کا خاص کارکن، جو انگلینڈ میں اپنی جاسوسی کے لیے اُستاد مانا جاتا تھا، سوویت حکومت کو الجھنوں میں ڈالنے کے لیے وہاں بھیجا گیا تھا۔ جن امیروں اور زمینداروں کی زمین اور جائدادیں چھین لی گئی تھیں، وہ لوگ اتحادی ملکوں کے روپیوں کی مدد سے عوام کو مخالف انقلاب کے لیے ورغلا رہے تھے۔

جولائی ۱۹۱۸ء میں روس کے حالات میں حیرت انگیز قسم کے حادثات رُونما ہوئے۔ بولشیوکوں کے چاروں طرف پھیلا ہوا شکنجہ آہستہ آہستہ انھیں جکڑتا جا رہا تھا۔ جنوب میں یوکرین کی طرف سے جرمن چڑھے آ رہے تھے اور ادھر روس میں چیکوسلاوکیہ کے مختلف جنگی قیدیوں کو اتحادی ملک ماسکو پر حملہ کرنے کے لیے اُکسا رہے تھے۔ فرانس میں سارے مغربی محاذ پر جنگِ عظیم ابھی تک جاری تھی۔ لیکن روس میں یہ عجیب و غریب بات دیکھنے میں آئی کہ اتحادی ممالک اور جرمنی دونوں طاقتیں بولشیوکوں

کو کچلنے کے لیے الگ الگ کوشاں تھیں۔ ان طاقتوں نے روس کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جنگ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے تو سوویت کو پریشان کرنے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی تھیں، خاص طور سے انقلاب دشمن عناصر اور ان کے رہناؤں کی حوصلا افزائی کرنا اور انھیں ہتھیاروں اور روپے پیسوں سے مدد دینا۔ زار کے زمانے کے کئی پرانے فوجی سپہ سالار بھی سوویت کے خلاف میدان جنگ میں لڑ رہے تھے۔

زار اور اس کے عزیز و اقارب مشرقی روس میں یورال پہاڑ کے قریب مقامی سوویت کی نگرانی میں قیدی بنا کر رکھے گئے تھے۔ اس علاقے میں چیکوسلاوکیہ کی فوجوں کے چڑھ آنے سے یہ مقامی سوویت ڈر گئی اور اس اندیشے سے کہ کہیں سابق زار قید سے آزاد ہو کر مخالف انقلاب کا زبردست مرکز نہ بن جائے۔ انھوں نے تمام قاعدے قانون کو بالائے طاق رکھ کر زار کے تمام اہل و اقارب کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوویت کی مرکزی کمیٹی اس کے لیے ذمّے دار نہیں تھی اور لینن بین الاقوامی پالیسی کی وجہ سے سابق زار اور اس کے رشتے داروں کو انسانیت کے ناطے قتل کرنے کے خلاف تھا۔ لیکن جب یہ کام تمام ہو ہی گیا تو مرکزی حکومت نے اسے حق بجانب تسلیم کیا۔ شاید اس واقعہ نے اتحادی ملکوں کی حکومتوں میں اور بھی زیادہ بوکھلاہٹ پیدا کر دی اور انھوں نے پہلے سے زیادہ سخت رویّہ اختیار کر لیا۔

اگست میں حالات اور بھی بگڑ گئے۔ دو واقعوں نے غیظ و غضب، مایوسی اور دہشت کو اور بھی بڑھا دیا۔ ان میں سے ایک واقعہ تھا لینن کے قتل کی کوشش اور دوسرا تھا شمالی روس میں آر کھے اوُل پر اتحادی ملکوں کی فوجوں کا اُترنا۔ ماسکو میں بے حد سنسنی پھیل گئی اور سوویتوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ خود ماسکو بھی ایک طرح سے دشمنوں — جرمنوں، چیکوں اور انقلاب دشمن عناصر سے گھرا ہوا تھا۔ ماسکو کے اِرد گرد چند ہی ضلعے سوویت کے انتظام میں رہ گئے تھے اور اتحادی ملکوں کی فوجوں کے اُترنے سے اِن سوویتوں کا خاتمہ بالکل یقینی دکھائی دے رہا تھا۔

بولشیوکوں کے پاس کچھ زیادہ فوج نہیں تھی، بریست لتووسک کے معاہدے کو پانچ ہی مہینے ہوئے تھے اور پرانی فوج کے زیادہ تر سپاہی فوج کو چھوڑ کر کھیتی باڑی میں جا لگے تھے۔ خود ماسکو میں بھی سازشوں پر سازشیں جاری تھیں اونچے طبقے کے لوگ سوویتوں کے خاتمے کے امکانات پر کھلے عام خوشیاں منا رہے تھے۔

نو مہینے کی اس نوزائیدہ سوویت جمہوریہ کی یہ دردناک اور ناگفتہ بہ حالت تھی۔ بولشیوک مایوسی اور خوف سے گھر گئے اور جب انھوں نے دیکھا کہ ہر حالت میں مرنا ہی ہے تو انھوں نے تہیہ کر لیا کہ انھیں لڑتے لڑتے مرجانا چاہیے۔ وہ چاروں طرف سے گھرے ہوئے اس جنگلی جانور کی طرح، جسے نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہ سوجھتا ہو، اپنے دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے رواداری، ہمدردی اور رحم دلی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ سارے ملک میں فوجی قانون نافذ کر دیا گیا اور ستمبر کے شروع میں مرکزی سوویت کمیٹی نے "انقلابیوں کے عہد خوں ریزی" کا اعلان کر دیا ——— "ملک کے تمام غداروں کے لیے موت، غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف خوفناک جنگ" سوویتیں تمام دنیا کے مقابلے میں اور خود اپنے ملک کے انقلاب دشمن عناصر کے خلاف ڈٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ سارا ملک جیسے دشمنوں سے گھری ہوئی چھاؤنی بن گیا۔ سرخ فوج کو پوری طرح منظم کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔

یہ ستمبر اور اکتوبر ۱۹۱۸ء کی بات ہے، جب کہ مغرب میں جرمنی کا فوجی محاذ ٹوٹ رہا تھا اور جنگ بندی کی بات چل رہی تھی۔

۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو اتحادی ملکوں اور مخالف طاقتوں کے درمیان صلح ہو گئی اور جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ لیکن روس میں ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں خانہ جنگی بہت زور شور سے جاری رہی۔ سوویت نے تن تنہا جھنڈ کے جھنڈ دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ ایک وقت تو ایسا تھا جب سوویت فوجوں پر ۱۷ مختلف محاذوں پر ایک ساتھ حملے ہوئے۔ انگلینڈ، امریکہ، فرانس، جاپان، اٹلی، سربیا،

چیکوسلاوکیہ، رومانیہ، بالٹک کی ساحلی ریاست پولینڈ اور بیسیوں انقلاب دشمن روسی سپہ سالار سب کے سب سوویت کے خلاف لڑ رہے تھے۔ یہ لڑائی سائبیریا سے لگا کر بالٹک سمندر اور کریمیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ بار بار یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ سوویت کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ ماسکو بھی خطرے میں پڑ گیا تھا۔ پیڑوگراڈ دشمنوں کے ہاتھوں میں جانے والا ہی تھا مگر سوویت ہر خطرے کو جھیل گئی۔ ہر فتح کے ساتھ اس کا حوصلہ اور اس کی طاقت بڑھتی گئی۔

انقلاب دشمن لیڈروں میں ایک ایڈمرل کولچک تھا۔ وہ خود کو روس کا حکمراں کہنے لگا، اتحادی ملکوں نے اُسے تسلیم بھی کر لیا اور اس کی ہر طریقے سے مدد بھی کی۔ سائبیریا میں اس نے جو حرکت کی اس کا ذکر اس کے فوج کے ساتھی جنرل گریوف نے کیا ہے، جو کولچک کو مدد دینے والی امریکی فوج کا سپہ سالار تھا ——— "بہت خوف ناک قتل و غارت گری ہوئی لیکن جیساکہ دُنیا کو یقین ہے ——— یہ قتل و غارت گری بولشیوکوں نے نہیں کی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ بولشیوکوں کے ہاتھوں ایک آدمی کے قتل کے مقابلے میں بولشیوک دشمنوں نے سینکڑوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تو اِس بات میں ذرا بھی مُبالغہ نہ ہوگا۔"

اتحادی ملکوں نے روس کی ناکہ بندی بھی کر دی اور یہ اتنی کارگر ثابت ہوئی کہ ۱۹۱۹ء کے پورے سال میں روس نہ تو باہر سے کوئی سامان خرید سکا اور نہ اپنا کوئی سامان باہر فروخت کر سکا۔

اِن زبردست مشکلات اور چاروں طرف مختلف طاقت ور دشمنوں کے ہوتے ہوئے بھی روس صحیح سلامت رہا اور اُس نے شان دار فتح حاصل کی۔ یہ بات تاریخ کے سب سے زیادہ حیرت ناک واقعے میں شمار کی جاتی ہے سوویت ایسا کرنے میں کیسے کامیاب ہوئی؟ اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اگر اتحادی ملکوں کی طاقتیں ایک ہو جائیں اور بولشیوکوں کا خاتمہ کرنے پر تُل جاتیں تو

ابتدا ایں انھیں اس میں کامیابی ہو سکتی تھی۔ جرمنی سے نبٹ لینے کے بعد ان کے پاس من مانی کرنے کے لیے بہت بڑی بڑی فوجیں تھیں۔ مگر ان فوجوں سے ہر کہیں کام لینا آسان کام نہیں تھا۔ خاص طور سے سوویتوں کے خلاف۔ یہ سب فوجیں جنگ سے اُکتا چکی تھیں اور اگر ان سے دوسرے ملکوں میں جنگ کرنے کی پھر مانگ کی جاتی تو وہ انکار کر دیتیں۔ اس کے علاوہ مزدوروں میں نئے روس کی طرف سے کافی ہمدردی تھی اور اتحادی ملکوں کی حکومتوں کو اندیشہ تھا کہ اگر وہ سوویتوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیں گی تو انھیں اپنے ملکوں میں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ سارا یورپ انقلاب کی کگر پر کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ تیسری بات یہ کہ اتحادی ملکوں میں آپس میں لاگ ڈانٹ چل رہی تھی۔ صلح ہوتے ہی انھوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ ان سب وجہوں سے وہ بولشیوکوں کا خاتمہ کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اقدام نہیں کر سکیں۔ اس لیے انھوں نے اس کام کو دوسرے طریقوں سے پورا کرنے کی حتی الوسع کوشش کی۔ اپنے لیے انھوں نے دوسروں کو لڑا دیا اور انھیں روپے پیسوں، ہتھیاروں اور ماہرانہ صلاح مشورے سے مدد دی۔ انھیں یقین تھا کہ سوویتیں زیادہ دن ٹک نہیں سکیں گی۔

ان سب باتوں سے سوویتوں کو بلاشبہ مدد ملی اور انھیں اپنی طاقت بڑھانے کا موقع مل گیا۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ ان کی فتح محض خارجی اسباب کا نتیجہ تھی، ان کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ اس کی بنیاد میں دراصل روسی عوام کی خود اعتمادی، مقصد سے لگاؤ، ایثار و قربانی کا جذبہ اور ارادے کی پختگی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو ہر جگہ سست رَد، جاہل، پست ہمت اور بڑے کارناموں کے لیے نااہل سمجھا جاتا تھا۔ کولچاک اور اس کے ساتھیوں کو جو مُنہ کی کھانی پڑی وہ صرف بولشیوک لیڈروں کی قابلیت اور ارادے کی پختگی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ روسی کسانوں نے انھیں برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے نزدیک یہ لوگ پُرانے نظام کے نمائندے تھے جو اس کی نئی نئی حاصل کی ہوئی زمین اور دوسری

مراعات پر ڈاکہ ڈالنے آئے تھے۔ اس لیے انھوں نے مرتے دم تک اس کی حفاظت کرنے کا ارادہ کرلیا۔

مینار کی طرح سب لوگوں سے بلند اور بغیر کسی رُکاوٹ کے اپنا اثر و اقتدار قائم کرنے والا ـــــ ایسا تھا لینن ۔ روسی عوام کے لیے تو اس کا وجود دیوتا کی طرح قابلِ پرستش تھا ۔ وہ امید اور عقیدت کا نشان تھا جو اتنا ذہین اور ذی ہوش تھا کہ ہر مشکل میں اپنے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال سکتا تھا۔ اِس کے قدم کو کوئی بھی چیز ڈگمگا نہیں سکتی تھی اور نہ اس کے ارادے کو بدل سکتی تھی۔

سنہ ۱۹۱۹ء کے آخیر تک خانہ جنگی میں سوویتیں اپنے مخالفوں کے اوپر حاوی آچکی تھیں مگر یہ خانہ جنگی ایک سال تک اور چلتی رہی۔ اس درمیان بہت سی نازک گھڑیاں بھی آئیں ۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں پولینڈ کی روس سے کھٹک گئی۔ دونوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کے آخیر تک یہ تمام لڑائیاں ختم ہو چکی تھیں اور روس کو بالآخر اطمینان کا سانس لینے کا موقع مل گیا تھا۔

اسی درمیان اندرونی دشواریاں زیادہ بڑھ گئیں ۔ مسلسل جنگ، ناکہ بندی، وبا اور قحط نے ملک کی حالت بہت ناگفتہ بہ بنا دی تھی۔ پیداوار بہت کم ہو گئی کیوں کہ جب ایک دوسرے کی مقابل فوجیں ملک کو مسلسل روندر ہی ہوں تو نہ تو کسان کھیت جوت سکتے ہیں اور نہ مزدور کارخانے چلا سکتے ہیں ۔ جنگ کے زمانے میں اشتراکی طریقہ اختیار کرنے سے ملک کسی طرح ان مصیبتوں کو جھیل گیا تھا ، لیکن ہر شخص کو اپنے پیٹ پر کس کر پٹی باندھنی پڑی تھی اور اب اسے مزید برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے پیداوار بڑھانے میں دل چسپی نہیں لے رہے تھے ، کیوں کہ ان کا کہنا تھا کہ فوجی اشتراکیت کے ماتحت ان کی پیدا کی ہوئی ساری فالتو فصل ریاست ہڑپ لے گی۔ اِس لیے وہ محنت کیوں کریں ؟ ایک بہت پیچیدہ اور خطرناک صورتِ حال اور پیدا ہو رہی تھی۔ پیٹروگراڈ کے قریب کرونس تڈ میں بحری جہاز رانوں کی بغاوت بھی ہو گئی تھی اور خود پیٹروگراڈ (یا لینن گراڈ) میں ہڑتالیں

ہو رہی تھیں۔

لینن جس میں بنیادی اصولوں کو حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لینے کی بے مثل صلاحیت موجود تھی اُس نے فوراً کارروائی کی۔ اس نے فوجی اشتراکیت کا خاتمہ کر دیا اور "جدید اقتصادی پالیسی" کے نام سے ایک نئی پالیسی چلائی۔ اس پالیسی کے ذریعے کسان کو فصل پیدا کرنے اور اپنی فصل کو بیچنے کی زیادہ آزادی مل گئی اور کچھ نجی تجارت کی اجازت بھی مل گئی۔ اشتراکیت کے بنیادی اصولوں سے یہ کسی حد تک انحراف تھا، لیکن لینن نے اسے عارضی تدبیر کا نام دے کر روا رکھا۔ اس سے عوام کو اطمینان کا سانس لینے کا یقیناً موقع ملا لیکن جلدی ہی روس کو ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ بارش کی کمی کی وجہ سے جنوبی مغربی روس کے لمبے چوڑے علاقے میں فصل ماری گئی اور بھیانک قحط پڑا۔ تاریخ میں اس سے پہلے اتنا بڑا قحط کبھی نہیں پڑا تھا۔ لاکھوں آدمی بھوکوں مر گئے۔ اس قحط کی وجہ سے حکومت کا سارا نظام درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ کیوں کہ ایک تو یہ قحط برسوں کی مسلسل جنگ، ناکہ بندیوں اور اقتصادی نظام کے انتشار کے فوراً بعد پڑا تھا اور دوسرے اس وقت تک سوویت حکومت کو امن کے زمانے میں اطمینان سے کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مگر اس کے باوجود پہلے ہی کی طرح سوویت حکومت اس مصیبت کو بھی جھیل گئی۔ یورپ کے ملکوں کی حکومتوں کی ایک کانفرنس یہ غور کرنے کے لیے منعقد کی گئی کہ قحط کی مصیبتوں کو دور کرنے کے لیے انھیں کیا مدد دینی چاہیے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ وہ لوگ اُس وقت تک کوئی مدد نہیں دیں گے جب تک کہ سوویت حکومت زار کے اُن پرانے قرضوں کی ادائگی کا وعدہ نہیں کرتی ہے، جسے اس نے رد کر دیا تھا۔ تجارتانہ ذہنیت انسانیت کے جذبے سے زیادہ قوت ور ثابت ہوئی! اور روسی ماؤں کی دردناک اپیل پر جو انھوں نے اپنے بچوں کو موت کے چنگل سے چھڑانے کے لیے کی تھی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

جب انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے ملکوں نے قحط زدہ روس کی مدد کرنے سے

انکار کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ دوسرے معاملات میں روس کا بائیکاٹ کر رہے تھے۔ ۱۹۲۱ء کے شروع میں ہی برطانوی روسی تجارتی معاہدے پر دستخط ہو چکے تھے اور دوسرے ملکوں نے بھی اس کی تقلید کرکے سوویت کے ساتھ تجارتی معاہدے کر لیے تھے۔

چین، ترکی، ایران، افغانستان وغیرہ مشرقی ملکوں کی طرف سوویت نے فیاضانہ پالیسی اختیار کی۔ انھوں نے پرانے زارشاہی استبدادی حقوق ترک کر دیے اور ہمدردانہ سلوک برتنے کی کوشش کی۔ یہ بات سبھی غلام اور دبی اور پسی ہوئی قوموں کی آزادی کے اُصولوں سے مطابقت رکھتی تھی۔ لیکن ان کے لیے اس سے بھی اہم منشا تھا اپنے آپ کو مضبوط بنانا۔ سوویت روس کی اس فیاضانہ پالیسی کی بدولت برطانیہ جیسے سامراجی ملک اپنے آپ کو اکثر پریشان کن حالات میں پاتے تھے۔ مشرقی دنیا کے ملک جب مقابلہ کرتے تھے تو انگلینڈ اور دوسرے سامراجی ملک انھیں بہت ہیچ معلوم پڑتے تھے۔

۱۹۱۹ء میں ایک اور واقعہ ہوا جس کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ واقعہ تھا تیسری بین الاقوامی انجمن کا قیام جسے کمیونسٹ پارٹی نے روس میں قائم کیا تھا۔ بولشیوکوں کا خیال تھا کہ دوسری بین الاقوامی انجمن کا قیام کرنے والی پرانی مزدور اور کمیونسٹ پارٹیوں نے محنت کش طبقے کو دھوکا دیا؛ اس لیے انھوں نے انقلابی نظریے کی حامی تیسری بین الاقوامی انجمن قائم کی "تاکہ سرمایہ دارانہ اور سامراجی قوتوں کے خلاف اور ان موقع پرست سامراجیوں کے خلاف بھی جنگ لڑی جاسکے" جو "بیچ کے راستے" کی پالیسی کے علمبردار تھے۔ اس "بین الاقوامی انجمن" کو "کامنٹرن" (یعنی کمیونسٹ انٹرنیشنل) کہا جاتا ہے۔ مختلف ملکوں میں تبلیغ و اشاعت کے کاموں میں اس نے کافی نمایاں کام انجام دیا ہے۔

جنگ کے بعد مغربی یورپ میں دوسری بین الاقوامی انجمن (محنت کشوں اور کمیونسٹوں کی بین الاقوامی انجمن) کو پھر سے زندہ کیا گیا۔ دوسری اور تیسری بین الاقوامی

انجمنوں کے مقاصد کم از کم اصول کی حد تک تقریباً ایک ہی جیسے ہیں مگر دونوں کا طریقِ فکر اور طرزِ عمل ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے ۔ اور دونوں ایک دوسرے کی کٹر مخالف ہیں ۔ یہ آپس میں تکرار و حجت کرتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے پر حملے کرتی ہیں اور اتنی شدت کے ساتھ کرتی ہیں کہ جتنا اپنے دشمن سرمایہ دارانہ نظام پر بھی نہیں کرتیں ۔ دوسری بین الاقوامی انجمن اب ایک ممتاز انجمن بن گئی ہے اس کے رُکن اکثر یورپین حکومتوں کی وزارت میں شامل ہوتے رہتے ہیں تیسری بین الاقوامی انجمن ایک انقلابی انجمن کی حیثیت سے چلی آرہی ہے اس لیے اسے وہ حیثیت حاصل نہیں ہے ۔

روس کی خانہ جنگی میں شروع سے آخیر تک "سرخ بربریت" یا انقلابیوں کے عہدِ خوں ریزی اور "سفید بربریت" یعنی رجعت پسندوں کے عہدِ خوں ریزی کے درمیان ایک طرح کے مقابلے کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی ۔ اس میں شاید رجعت پسند انقلاب پسندوں سے بازی لے گئے ۔ سائبیریا میں کولچک کے ظلم و تشدد کی داستان پر امریکی سپہ سالار کے تذکرے اور اس کے علاوہ دوسرے تذکرے سُننے پر یہی نتیجہ نکلتا ہے ۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا کہ "سرخ بربریت" بھی کم شدید نہیں تھی اور اس کی وجہ سے بہت سے بے گناہ لوگوں کو ظلم و تشدد کا شکار ہونا پڑا ہوگا ۔ بولشیوکوں پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے وہ چاروں طرف سے سازشوں اور جاسوسوں کے جال میں گھرے ہوئے تھے اس لیے ان کا ذہنی استقلال ختم ہو گیا ذرا بھی شبہہ ہونے پر وہ لوگوں کو سخت سے سخت سزائیں دینے لگے ۔ خاص طور سے ان کی سیاسی پولیس جو "چیکا" کہلاتی تھی، اس بربریت کے لیے بہت بدنام تھی ۔ انھیں ہندوستان کے سی ۔ آئی ۔ ڈی والے سمجھیے، مگر ان کے افسر بہت اونچی حیثیت رکھتے تھے ۔

لینن کے بارے میں کچھ اور باتیں بتانا چاہتا ہوں ۔ اگست ۱۹۱۸ء میں جب اس کے قتل کی کوشش کی گئی تھی ۔ اس وقت وہ بُری طرح زخمی ہوا تھا، مگر اس کے

باوجود اس نے آرام نہیں کیا۔ وہ کام کے زبردست بوجھ کو اٹھائے رہا اس کا لازمی نتیجہ اس کی صحت کی خرابی کی صورت میں نکلا، مئی ۱۹۲۲ء میں اس کی حالت بہت گر گئی۔ کچھ آرام کے بعد وہ پھر کام میں لگ گیا مگر کچھ زیادہ دنوں کے لیے نہیں۔ ۱۹۲۳ء میں اس کی حالت پہلے سے بھی ابتر ہو گئی اور اس کے بعد وہ پھر سنبھالا نہ لے سکا۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۲۴ء کو ماسکو کے نزدیک اس کی موت واقع ہو گئی۔

کئی دن تک اس کی لاش ماسکو میں رکھی رہی۔ سردی کا موسم تھا اور کیمیائی عمل کے ذریعے اس لاش کو سالہا سال تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ جنتا کے نمائندے کسان اور مزدور، مرد عورتیں اور بچے سارے روس سے اور سائبیریا کے دور دراز کے میدانوں سے اپنے اس محبوب رہنما اور ساتھی کو عقیدت کا آخری نذرانہ پیش کرنے آئے، جس نے انھیں گہری کھائی سے کھینچ کر باہر نکالا تھا اور بھرپور زندگی کا راستہ دکھایا تھا۔ انھوں نے ماسکو کے عالی شان "سرخ چوک" میں اس کے لیے سادہ مگر عالی شان مقبرہ بنایا۔ اس کی لاش شیشے کے صندوق میں ابھی تک محفوظ ہے اور ہر شام لوگوں کی ایک لمبی قطار خاموشی کے ساتھ اس کے پاس سے گزرتی ہے۔ لینن کو مرے بہت سال نہیں گزرے ہیں۔ لیکن اس تھوڑی سی مدت میں ہی وہ نہ صرف روس میں بلکہ ساری دنیا میں ایک شان دار تحریک کا روح رواں بن گیا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کی عظمت بڑھتی جاتی ہے۔ دنیا کی زندہ جاوید شخصیتوں میں اس کا شمار ہونے لگا ہے۔ پیٹروگراڈ اب لینن گراڈ ہو گیا ہے اور تقریباً تمام روسی گھروں میں ایک لینن خانہ ہوتا ہے یا کم سے کم لینن کی ایک تصویر ضرور ہوتی ہے۔ لیکن لینن محض اپنی یادگاروں اور تصویروں میں ہی نہیں بلکہ اپنے زبردست کارناموں اور کروڑوں محنت کش عوام کے دلوں میں زندہ ہے۔ جس کی بے مثل زندگی انھیں آج بھی اچھے دنوں کی امید دلاتی ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ لینن انسان نہیں کوئی مشین تھا۔ اور مشین کی طرح ہر وقت وہ اپنے کام میں ڈوبا رہتا تھا اور اس کے علاوہ وہ اور کوئی بات نہیں سوچتا تھا۔

اُسے اپنے منصب اور زندگی کے مقصد سے سچّا لگاؤ ضرور تھا مگر اُس کے ساتھ یہ احساس اس میں بالکل نہیں تھا کہ لوگ اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہیں۔ وہ تو خود فکر کا ایک مجسمہ تھا۔ اس میں انسانیت کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ دل کھول کر ہنسنا اس کی عادت میں داخل تھا۔ وہ اپنی خوش مزاجی کے لیے مشہور تھا۔ سوویت کے خطرات کے دنوں میں ماسکو میں مقیم برٹش ایجنٹ لاک ہارٹ لکھتا ہے کہ لینن ہر حال میں ـــ خوش رہتا تھا۔ اپنی بات چیت اور اپنے کام میں وہ بہت سیدھا اور سچّا تھا، لمبی چوڑی اور لگاوٹ کی باتیں اسے بالکل پسند نہیں تھیں وہ موسیقی کا دل دادہ تھا۔ یہاں تک کہ اسے یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ سنگیت کا جادو کہیں اسے اپنے کام سے بے پرواہ نہ بنا دے۔

عورتوں کے بارے میں ایک بار لینن نے کہا تھا ”جب تک نصف آبادی باورچی خانوں میں غلامی کرتی رہے گی، اس وقت تک کوئی ملک آزاد نہیں ہو سکتا۔“ ایک دن جب کہ وہ اپنے بچوں سے ہنس بول رہا تھا اس نے بہت سچّے کی بات کہی تھی۔ اس کا دیرینہ دوست میکسم گورکی لکھتا ہے کہ اس نے کہا تھا ” ان کی زندگی ہماری زندگی سے زیادہ خوش گوار ہوگی۔ انھیں اُن بہت سی مصیبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جن سے ہم لوگوں کو دوچار ہونا پڑا ہے۔ انھیں اپنی زندگی میں زیادہ تختی نہیں جھیلنی پڑے گی۔“

آخیر میں میں اُس زمانے کے ایک ترانے کے الفاظ پیش کروں گا جو اجتماعی طور پر گانے کے لیے لکھا گیا تھا۔ جن لوگوں نے یہ ترانہ سُنا ہے ان کا کہنا ہے کہ اس کے سنگیت میں غضب کی جان اور قوت ہے اور یہ گیت انقلاب پسند عوام کے جذبات کا صحیح ترجمان ہے۔ اس گیت کا جو ترجمہ (ہندی سے اُردو میں) یہاں دیا جا رہا ہے اس میں بھی اس جذبے کی ایک ہلکی سی جھلک آجاتی ہے۔

یہ ترانہ ”اکتوبر“ کے نام سے مشہور ہے اور اس کا مطلب ہے نومبر ۱۹۱۷ء کا بولشیوک انقلاب۔ ان دنوں روس میں جو پُرانا کلنڈر رائج تھا۔ اُس میں اور

اس وقت کے رائج مغربی کلنڈر میں تیرہ دن کا فرق تھا۔ پرانے روسی کلنڈر کے مطابق مارچ ۱۹۱۷ء کا انقلاب فروری میں ہوا اور اسی وجہ سے وہ "فروری کا انقلاب" کہلاتا ہے۔ اسی طرح نومبر ۱۹۱۷ء کے شروع میں ہونے والا بولشیوک انقلاب "اکتوبر کا انقلاب" کہلاتا ہے۔ اب روس نے اپنا پرانا کلنڈر بدل دیا ہے اور ترمیم شدہ مغربی کلنڈر رائج کر دیا ہے مگر یہ نام ابھی تک چل رہے ہیں۔

ہم کام اور روٹی کی بھیک مانگنے کے لیے گئے
ہمارے دل درد سے چھلنی تھے
کارخانوں کی چمنیاں آکاش کی طرف اشارہ کر رہی تھیں
گویا تھکے ہوئے ہاتھ ہوں جن میں مٹھی باندھنے کی بھی سکت باقی نہ ہو
ہمارے دکھ اور ہمارے درد کی توپوں کی آواز سے بھی زیادہ زوردار
آواز نے خاموشی کو توڑ دیا
اے لینن! تو ہمارے ڈھیٹ پڑے ہاتھوں کی امید ہے
ہم نے سمجھ لیا ہے، لینن! ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہماری قسمت میں ایک لمبی جدوجہد ہے
ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جدوجہد ایک بھیانک جنگ
تو نے آخری لڑائی میں ہماری رہنمائی کی۔ جنگ!
تو نے ہمیں محنت کشوں کی فتح دی
جہالت اور ظلم و تشدد پر ہماری اس فتح کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکے گا
کوئی نہیں! کوئی نہیں! کبھی نہیں! کبھی نہیں۔
آؤ اس جدوجہد میں ہر جوان سورما بن جاؤ
کیوں کہ ہماری فتح کا نام اکتوبر ہے

اکتوبر! اکتوبر!

اکتوبر آفتابِ کامرانی ہے

اکتوبر! انقلابی صدیوں کا عزم مستحکم ہے

اکتوبر! یہ محنت ہے، یہ خوشی ہے، یہ گیت ہے

اکتوبر! یہ کھیتوں اور اوزاروں کے لیے شگون نیک ہے

یہ ہے نئی نسل اور لینن کے جھنڈے پر لکھا ہوا نام۔

ڈی ویلیرا

آئرلینڈ کے بارے میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہوم رول بل جنگِ عظیم کے چھڑنے سے پہلے ہی پاس کر دیا تھا۔ السٹر کے پروٹسٹنٹ لیڈروں اور انگلینڈ کی رجعت پسند پارٹی نے اس کی مخالفت کی تھی اور اس کے خلاف باقاعدہ تحریک شروع کر رکھی تھی۔ اس پر جنوبی آئرلینڈ کے رہنے والوں نے بہ وقت ضرورت السٹر کے خلاف لڑنے کے لیے قومی رضا کاروں کی تنظیم کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آئرلینڈ میں خانہ جنگی رُک نہیں سکتی۔ اسی موقع پر جنگِ عظیم چھڑ گئی اور لوگوں کی ساری توجہ بلجیم اور شمالی فرانس کے میدانِ جنگ کی طرف ہو گئی۔ پارلیمنٹ میں آئرلینڈ کے لیڈروں نے جنگ میں امداد دینے کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کی، مگر ملک میں اس طرف کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی اور وہ کسی طرح کی مدد دینے کے خواہش مند نہیں تھے۔ ادھر السٹر کے "باغیوں" کو برطانوی حکومت میں اونچے اونچے عہدے دے دیے گئے، جس سے آئرلینڈ کے رہنے والے اور بھی ناراض ہو گئے۔

آئرلینڈ میں ناراضگی بڑھنے لگی اور یہ خیال عام ہونے لگا کہ برطانیہ کی لڑائی میں یہاں کے لوگوں کو قربانی کا بکرا بنایا جائے گا۔ جب یہ تجویز منظور کی گئی کہ برطانیہ کی طرح آئرلینڈ میں بھی لام بندی کی جائے اور تمام صحت مند نوجوانوں کو فوج میں جبری طور پر بھرتی کیا جائے تو سارے ملک میں مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی۔

ضرورت پڑنے پر آئرلینڈ والے اِس زبردستی کا طاقت کے زور سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

۱۹۱۶ء کے ایسٹر کے ہفتے میں ڈبلن میں بغاوت ہوئی اور آئری جمہوریہ کا اعلان کیا گیا۔ چند دنوں کی لڑائی کے بعد برطانوی حکومت نے اسے کچل دیا اور بعد میں اِس چند روزہ بغاوت میں حصہ لینے والے آئرلینڈ کے ایک سے ایک بہادر اور ہونہار نوجوانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ یہ بغاوت جو ایسٹر بغاوت کے نام سے مشہور ہے، برطانوی حکومت کو سنجیدگی سے چیلنج دینے والی کوشش نہیں کہی جا سکتی۔ یہ تو دنیا کو محض یہ دکھانے کی دلیرانہ کوشش تھی کہ آئرلینڈ اب بھی آزاد جمہوریہ کا خواب دیکھتا ہے اور اپنی رضامندی سے برطانوی اقتدار کو تسلیم کرنے کو کبھی تیار نہیں ہے۔ دنیا کے سامنے اپنی اِس خواہش کو اُجاگر کرنے کے لیے اِس بغاوت کے علمبردار نوجوانوں نے جان بوجھ کر اپنی زندگی کی قربانی دی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اِس بار ناکام ہونے پر بھی ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ وہ آئرلینڈ کو اپنی آزادی کی منزل کے قریب لائے گی۔

بغاوت تو ناکام رہی مگر اس کی ناکامی ہی اس کی کامیابی تھی۔ اس کے بعد برطانوی حکومت نے جس بے رحمی کا ثبوت دیا اِس کا آئرلینڈ والوں پر بہت گہرا اثر پڑا۔ ظاہر میں تو آئرلینڈ میں کسی طرح کی بے چینی کے آثار نہیں تھے مگر اندر اندر غصے کی آگ دھدھک رہی تھی اور جلدی ہی "شن فین" کی شکل میں یہ آگ بھڑک اُٹھی۔ شن فین کے خیالات تیزی سے مقبول ہونے لگے۔

جنگِ عظیم کے ختم ہونے پر لندن کی پارلیمنٹ کے لیے سارے برطانوی جزیروں میں انتخابات ہوئے۔ آئرلینڈ میں "شن فین پارٹی" نے، انگریزوں کے ساتھ کچھ تعاون کرنے کے حامی پُرانے قوم پرستوں کو ہرا کر پارلیمنٹ کی بہت سی نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ مگر شن فین پارٹی کے لوگوں نے چُناؤ اس لیے نہیں جیتا تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے اجلاس میں حصہ لیں۔ ان کی پالیسی بالکل مختلف تھی۔ وہ تو

عدم تعاون اور بائیکاٹ میں یقین رکھتے تھے۔ اس لیے شن فین پارٹی کے چنے ہوئے لوگ لندن کی پارلیمنٹ میں نہیں گئے اور انھوں نے ۱۹۱۹ء میں ڈبلن میں اپنی جمہوریہ کے لیے علاحدہ سے آئین ساز اسمبلی بنالی۔ انھوں نے آئرش جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا اور اپنی آئین ساز اسمبلی کا نام "دائل آرن" رکھا۔ ان لوگوں نے یہ قدم یہ سمجھ کر اٹھایا تھا کہ یہ اسمبلی السٹر کو شامل کر کے سارے آئرلینڈ کے لیے ہے۔ مگر السٹر والوں کا اس سے الگ رہنا قدرتی بات تھی کیتھولک آئرلینڈ سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ دائل آرن نے ڈی ویلیرا کو صدر اور گریفتھ کو نائب صدر چنا۔ اس وقت نوزائیدہ جمہوریہ کے یہ دونوں رہنما برطانوی جیلوں میں قید تھے۔

اب ایک بالکل نرالے ڈھنگ کی لڑائی شروع ہوئی۔ یہ لڑائی آئرلینڈ اور انگلینڈ کے درمیان پچھلی تمام لڑائیوں سے بالکل مختلف تھی، شن فین کی یہ لڑائی ایک طرح کا عدم تعاون تھا، جس میں کچھ کچھ تشدد بھی شامل تھا۔ انھوں نے برطانوی اداروں کے بائیکاٹ کا پروپیگنڈا کیا اور جہاں ممکن ہوا وہاں اپنے ادارے قائم کر دیے جیسے معمولی عدالتوں کے بجائے پنچایتی عدالتیں۔ گاؤں میں پولیس چوکیوں کے خلاف چھاپہ مار لڑائیوں کا سہارا لیا گیا۔ جیلوں میں بھوک ہڑتالیں کر کے شن فین قیدیوں نے برطانوی حکومت کو بہت تنگ کیا۔ سب سے مشہور بھوک ہڑتال جس نے آئرلینڈ کو تھرّا دیا، کارک شہر کے لارڈ میئر ٹیرنس میک سونی کی ہوئی۔ جب اُسے جیل میں ڈالا گیا تو اس نے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ وہ جیل سے ضرور چھوٹے گا۔ زندہ نہیں چھوٹا تو مر کر چھوٹے گا۔ اس نے بھوک ہڑتال کر دی تہ چھتر دن کی بھوک ہڑتال کے بعد اس کا مردہ جسم جیل سے باہر لایا گیا۔

مائکل کالنس کا شمار، شن فین بغاوت کی چوٹی کے کارکنوں میں کیا جاتا تھا۔ شن فین کے سوچے سمجھے اور عقلمندانہ اقدامات نے آئرلینڈ میں برطانوی نظم و نسق کو بالکل بے جان کر دیا، خاص طور سے دیہاتوں سے اس کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔

رفتہ رفتہ دونوں طرف سے تشدّدانہ اقدامات بڑھتے گئے اور تشدّد کا جواب تشدّد سے دیا جانے لگا ـــــــــ آئرلینڈ میں لڑنے کے لیے مخصوص برطانوی فوجی دستے بھرتی کیے گئے۔ اپنی وردی کے مخصوص رنگ کی وجہ سے یہ دستہ "کالا اور بھورا دستہ" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اِس کالے اور بھورے دستے نے وحشیانہ قتل و غارت گری کا ننگا ناچ شروع کر دیا۔ یہ لوگ شن فینوں کو دہشت زدہ کر کے سر جھکانے پر مجبور کرنے کے لیے کیا کچھ ستم نہیں ڈھاتے تھے۔ ان کو پریشان کرنے کے لیے یہ لوگ سوتے ہوئے لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیتے تھے۔ مگر شن فینوں نے سر نہیں جھکایا اور اپنی چھاپہ مار لڑائی جاری رکھی۔ اِس پر کالے اور بھورے دستے نے بہت بے رحمی سے بدلہ لینے کا طریقہ اختیار کیا اور پورے پورے گاؤں اور شہر کے بڑے بڑے حصّے نذرِ آتش کر ڈالے۔ آئرلینڈ لڑائی کا ایک بڑا میدان بن گیا۔ جس میں دونوں فریق قتل و غارت گری میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگ گئے۔ ایک فریق کی طرف سے تو ایک بہت بڑے سامراج کی منظّم قوت تھی۔ دوسری طرف مٹھی بھر لوگوں کا فولادی عزم تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک دو سال برطانوی آئری جنگ چلتی رہی۔

اِسی درمیان ۱۹۲۰ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے بہت عجلت سے ہوم رول بل پاس کر دیا۔ جنگ سے پہلے پاس کیا ہوا پُرانا دستور، جس کی وجہ سے السٹر میں بغاوت تک کی نوبت آگئی تھی، خاموشی سے منسوخ کر دیا گیا۔ نئے بل کی رو سے آئرلینڈ کے دو حصّے کر دیے گئے۔ ایک تو السٹر یعنی شمالی آئرلینڈ اور دوسرا ملک کا باقی حصّہ۔ اور دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ پارلیمنٹ رکھی گئی۔ آئرلینڈ ویسے ہی چھوٹا ملک ہے اس لیے تقسیم کے بعد یہ دونوں حصّے ایک چھوٹے سے جزیرے کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ شمالی علاقے کے لیے السٹر میں نئی پارلیمنٹ بنا دی گئی مگر جنوب میں یعنی آئرلینڈ کے بقیہ حصّے میں ہوم رول قانون پر کسی نے دھیان ہی نہیں دیا۔ وہ لوگ تو شن فین کی بغاوت میں مصروف تھے۔

اکتوبر ۱۹۲۱ء میں برطانوی وزیر اعظم لائیڈ جارج نے شن فینوں سے جنگ بندی کے سمجھوتے کی اپیل کی تاکہ سمجھوتے کے امکانات پر سوچ بچار کیا جاسکے۔ اس کی بات مان لی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے بڑے ساز و سامان کے سہارے اور سارے آئرلینڈ کو ویران بنا کر انگلینڈ بالآخر شن فینوں کو کچل ہی ڈالتا، مگر برطانیہ اپنی اس پالیسی کی وجہ سے امریکہ اور دوسرے ملکوں میں بہت بدنام ہوتا جارہا تھا۔ اِس بغاوت کو جاری رکھنے کے لیے امریکہ اور برطانوی حکومت کے دوسرے ماتحت ملکوں تک میں رہنے والے آئرش باشندوں نے آئرلینڈ میں خوب ساز و سامان بھیجا۔ اس کے علاوہ شن فین لوگ بھی تھک چکے تھے۔ یہ جنگ ان پر بہت بھاری بوجھ بن گئی تھی۔

برطانوی اور آئرش نمائندے لندن میں ملے اور دو مہینے کے تبادلۂ خیال اور بحث مباحثے کے بعد دسمبر ۱۹۲۱ء میں ایک عارضی سمجھوتے پر دونوں کے دستخط ہوگئے۔ اِس میں آئرش عوام کی قائم کی ہوئی جمہوریہ کو تو تسلیم نہیں کیا گیا، مگر دو ایک باتوں کو چھوڑ کر اس کی رو سے آئرلینڈ والوں کو اُس سے کہیں زیادہ آزادی مل گئی۔ جتنی کسی بھی ماتحت ملک کو ابھی تک حاصل تھی۔ آئرش نمائندے اسے بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی رضامندی اسی وقت دی جب انگلینڈ نے فوری طور پر بھیانک جنگ کی دھمکی کی تلوار اُن کے سر پر چمکائی۔

اس سمجھوتے سے آئرلینڈ میں زبردست کھینچ تان مچی ـــــ کچھ لوگ اس کے حق میں تھے اور کچھ لوگ اس کے مخالف۔ اس سوال پر شن فین پارٹی کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ آخیر میں ڈائل آرن نے اس معاہدے کو تسلیم کر لیا اور آزاد آئرش ریاست قائم ہوگئی جو آئرلینڈ میں سرکاری طور پر " ساؤرستاتھ آرن" کہلاتی ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شن فین پارٹی کے پرانے ساتھیوں کے درمیان خانہ جنگی چھڑ گئی۔ ڈائل آرن کا صدر انگلینڈ کے ساتھ اس معاہدے کے خلاف تھا۔ دوسرے لوگ بھی اس کے مخالف تھے۔ اُدھر مائکل کالنس اور دوسرے لوگ اس کے حق میں تھے۔

یہ خانہ جنگی کئی مہینے تک زوروں کے ساتھ چلتی رہی اور مخالفوں کو دبانے کے لیے اس معاہدے اور آزاد ریاست کے حامیوں کو برطانوی فوجوں نے مدد پہنچائی۔ جمہور پسندوں نے مائکل کالنس کو گولی ماردی اور اس طرح جمہوریت کے حامی لیڈروں کو آزاد ریاست کے حامیوں نے دبادیا۔ ساری جیلیں جمہور پسندوں سے بھر گئیں۔ یہ ساری خانہ جنگی اور آپس کی عداوت آئرلینڈ کی آزادی کی دلیرانہ لڑائی کا بہت ہی افسوس ناک نتیجہ تھا۔

خانہ جنگی رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑگئی مگر جمہور پسند پھر بھی آزاد ریاست کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ جمہور پسند بھی، جو وائل (آزاد ریاست کی پارلیمنٹ) میں چنے گئے تھے اس کے اجلاسوں میں شرکت کرنے سے منکر ہو گئے، کیوں کہ وفاداری کے حلف نامے میں جس بادشاہ کا نام آتا تھا، اُسے تسلیم کرنے سے انھیں انکار تھا۔ اس لیے ڈی ویلیرا اور اس کی پارٹی وائل سے دور رہی۔ آزاد ریاست کی حامی جماعت جس کا صدر کاسگریو تھا، ان کو ہر طرح سے کچلنے کی کوشش میں تھا۔

آئرلینڈ کی آزاد ریاست کے قیام سے برطانیہ کی ساری سامراجی پالیسی پر دُور رَس اثرات مرتب ہوئے۔ آئری معاہدے کی رو سے آئرلینڈ کو اس سے کہیں زیادہ آزادی مل گئی، جتنی اس وقت قانوناً دوسری نوآبادیوں کو حاصل تھیں جیوں ہی آئرلینڈ کو یہ آزادی ملی دوسری نوآبادیوں نے بھی اِسے حاصل کرلیا اور نوآبادیاتی ممالک کے تصور میں کافی تبدیلیاں آگئیں۔ برطانیہ اور نوآباد ملکوں کی جو کانفرنسیں ہوئیں ان سے بھی نوآباد ملکوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی ملنے کا راستہ ہموار ہوا۔ اس طرح نوآباد ملکوں کی حیثیت زیادہ بدل گئی اور ان کی حالت پہلے سے بہتر ہونے لگی اور کامن ویلتھ میں وہ ملک انگلینڈ کے ہم درجہ مانے جانے لگے۔

مگر یہ برابری جتنی تخیلی ہے اتنی عملی نہیں۔ اقتصادی حیثیت سے نوآباد ممالک برطانیہ اور برطانوی سرمائے کے محتاج ہیں اور ان پر اقتصادی دباؤ ڈالنے

کے بہت سے راستے ہیں۔ اسی کے ساتھ جیسے جیسے نوآبادملکوں کی ترقی ہوتی جاتی ہے ان کے اقتصادی مفاد کی برطانوی مفاد سے ٹکر ہونے لگتی ہے۔ اس طرح سامراج رفتہ رفتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔

آئرش معاہدے کا مطلب تھا برطانوی سرمائے کا تسلط کسی حد تک آئرلینڈ پر برقرار رہنا۔ اور جمہوری تحریک کے پسِ پشت اصل جھگڑا ابھی اسی بات پر تھا۔ ڈی ویلیرا اور جمہور پسند لوگ غریب کسانوں، نچلے متوسط طبقے اور پڑھے لکھے غریب طبقے کے لوگوں کے نمائندے تھے۔ کاسگریو اور آزاد ریاست کے حامی خوش حال متوسط اور خوش حال کسانوں کے نمائندے تھے اور ان دونوں طبقوں کے مفاد انگریزی تجارت سے وابستہ تھے۔ اور انگریزی سرمائے کا مفاد ان لوگوں سے وابستہ تھا۔

کچھ دنوں بعد ڈی ویلیرا نے اپنا طریق کار بدلنے کا فیصلہ کیا وہ اور اس کی پارٹی کے دوسرے ممبر ڈائل آئرن میں گئے اور انھوں نے وفاداری کا حلف بھی لے لیا، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ یہ حلف انھوں نے صرف رسم ادائگی کے لیے ہی لیا ہے اور اپنی اکثریت ہونے پر وہ اس سے مکر جائیں گے ۱۹۳۲ء کے شروع میں ہونے والے اگلے انتخاب میں ڈی ویلیرا کو آزاد ریاست کی پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہو گئی اور اس نے فوراً اپنے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ جمہوریت کے لیے لڑائی تو اب بھی جاری تھی مگر لڑائی کا ڈھنگ بدل گیا تھا۔ ڈی ویلیرا نے وفاداری کے حلف کو رد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور برطانوی حکومت کو یہ اطلاع بھیج دی کہ آئندہ سے وہ زمین کے معاوضے کی سالانہ قسط ادا نہیں کرے گا۔ جب آئرلینڈ کی زمینیں بڑے بڑے زمینداروں سے چھینی گئی تھیں، انھیں منہ بولا معاوضہ دیا گیا تھا اور اس کا روپیہ ہر سال ان کسانوں سے وصول کیا جاتا تھا جنھیں یہ زمینیں ملی تھیں۔ ڈی ویلیرا نے اعلان کر دیا کہ آئندہ سے وہ ایک پائی بھی نہیں دے گا۔

یہ خبر ملتی تھی کہ انگلینڈ میں تہلکہ مچ گیا اور برطانوی حکومت سے آئرلینڈ کی ٹھن گئی۔
اوّل تو برطانوی حکومت نے یہ اعتراض کیا کہ ڈی ویلیرا کا وفاداری کے حلف سے مکر جانا سنہ ۱۹۲۱ء کے آئری معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ ڈی ویلیرا نے یہ جواب دیا کہ نو آباد ملکوں کے متعلق جو اعلان کیا گیا ہے اس کے مطابق اگر آئرلینڈ اور برطانیہ ہم درجہ ملک ہیں اور اگر ہر ایک کو اپنے اپنے دستور میں ترمیم کرنے کی آزادی ہے تو یہ ظاہر ہے کہ آئرلینڈ کو اپنے دستور میں سے وفاداری کا حلف بدل دینے یا حذف کرنے کا حق حاصل ہے، اس لیے اب سنہ ۱۹۲۱ء کے معاہدے کی خلاف ورزی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

دوسرے سالانہ قسطوں کے بند ہونے پر تو برطانوی حکومت نے اور زور کے ساتھ اعتراض کیا کہ یہ عہد نامے اور قرض کی واپسی کی ذمّے داری کی بہت بے ہودہ خلاف ورزی ہے۔ ڈی ویلیرا نے اس بات کو نہیں مانا۔ جب سالانہ قسطیں ادا کرنے کا وقت آیا اور وہ ادا نہیں کی گئی تو برطانیہ نے آئرلینڈ کے خلاف ایک نئی جنگ چھیڑ دی۔ یہ لڑائی اقتصادی ناکہ بندی کی تھی۔ انگلینڈ میں درآمد ہونے والے آئری سامانوں پر زبردست ٹیکس لگا دیا گیا۔ تاکہ آئرلینڈ کے کسان تباہ و برباد ہو جائیں اور آئری حکومت معاہدہ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ آئری حکومت نے اس کے جواب میں آئرلینڈ میں آنے والے برطانوی سامان پر درآمد ٹیکس لگا دیا۔ اس اقتصادی لڑائی نے دونوں طرف کے کسانوں اور صنعتوں کو بھاری نقصان پہنچایا۔ مگر قومی وقار اور جھوٹی شان کو ٹھیس لگنے کا خیال دونوں میں سے کسی کو بھی جھکنے نہیں دیتا تھا۔

سنہ ۱۹۳۳ء کے شروع میں آئرلینڈ میں نئے انتخابات ہوئے۔ ان میں ڈی ویلیرا پہلے سے زیادہ کامیاب رہا اور جب انگلینڈ نے دیکھا کہ اس کی اکثریت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے تو انھیں اس پر غصّہ بھی آیا۔ اس کا کھلا مطلب یہ تھا کہ اقتصادی شکنجے کو مضبوط کرنے کی برطانوی پالیسی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

آج ڈی ویلیرا آئری حکومت کا سربراہ ہے۔ وفاداری کا حلف تو کب کا ختم ہو گیا ہے۔ سالانہ قسطوں کی ادائگی ہمیشہ کے لیے بند کردی گئی۔ گورنر جنرل کا پرانا عہدہ بھی ختم کر دیا گیا ہے، جس کی اب کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ ڈی ویلیرا نے اس کی جگہ اپنی جماعت کے ایک آدمی کو مقرر کر دیا ہے۔

مگر ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ڈی ویلیرا اور اس کی جماعت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ السٹر کو شامل کر کے تمام آئرلینڈ کی ایک مرکزی حکومت قائم ہو۔ آئرلینڈ اتنا چھوٹا سا ملک ہے کہ اس کے دو ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے۔ زبردستی سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۱۴ء میں برطانوی حکومت کے اِن اقدامات کی بنا پر بغاوت ہوتے ہوتے بچی تھی اور آزاد حکومت تو السٹر کو مجبور کر ہی نہیں سکتی۔ ایسا کرنے کا اس کا خیال بھی نہیں ہے۔ ڈی ویلیرا کو یقین ہے کہ وہ السٹر کی رضامندی حاصل کرے گا اور اس طرح دونوں کو ایک کر دے گا۔ مگر اس یقین میں حقیقت سے دور خوش فہمی کو زیادہ دخل ہے کیوں کہ پروٹسٹنٹ عقیدے کے ماننے والے السٹر کے لوگوں اور کیتھولک عقیدے کے ماننے والے آئرلینڈ کے درمیان عدم اعتماد کی کیفیت اب تک قائم ہے۔

نوٹ: (۱۹۳۸ء) کچھ سال کی زور آزمائی کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی جنگ ایک باہمی معاہدے کے ذریعے ختم کر دی گئی۔ یہ صلح نامہ جس کے ذریعے سالانہ قسطوں کی ادائگی کا مسئلہ اور روپے پیسے کے لین دین کے دوسرے تمام مسائل حل ہو گئے، آئری آزاد حکومت کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ ڈی ویلیرا نے برطانوی حکومت اور تاج کے ساتھ اپنے بہت سے تعلقات منقطع کر لیے ہیں۔ آئرلینڈ کا نام اب "آئر" رکھ دیا گیا ہے۔ آئر کے سامنے اب سب سے زیادہ ضروری سوال ملک کا اتحاد ہے جس میں السٹر بھی شامل ہو۔ مگر السٹر کے لوگ ابھی راضی نہیں ہوئے ہیں۔

کمال پاشا

۱۹۱۸ء کے آخیر اور ۱۹۱۹ء کے شروع میں ترک لوگ بالکل بے جان ہو گئے تھے۔ ان کے حوصلے پست پڑ چکے تھے۔ انھیں بہت سی مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں۔ جنگِ عظیم کے چھڑنے سے پہلے بلقان کی لڑائی ہوئی تھی اور اس سے بھی پہلے اٹلی کے ساتھ جنگ ہو چکی تھی۔ ترکوں نے ہمیشہ حیرت انگیز صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا ہے مگر آٹھ سال کی مسلسل لڑائی نے ان کی کمر توڑ دی۔ ایسے حالات میں کسی بھی قوم کی کمر ٹوٹ سکتی ہے۔ وہ ساری امیدیں چھوڑ بیٹھے اور اپنے آپ کو بدنصیبی کے حوالے کر کے اتحادی ملکوں کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔

دو سال پہلے جنگ کے دوران میں اتحادی ملکوں نے اٹلی کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کر لیا تھا جس میں اُسے سمرنا اور ایشیا کوچک کا علاقہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کاغذی طور پر قسطنطنیہ روس کی نذر کیا جا چکا تھا اور عرب ممالک کا اتحادی ملکوں نے آپس میں بٹوارہ کر لینا طے کر لیا تھا۔ ایشیا کوچک اٹلی کو حوالے کیے جانے کے بارے میں اس آخری خفیہ معاہدے پر روس کی رضامندی حاصل کرنا ضروری تھی۔ مگر اٹلی کی بدقسمتی کہ ایسا ہونے سے پہلے ہی روس میں بولشیوکوں کے ہاتھ میں اقتدار آگیا۔ اس لیے یہ اقرارنامہ منظور نہ ہو پایا جس کی وجہ سے اٹلی اتحادی ملکوں سے بہت خفا ہوا۔

یہ تھی اس وقت کی صورتِ حال۔ معلوم ہوتا تھا کہ سلطان سے لے کر نیچے تک سارے ترک ختم ہو چکے ہیں۔ "یورپ کا مریض" یعنی ترکی، آخر دم توڑ چکا تھا، کم سے کم نظر یہی آتا تھا۔ لیکن کچھ ترک ایسے بھی تھے جو حالات یا قسمت کے آگے سر جھکانے پر تیار نہیں تھے۔ انھیں اس کی پرواہ تک نہ تھی کہ یہ مقابلہ کتنا حوصلہ شکن ہوگا۔ کچھ دنوں تو وہ لوگ چپ چاپ خفیہ طور پر اپنا کام کرتے رہے۔ وہ ان اسلحہ خانوں سے اسلحہ اور دوسرے فوجی سامان حاصل کرتے رہے جو اصلیت میں اتحادی ملکوں کے قبضے میں تھے۔ ان سامانوں کو وہ جہازوں میں بھر کر بحرِ اسود کے راستے اناطولیہ (ایشیا کوچک) کے اندرونی علاقوں میں بھیجتے رہے۔ ان خفیہ کارکنوں میں مصطفٰے کمال پیش پیش تھا۔

مصطفٰے کمال انگریزوں کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ سلطان بھی، جو پوری طرح انگریزوں کی مٹھی میں تھا، اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر اس نے سوچا کہ کمال کو اندرونی علاقے کے دُور دَراز مقام پر بھیجنے کی چال اس کے حق میں مفید رہے گی۔ اس لیے کمال پاشا کو اناطولیہ کی فوج کا انسپکٹر جنرل بنا کر بھیج دیا گیا۔ سچ پوچھو تو وہاں دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی فوج تھی ہی نہیں اور اصل میں کمال پاشا سے یہ چاہا گیا تھا کہ وہ ترک سپاہیوں سے ہتھیار رکھوانے کا کام کرے۔ کمال کے لیے یہ بہت ہی مناسب موقع تھا۔ اس نے بڑی خوشی سے اسے منظور کر لیا اور فوراً روانہ ہو گیا۔ اس کا فوراً چلا جانا اچھا ہی ہوا، کیوں کہ اِس کے چلے جانے کے کچھ ہی گھنٹے کے بعد سلطان کا ارادہ بدل گیا۔ کمال کے خوف نے اُسے یکایک آدبایا اور آدھی رات گئے اس نے انگریزوں کے پاس خبر بھیجی کہ وہ کمال کو روک لیں۔ مگر اب چڑیا اُڑ چکی تھی۔

کمال پاشا اور کچھ گنے چُنے دوسرے ترک اناطولیہ میں بغاوت کی تیاری کرنے لگے۔ شروع شروع میں وہ خاموشی اور احتیاط کے ساتھ کام کرتے رہے۔ وہ وہاں

تعینات فوجی افسروں کو اپنی طرف ملانے کی کوشش کرنے لگے۔ ظاہرا طریقے پر وہ سب سلطان کے کارکنوں کی طرح کام کرتے تھے مگر قسطنطنیہ سے ملنے والے احکامات پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ حالات اُن کے لیے سازگار ہوتے جارہے تھے۔ کاکیشیا میں انگریزوں نے آرمینیہ کی جمہوریہ قائم کی تھی اور ترکی کا مشرقی صوبہ اس میں ملا دینے کا وعدہ کیا تھا (آج کل آرمینیہ کی جمہوریہ سوویت روس کا حصہ ہے) آرمینیا اور ترکوں میں گہری عداوت تھی اور گزرے ہوئے برسوں میں دونوں میں خوب خون خرابہ ہو چکا تھا۔ جب تک ترکوں کا اقتدار تھا اس وقت تک اس خونی کھیل میں ہر بار ان کی ہی جیت ہوتی رہی، خاص طور سے عبدالحمید کے دورِ حکومت میں۔ اس لیے اب ترکوں کو آرمینی جمہوریہ کے ماتحت رکھنے کا کھلا مطلب ان کی بربادی کی دعوت تھا۔ اس طرح کی موت سے انھوں نے لڑکر مرنے کو ترجیح دی۔ اب اناطولیہ کے مشرقی صوبے کے ترک کمال پاشا کی ولولہ خیز اپیلوں پر لبیک کہنے کو تیار تھے۔

اِسی درمیان ایک دوسرا اہم واقعہ ہوا جس نے ترکوں کو جگا دیا۔ ۱۹۱۹ء کے شروع میں اطالوی لوگوں نے ایشیا کوچک میں اپنی فوج اُتار کر فرانس اور برطانیہ کے ساتھ کیے گئے اپنے اُس خفیہ معاہدے کو پورا کرنا چاہا، جو اب تک عمل میں نہیں آسکا تھا۔ انگلینڈ اور فرانس نے اِس اقدام کو بالکل پسند نہیں کیا۔ اس وقت وہ اطالوی لوگوں کو بڑھاوا نہیں دینا چاہتے تھے۔ جب انھیں اور کوئی بات نہیں سوجھی تو وہ اس پر رضامند ہو گئے کہ سمرنا پر یونانی فوج قبضہ کرلے جس سے اطالوی لوگوں کی پیش بندی ہو جائے۔

اس کام کے لیے یونان کو کیوں پسند کیا گیا؟ فرانسیسی اور انگریز فوجی جنگ سے اُکتا گئے تھے، وہ بغاوت پر آمادہ تھے۔ وہ فوجی خدمت سے سُبک دوش ہونا چاہتے تھے اور جتنی جلد ہو سکے گھر لوٹ جانا چاہتے تھے۔ یونان والے اس کے لیے آمادہ تھے اور یونانی حکومت ایشیا کوچک اور قسطنطنیہ دونوں کو اپنی سلطنت میں

ملانے اور اس طرح قدیم بزنطینی سامراج کو زندہ کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ اس وقت انگلینڈ کے وزیر اعظم لائڈ جارج کی اتحادی ملکوں کے گروہ میں بہت بڑی حیثیت تھی۔ یونان کے دو بہت قابل آدمی لائڈ جارج کے دوست تھے۔ ان میں ایک تو یونان کا وزیر اعظم وینیزیلوس تھا اور دوسرا سر ویسیل ژراف کے نام سے مشہور ایک عجیب وغریب اور پُراسرار قسم کا انسان تھا۔ اس کا اصل نام بیسی لی اوس زکریاس تھا۔ ۱۸۷۷ء میں جب کہ یہ ابھی نوجوان ہی تھا ہتھیار بنانے والی ایک انگریز کمپنی کا بلقان میں ایجنٹ بن گیا تھا۔ جب جنگِ عظیم ختم ہوئی تو یہ سارے یورپ میں اور شاید ساری دنیا میں سب سے امیر آدمی تھا۔ اور بڑے بڑے سیاست داں اور حکومتیں اس کی عزت کرنے میں اپنی شان سمجھتی تھیں۔ اسے اونچے اونچے انگریزی اور فرانسیسی خطابات سے نوازا گیا۔ یہ بہت سے اخباروں کا مالک تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ پسِ پردہ یہ حکومتوں پر پورا اثر ڈالتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو یہ یقین ہے کہ شروع سے ہی وہ برطانوی خفیہ محکمے کا آدمی تھا۔ اس سے اُسے اپنے کاروبار اور سیاست کو چمکانے میں بہت مدد ملی اور بار بار ہونے والی جنگوں سے اس نے کروڑوں کا منافع کمایا۔

اس انتہاء دولت مند اور پُراسرار شخص اور وزیر اعظم وینیزیلوس نے لائڈ جارج کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ یونانی سپاہی ایشیا کوچک میں بھیج دیے جائیں۔ ژراف اس کارروائی کا پورا خرچ برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

یونانی سپاہی انگریزی جہازوں میں سمندر پار کر کے ایشیا کوچک پہنچے اور مئی ۱۹۱۹ء میں انگریزی، فرانسیسی اور امریکی جنگی جہازوں کی حفاظت میں سمرنا پر اُترے۔ ان سپاہیوں نے جو ترکی کے لیے اتحادی ملکوں کا نذرانہ تھے فوراً ہی بڑے پیمانے پر قتل وغارت گری شروع کر دی۔ وہاں دہشت کی ایسی فضا بن گئی کہ جنگ کی لپیٹ میں دنیا کا خوابیدہ ضمیر بھی تھرّا اُٹھا۔ خود ترکی میں تو اس کا بہت ہی بُرا اثر پڑا۔ کیوں کہ ترکوں کو پتہ لگ گیا کہ اتحادی ملکوں کے ہاتھوں ان کی

کیا درگت ہونے والی ہے۔ اور پھر اپنے پرانے دشمن اور ماتحت یونانیوں کے ہاتھوں اس طرح کا تشدّد آمیز برتاؤ کیا جانا! ترکوں کے دل میں غم و غصّے کی آگ بھڑک اٹھی اور قومی تحریک زور پکڑنے لگی۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اگرچہ کمال پاشا اس تحریک کا علمبردار تھا، مگر در اصل سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ ہی اس کے وجود میں آنے کا سبب تھا۔ بہت سے ترکی افسر جو اس وقت تک ڈانواڈول تھے، اس تحریک میں شریک ہو گئے۔

ستمبر ۱۹۱۹ء میں اناطولیہ کے سواس نامی مقام پر چنے ہوئے نمائندوں کی ایک کانگریس ہوئی۔ اس نے بغاوت کی اس نئی تحریک پر منظوری کی مہر ثبت کر دی اور کمال پاشا کی صدارت میں ایک انتظامیہ کمیٹی مقرر کر دی گئی۔ اتحادی ملکوں کے ساتھ معاہدے کی ایک کم سے کم شرائط پر مشتمل ایک "قومی اقرار نامہ" بھی منظور کیا گیا۔ ان شرائط کی بنیاد مکمل آزادی کے اصول پر تھی۔ قسطنطنیہ میں سلطان پر اس کا اثر پڑا اور وہ کچھ خوف زدہ بھی ہوا۔ اس نے پارلیمنٹ کا نیا اجلاس طلب کرنے کا وعدہ کیا اور انتخابات کی اجازت دے دی۔ ان انتخابات میں سواس کانگریس کے لوگوں کو بہت بڑی اکثریت ملی۔ کمال پاشا کو قسطنطنیہ کے لوگوں پر اعتماد نہیں تھا اس نے منتخب ڈپٹیوں کو وہاں نہ جانے کی صلاح دی مگر وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور رؤف بیگ کی رہنمائی میں وہ استنبول چلے گئے۔ (قسطنطنیہ کو اب میں اسی نام سے پکاروں گا) ان کے وہاں جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اتحادی ملکوں نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر نئی پارلیمنٹ استنبول میں سلطان کی صدارت میں بیٹھے گی تو وہ اسے تسلیم کر لیں گے۔ کمال بھی ایک ڈپٹی تھا۔ مگر وہ خود نہیں گیا۔

نئی پارلیمنٹ کا جلسہ جنوری ۱۹۲۰ء میں ہوا اور اس نے فوراً اس قومی اقرار نامے کو منظور کر لیا جو سواس کانگریس میں تیار ہوا تھا۔ اتحادی ملکوں کے استنبول میں مقیم نمائندوں کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اور پارلیمنٹ نے اس کے علاوہ بھی جو اچھے کام کیے تھے وہ بھی انھیں پھوٹی آنکھ نہیں بھائے۔ اس لیے چھ ہفتے بعد

انھوں نے اپنی وہی پرانی اور بھونڈی چال بازیاں شروع کر دیں جنھیں وہ مصر اور دوسری کئی جگہوں پر اس سے پہلے آزما چکے تھے۔ انگریز سپہ سالار اپنی فوج لے کر استنبول میں گھس آیا اس نے شہر پر قبضہ کرلیا۔ فوجی قانون کا اعلان کر دیا گیا۔ رؤف بیگ کے ہمراہ چالیس ڈپٹیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں ملک بدر کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ انگریزوں کے اس "نرم" رویتے کا مقصد دنیا پر محض یہ ظاہر کرنا تھا کہ اتحادی ملکوں نے "قومی اقرار نامے" کو تسلیم نہیں کیا۔

ترکی میں پھر اشتعال پھیلنے لگا۔ اب یہ بات بہت صاف ہوگئی کہ سلطان انگریزوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے۔ بہت سے ترکی ڈپٹی بھاگ کر انگورا چلے گئے۔ وہاں پارلیمنٹ کا جلسہ ہوا اور اس نے اپنا نام "ترکی کی قومی قانون ساز مجلس" رکھا۔ اس نے ملک پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا کہ جس دن سے انگریزوں نے استنبول پہ قبضہ کیا اُسی دن سے استنبول کی حکومت کا وجود ختم ہو گیا۔

اس کے جواب میں سلطان نے کمال پاشا اور دوسرے لوگوں کے باغی ہونے کا اعلان کر دیا اور انھیں موت کی سزا کا حکم دے دیا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ منادی کرادی کہ جو کوئی کمال پاشا اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرے گا تو وہ ایک اہم مذہبی فریضے کی ادائگی کرے گا۔ دین اور دُنیا دونوں میں اس کی سُرخ روئی ہوگی۔ یاد رہے کہ ترکی کا سُلطان خلیفہ یعنی امیرالمومنین بھی تھا اور قتل کا یہ فتویٰ بہت خطرناک فتویٰ تھا۔ کمال پاشا نہ صرف اب باغی تھا جس کے پیچھے سرکاری بھیڑیے لگے ہوئے تھے بلکہ وہ بے دین بھی قرار دے دیا گیا تھا، جسے کوئی بھی کٹّر مذہبی قتل کر سکتا تھا سلطان نے قوم پرستوں کے خلاف جہاد بول دیا اور ان سے لڑنے کے لیے غیر فوجیوں کی "خلیفہ کی فوج" تیار کرائی۔ کٹھ مُلّاؤں کو فساد کی تیاری کے لیے بھیجا گیا۔ جگہ جگہ فسادات ہوئے اور کچھ دن ترکی میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکتی رہی۔ شہر اور شہر اور بھائی اور بھائی کے بیچ یہ بہت سخت لڑائی تھی دونوں طرف سے بہت بے رحمی کا ثبوت دیا گیا۔

ادھر سمرنا میں یونانی لوگ ایسا برتاؤ کر رہے تھے جیسے کہ وہ اس ملک کے دائمی مالک ہوں اور مالک بھی بالکل وحشیانہ قسم کے۔ انھوں نے زرخیز وادی کو ویران کر دیا۔ ہزاروں بے گھر ترکوں کو وہاں سے کھدیڑ دیا۔ ترکوں کی طرف سے معقول مقابلہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ برابر آگے بڑھتے چلے گئے۔

قوم پرستوں کو ایک خطرناک صورتِ حال کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا گھر میں ان کے خلاف منظم خانہ جنگی تھی اور باہر سے غیر ملکی حملہ آوروں کی ان پر چڑھائی۔ سلطان اور یونان دونوں کی پیٹھ ٹھونکنے والے بڑے بڑے اتحادی ملک تھے، جو جرمنی پر فتح حاصل کرنے کے بعد ساری دُنیا پر حاوی ہو رہے تھے۔ لیکن کمال پاشا نے اپنے لوگوں کو یہ نعرہ دیا کہ "جیتو یا مٹو" ایک بار ایک امریکن کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اگر قوم پرست ناکام رہے تو کیا ہوگا اُس نے کہا تھا: "جو ملک زندگی اور آزادی کے لیے آخری قربانیاں تک دیتا ہے وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ ناکامی کا مطلب ہے کہ قوم مردہ ہو چکی ہے"۔

اتحادی ملکوں نے قسمت کے سنائے ترکی سے معاہدہ کرنے کی جو دستاویز تیار کی تھی وہ ۱۹۲۰ء میں شائع کر دی گئی۔ "یہ سیورز کا معاہدہ" کہلایا۔ اس نے ترکی کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ آزاد ملک کی حیثیت سے ترکی کو سزائے موت سُنادی گئی۔ اس کی رو سے صرف ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے ہی نہیں کیے گئے بلکہ خود استنبول تک میں قبضہ بنائے رکھنے کے لیے اتحادی ملکوں کا ایک کمیشن مقرر کر دیا گیا۔ سارے ملک میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ عبادتوں اور ہڑتالوں کے ساتھ قومی سوگ کا دن منایا گیا۔ اس دن اخباروں کے صفحات پر سیاہ حاشیے چھاپے گئے۔ مگر اس سے کیا ہوتا تھا، سلطان کے نمائندے اس معاہدے پر دستخط کر چکے تھے۔ ہاں قوم پرستوں نے اسے حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ معاہدے کے شائع ہونے کا یہ نتیجہ ہوا کہ قوم پرستوں کی طاقت بڑھنے لگی اور اپنے ملک کی آبرو کو بچانے کے لیے دن دن ترک بڑی تعداد میں ان کی جماعت میں شامل ہونے لگے۔

مگر بغاوت پر آمادہ ترکوں سے اس معاہدے پر عمل درعمل کون کراتا؟ اتحادی ملک خود یہ کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی فوجوں کو منتشر کر دیا تھا۔ خانگی طور پر ان ملکوں کو فوج سے نکلے ہوئے سپاہیوں اور مزدوروں کی بد دماغیاں جھیلنی پڑ رہی تھیں۔ مغربی یورپ کے ملکوں میں ابھی تک فضا میں بغاوت کے جذبات رچے ہوئے تھے۔ ادھر اتحادی ملکوں میں آپس میں نااتفاقی پیدا ہو رہی تھی اور وہ مالِ غنیمت کے بٹوارے پر لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مشرق میں انگلینڈ کو اور کچھ حد تک فرانس کو ایک خطرناک صورتِ حال کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ فرانسیسی احکام کی بدولت سیریا میں بے اطمینانی کی آگ پھیل رہی تھی اور وہاں گڑ بڑ ہونے کا اندیشہ تھا۔ مصر میں خونی اکھاڑ پچھاڑ ہو چکا تھا جسے انگریزوں نے کچل دیا تھا۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد آزادی کی پہلی عظیم الشان تحریک سر اٹھا چکی تھی۔ حالاں کہ یہ تحریک پرامن تھی۔ یہ گاندھی جی کی رہنمائی میں عدم تعاون کی تحریک تھی اور خلافت کے سوال اور ترکی کے ساتھ جو برتاؤ روا رکھا گیا تھا اس سے بھی اس کا خاص تعلق تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اتحادی ملک اس حیثیت میں نہیں تھے کہ اپنے معاہدے کی شرطیں خود ترکوں پر عائد کر سکتے۔ وہ ترک قوم پرستوں کی اِس کھلی مخالفت کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے دوست وینیزیلوس اور ثرات کا سہارا لیا۔ یہ دونوں یونان کی طرف سے اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ پست ہمت ترک لوگ اتنا زیادہ پریشان کریں گے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایشیا کوچک کو آسانی سے لوٹ کر ہتھیایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اور بھی زیادہ یونانی فوجیں بھیجے گئے۔ یونان اور ترکوں کے درمیان بڑے پیمانے پر لڑائی چھڑ گئی۔ ۱۹۲۰ء کے موسم گرما اور موسم سرما میں فتح کی دیوی یونانیوں پر مہربان رہی۔ انھوں نے ترکوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ کمال پاشا اور اس کے ساتھیوں کے پاس جو ٹکڑیاں بچی رہ گئی تھیں اُن سے ایک جی دار فوج کھڑی کرنے کی

جی توڑ کوشش کی گئی۔ جس وقت انھیں مدد کی بہت سخت ضرورت تھی انھیں وہ مدد مل گئی اور ٹھیک موقع پر مل گئی۔ یعنی سوویت روس نے ہتھیاروں اور روپے سے انھیں مدد پہنچائی کیوں کہ برطانیہ کو دونوں اپنا دشمن سمجھتے تھے۔

کمال پاشا جوں جوں آگے بڑھنے لگا اتحادی ملکوں کے دلوں میں اس جدوجہد کے نتائج کی طرف سے اندیشے پیدا ہونے لگے اور انھوں نے معاہدے کی پہلے سے بہتر شرائط پیش کیں مگر کمالیوں کے لیے اب بھی وہ قابلِ تسلیم نہیں تھیں۔ انھوں نے اسے ٹھکرا دیا۔ اس پر اتحادی ملکوں نے یونان اور ترکی کی لڑائی سے قطع تعلق کر لیا اور غیر جانب داری کا اعلان کر دیا۔ یونانیوں کو اس طرح انھوں نے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا۔ یہی نہیں فرانس نے اور کسی حد تک اٹلی نے بھی ترکوں سے دوستی کرنے کی خفیہ کوششیں کیں مگر انگریز اب بھی تھوڑے بہت یونانیوں کے طرف دار تھے لیکن غیر سرکاری طور پر۔

۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں یونانیوں نے ترکی کے دارالسّلطنت پر قبضہ کرنے کی زبردست کوشش کی۔ وہ ایک کے بعد دوسرے شہر پر برابر قبضہ کرتے ہوئے انگورہ تک آ پہنچے مگر آخیر میں سقریہ ندی پر انھیں روک دیا گیا۔ اس ندی کے پاس تین ہفتے تک دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی رہیں۔ صدیوں پرانے نسلی اور قومی نفرت کے جذبے کے ساتھ یہ فوجیں برابر لڑتی رہیں۔ کسی نے دوسرے کے ساتھ کسی طرح کی رحم دلی نہیں دکھائی۔ یہ لڑائی صبر آزمائی کی خطرناک کسوٹی بن گئی۔ ترک تو خیر کسی طرح ڈٹے رہے مگر یونانیوں نے گھٹنے ٹیک دیے اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔ یونانی فوج اپنے معمول کے مطابق ساری چیزوں کو جلاتی اور برباد کرتی ہوئی پیچھے لوٹی۔ اس نے دو سو میل کے زرخیز علاقے کو ویران بنا دیا۔

سقریہ ندی کی لڑائی میں ترکوں کی بس بال بال فتح ہوئی تھی۔ یہ کسی طرح بھی آخری فتح نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس کا شمار تاریخ کی فیصلہ کن لڑائیوں میں کیا جاتا

ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر ہوا کا رُخ ہی بدل گیا۔ مشرق اور مغرب کے درمیان جن بڑی بڑی ٹکروں نے پچھلے دو سو سال سے بھی زائد کے عرصے میں ایشیائے کوچک کی چپہ چپہ زمین کو انسانوں کے خون سے تر کر دیا ہے، یہ لڑائی انھیں لڑائیوں میں ایک اضافہ تھی۔

دونوں طرف کی فوجیں بے دم ہو گئی تھیں اور وہ پھر قوت حاصل کرنے کے لیے اور دوبارہ منظم ہونے کے لیے دم لینے لگی تھیں۔ مگر کمال پاشا کا ستارہ عروج پر تھا۔ فرانسیسی حکومت نے انگورہ سے معاہدہ کر لیا۔ انگورہ اور سوویت روس کے درمیان بھی معاہدہ ہو گیا۔ فرانس کے ذریعے تسلیم کر لیے جانے سے مصطفیٰ کمال کو بہت بڑا اخلاقی اور مادّی فائدہ پہنچا۔ اس سے سیریا کی سرحد پر تعینات ترکی فوجیں یونان کے خلاف لڑنے کے لیے خالی ہو گئیں۔ برطانوی حکومت ابھی تک کٹھ پتلی سلطان کو اور استنبول کی نکمّی حکومت کو سہارا دے رہی تھی۔ اِسی لیے اِس فرانسیسی معاہدے سے اُسے دھکّا پہنچا۔

اگست ۱۹۲۲ء میں ترکی فوجوں نے یکایک مگر ہوشیاری سے پوری طرح تیاری کر لینے کے بعد، یونان پر حملہ بول دیا اور انھیں آسانی سے سمندر تک دھکیل دیا۔ آٹھ دن میں یونانی ۱۶۰ میل پیچھے ہٹے۔ مگر پیچھے ہٹتے ہوئے جو بھی ترکی مرد، عورت یا بچہ ملا، اُسے مار کر انھوں نے خونی بدلہ لیا۔ ترکوں نے بھی کم بے رحمی نہیں دکھائی۔ وہ یونانیوں کو قیدی بنانے کے جھنجھٹ میں نہیں پڑے جو تھوڑے سے قیدی انھوں نے گرفتار کیے ان میں یونانی فوج کا سپہ سالار اور کچھ افسر بھی شامل تھے۔ یونانی فوج میں سے بیشتر لوگ سمرنا کے بحری راستے سے نکل بھاگے مگر خود سمرنا شہر کا بہت بڑا حصہ نذرِ آتش کر ڈالا۔

اِس فتح کے بعد کمال پاشا نے دَم نہیں لیا وہ اپنی فوجوں کو لے کر استنبول کی طرف روانہ ہوا۔ شہر کے قریب چنک کے مقام پر انگریزی فوجوں نے اُسے روکا اور ستمبر ۱۹۲۲ء میں کچھ دنوں ترکی اور انگلینڈ کے درمیان جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ

رہا۔ لیکن آخر میں انگریزوں نے ترکوں کی تقریباً تمام مانگوں کو مان لیا اور دونوں نے جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اس میں انگریزوں نے یہ وعدہ تک کر لیا کہ وہ تھریس میں اُس وقت پڑی ہوئی یونانی فوجوں کو ترکی سے ہٹوا دیں گے۔ ترکی کے پیچھے سوویت روس کا ہیبت ناک دیو کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس لیے اتحادی ممالک ایسی لڑائی نہیں چھیڑنا چاہتے تھے، جس میں روس ترکی کی مدد پر آ جائے۔

مصطفیٰ کمال نے شاندار فتح حاصل کی اور ۱۹۱۹ء کے مُٹھی بھر باغی اب دنیا کی بڑی طاقتوں کے نمائندوں سے برابر کی حیثیت میں بات کرنے لگے۔ سورماؤں کی اس ٹکڑی کو مختلف حالات نے بہت مدد پہنچائی تھی۔ جیسے جنگ کے بعد کا ردِ عمل، اتحادی ممالک کی باہمی پھوٹ، ہندوستان اور مصر میں ہونے والی گڑبڑ میں برطانیہ کی مصروفیت، سوویت روس کی مدد، انگریزوں کے ہاتھوں ترکوں کی ہتک۔ مگر ان سب کے علاوہ ترکوں کی شاندار فتح کا اصل سبب تھا خود ان کے ارادے کی پختگی اور آزادی کی لگن اور ترکی کسانوں اور سپاہیوں کی لاجواب فوجی لیاقت۔

لوزان میں ایک امن کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس کئی ماہ تک کھنچتی رہی۔ انگلینڈ کے گھمنڈی اور تحکم پسند نمائندے لارڈ کرزن اور کچھ کچھ بہرے اور کوڑھ مغز عصمت پاشا کے درمیان عجیب عجیب نوک جھونک ہوئی۔ عصمت پاشا چپ چاپ مسکراتا رہتا تھا اور جس بات کو وہ نہیں سننا چاہتا تھا اُسے اَن سُنی کر دیتا تھا جس پر لارڈ کرزن کو سخت جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔ ہندوستان کی لاٹ صاحبی کے عادی اور فطرتاً گھمنڈی لارڈ کرزن نے گرج اور تڑپ کر بات کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ مگر بہرے اور مسکراتے ہوئے عصمت پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر میں تنگ آ کر کرزن لوٹ گیا اور کانفرنس ختم ہو گئی۔ کانفرنس کی بیٹھک بعد میں پھر ہوئی مگر اس بار کرزن کے بجائے دوسرا برطانوی نمائندہ شریک ہوا۔ "قومی اقرار نامے" کی ایک مانگ کے سوا ترکی کی تمام مانگیں تسلیم کر لی گئیں اور جولائی ۱۹۲۳ء میں لوزان کے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔

اس بار بھی سوویت روس کے سہارے نے اور اتحادی ملکوں کی آپسی نا اتفاقی سے ترکوں کی مدد کی۔

غازی یعنی فتح مند کمال پاشا کو وہ تمام چیزیں مل گئیں، جنھیں وہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شروع سے ہی اُس نے یہ عقل مندی کی تھی کہ اپنی مانگیں کم سے کم رکھی تھیں اور فتح کے موقع پر بھی وہ انھیں پر جما رہا۔ عرب ممالک۔ عراق، فلسطین، سیریا وغیرہ ترکی علاقوں پر ترکی اقتدار قائم کرنے کا خیال اس نے ترک کر دیا۔ وہ تو یہی چاہتا تھا کہ ترک قوم کا اصل مقام یعنی خاص ترکی آزاد ہو جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ترک لوگ دوسری قوموں کے معاملات میں دخل دیں مگر وہ ترکی میں بھی غیر ملکیوں کی دست اندازی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس طرح ترکی اپنے ہم ملّت لوگوں کا ایک متحد ملک بن گیا۔ کچھ دن بعد یونانیوں کی تجویز پر آبادی کی باہمی منتقلی ہوئی۔ اناطولیہ میں باقی بچے ہوئے یونانی یونان بھیج دیے گئے اور ان کے بدلے میں یونان میں رہنے والے ترک بُلا لیے گئے۔ اس طرح تقریباً پندرہ لاکھ آبادی کی منتقلیاں ہوئیں۔ ان میں سے بیشتر خاندان پُشتہا پُشت سے اناطولیہ اور یونان میں رہتے چلے آ رہے تھے۔ یہ قوموں کی عجیب و غریب اَدلا بدلی تھی۔ اِس نے ترکی کی اقتصادی زندگی کو بالکل اُلٹ پلٹ دیا، کیوں کہ یونان کے لوگوں کا وہاں کے کاروبار میں خاص طور سے بہت بڑا حصّہ تھا لیکن اس سے ترکی اور بھی ایک ہی مِلّت والے لوگوں کا ملک بن گیا اور آج اس کے جیسا ہم ملّت ملک یورپ اور ایشیا میں شاید ہی کوئی ہو۔

لوزان کے معاہدے کی رو سے ایک کے سوائے ترکی کی تمام شرطیں مان لی گئیں۔ عراق کی سرحد کے پاس موصل کی ولایت کا معاملہ ہی اس سے مستثنیٰ تھا چوں کہ دونوں فریق اس کے بارے میں متفق نہیں ہو سکے تھے اس لیے یہ معاملہ بین الاقوامی انجمن کے سپرد کر دیا گیا۔ کچھ تو تیل کے چشموں کی وجہ سے۔ مگر اس سے زیادہ جنگی اہمیت کی جگہ ہونے کی وجہ سے موصل کی ولایت کی اس قدر اہمیت تھی۔ موصل کے پہاڑ دن

قبضہ کرنے کا مطلب تھا کچھ حد تک ترکی، عراق اور ایران پر اور روس میں کاکیشیا تک اقتدار جانا۔ اسی لیے ترکی کے لیے اس کی اہمیت تھی۔ برطانیہ کے لیے بھی یہ ولایت اسی قدر اہم تھی۔ ایک تو ہندوستان جانے والے خشکی اور ہوائی راستوں کی حفاظت کے لیے دوسرے سوویت روس کے خلاف حملہ کرنے کے لیے یا اُس کے حملے سے بچاؤ کے لیے۔ نقشہ دیکھنے پر پتہ لگ جائے گا کہ موصل کتنی اہم جگہ واقع ہے۔ اس سوال پر بین الاقوامی انجمن نے برطانیہ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ ترکوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور ایک بار پھر جنگ کا چرچا ہونے لگا۔ مگر بالآخر انگورہ کی حکومت نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور موصل پھر عراق کی نئی ریاست کو دے دیا گیا۔

مصطفیٰ کمال اور اس کے ساتھیوں کو جو فتوحات نصیب ہوئیں ان سے انہوں نے کیا فائدہ اٹھایا؟ کمال پاشا لکیر کا فقیر بنے رہنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ ترکی کو اندرونی اور خارجی دونوں حیثیتوں سے بدل دینا چاہتا تھا۔ مگر فتح مند ہونے کے بعد اور بہت زیادہ ہر دل عزیزی حاصل کر لینے کے باوجود اس کے لیے بہت احتیاط اور ہوش مندی سے آگے قدم بڑھانا ضروری تھا۔ کیوں کہ کسی قوم کو دیرینہ روایات اور مذہبی بنیاد پر قائم اُس کے رسم و رواج سے زبردستی ہٹا دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ وہ سلطانیت اور خلافت دونوں کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا مگر اُس کے بہت سے ساتھی اس پر اُس سے متفق نہیں تھے اور عام ترکیوں کے جذبات بھی شاید ایسی تبدیلی کے حق میں نہیں تھے۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ کٹھ پتلی سلطان عبدالحمید ایک دن کے لیے بھی سلطان بنا رہے۔ اُس سے لوگ اسی طرح نفرت کرتے تھے جیسی کہ ملک کے غداروں سے کی جاتی ہے۔ اُس نے اپنے ملک کا شیرازہ غیر ملکیوں کے ہاتھ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کے باوجود بہت سے لوگ دستوری سلطانیت اور خلافت کے حق میں تھے، جس میں اصل اقتدار قومی مجلس آئین ساز کے ہاتھ میں ہو۔ مگر کمال پاشا اپنے مقصد کے ساتھ ایسا کوئی سمجھوتا نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے وہ موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔

ہمیشہ کی طرح اِس بار بھی انگریزوں نے یہ موقع دے دیا۔ جس وقت لوزان کی امن کانفرنس کے انتظامات کیے جا رہے تھے، برطانوی حکومت نے استنبول میں سلطان کے پاس کانفرنس کا دعوت نامہ بھیجا جس میں سلطان سے کہا گیا تھا کہ صلح کی شرائط پر بات چیت کرنے کے لیے وہ اپنا نمائندہ بھیج دے۔ اسی کے ساتھ اس سے یہ بھی درخواست کی گئی تھی کہ اِس دعوت نامے کی خبر انگورہ پہنچا دے۔ انگورہ کی جنگ میں فتح مند ہونے والی قومی حکومت کو اِس طرح نظر انداز کر دیے جانے کے رویّے نے اور نام نہاد سلطان کو ایک بار پھر آگے لانے کی بالارادہ کوشش نے ترکی میں سنسنی پیدا کر دی۔ ترک آگ بگولا ہو اُٹھے۔ انھیں شبہ ہو گیا کہ انگریز اور دغا باز سلطان مل کر کوئی اور سازش کر رہے ہیں۔ مصطفیٰ کمال نے اس جذبے سے فوراً فائدہ اُٹھایا اور نومبر ۱۹۲۲ء میں قومی مجلس آئین سازی کی کارروائی کے ذریعے سلطان کو معزول کرا ڈالا۔ مگر خلافت اب بھی باقی رہ گئی اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ اس کی وراثت اب بھی عثمانی خاندان کے پاس رہے گی۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد سابق سلطان عبدالحمید کے خلاف ملک کی غدّاری کے سنگین الزامات لگائے گئے۔ اُس نے کھلی عدالت کے سامنے پیش ہونے سے فرار ہو جانا بہتر سمجھا۔ ایک انگریزی ایمبولنس گاڑی میں بٹھا کر اُسے ایک انگریزی جنگی جہاز تک پہنچا دیا گیا۔ قومی مجلس آئین ساز نے اس کے چچا زاد بھائی عبدالمجید آفندی کو نیا خلیفہ چُن لیا، جو اب صرف رسمی حیثیت سے امیرالمومنین رہ گیا تھا، سیاسی اقتدار اُس کے ہاتھ سے چھن چکا تھا۔

اگلے سال ۱۹۲۳ء میں ترکی جمہوریہ کے قیام کا باقاعدہ اعلان ہو گیا۔ انگورہ اس کا دارالخلافہ رکھا گیا۔ مصطفیٰ کمال صدر جمہوریہ چُنا گیا۔ اُس نے سارا اقتدار اپنی مُٹھی میں لے لیا۔ اب اُس نے مختلف دقیانوسی رسم و رواج پر ضرب لگانی شروع کی۔ مذہب کی طرف سے اُس کے رویّے میں نرمی بالکل نہیں تھی۔ بہت سے لوگ، خاص طور سے مذہبی قسم کے بھولے بھالے لوگ، اُس کے طریقوں اور اس کی

رہنمائی سے غیر مطمئن ہو اٹھے اور وہ نئے خلیفہ کے گرد جمع ہو گئے مُکمال پاشا کو یہ بات ذرا بھی اچھی نہیں لگی اور وہ اگلا اہم قدم اٹھانے کے لیے مناسب موقع تلاش کرنے لگا۔

اسے یہ موقع جلدی ہی مل گیا اور وہ بھی بہت عجیب وغریب ڈھنگ سے۔ آغا خاں اور ہندوستان کے سابق جج امیر علی نے لندن سے اُس کے پاس ایک مشترکہ خط بھیجا۔ انھوں نے ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی وکالت کا دعویٰ کیا اور خلیفہ کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی شکایت کی۔ انھوں نے درخواست کی کہ خلیفہ کا وقار قائم رکھا جائے اور اُس کے ساتھ اُس کے شایانِ شان سلوک کیا جائے۔ اس خط کی نقلیں ان لوگوں نے استنبول کے کچھ اخباروں کو بھیج دیں۔ ہوا یہ کہ اصل خط کے انگورہ پہنچنے سے پہلے ہی اس کی نقل اخباروں میں چھپ گئی۔ اس خط میں اشتعال دینے والی کوئی بات نہیں تھی مگر کمال پاشا اسے لے اُڑا اور اس پر زبردست احتجاج کیا جس موقع کی تلاش میں وہ تھا وہ موقع اُسے مل گیا اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ بس یہ بات پھیلا دی گئی کہ ترکوں میں نااتفاقی پیدا کرنے کی یہ ایک اور انگریزی سازش ہے۔ کہا گیا کہ آغا خاں انگریزوں کا خاص ایجنٹ ہے۔

اس طرح کمال پاشا نے اِس مشترکہ خط اور آغا خاں کو لوگوں کی نگاہ میں گرا دیا۔ خط کے مصنّفوں کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ خط کو شائع کرنے والے استنبولی اخباروں کے ایڈیٹروں پر مُلک سے غدّاری اور برطانیہ کی ایجنٹی کا الزام لگایا گیا اور انھیں سخت سزائیں دی گئیں۔ اس طرح لوگوں کو خوب اشتعال دلانے کے بعد مارچ ۲۴ء میں خلافت کے خاتمے کا بل قومی مجلس آئین ساز میں پیش کیا گیا۔ بِل اسی دن منظور کر لیا گیا۔ اس طرح دنیا کے جدید اسٹیج سے ایک ایسا قدیم ادارہ رخصت ہو گیا جس نے تاریخ میں بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔

بتایا جا چکا ہے کہ ترکی اب پوری طرح ہم ملّت ملک بن گیا تھا، جس میں غیر ملکی عناصر نہ ہونے کے برابر تھے۔ مگر عراق اور ایران کی سرحدوں کے آس پاس مشرقی ترکی میں

اب بھی ایک غیر ترک قوم آباد تھی۔ یہ قدیم کُرد قوم تھی جو ایرانی زبان بولتی تھی یہ لوگ جس کردستان کے باشندے تھے اس کے ٹکڑے ترکی، عراق، ایران اور موصل کے صوبوں میں بانٹ دیے گئے تھے۔ کُل تیس لاکھ کردوں میں سے نصف کے قریب اب بھی خاص ترکی میں بسے ہوئے تھے۔ ۱۹۰۸ء کی نوجوان ترک تحریک کے بعد یہاں جدید قومی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ دارسائی کانفرنس میں بھی کُردوں کے نمائندوں نے قومی آزادی کا مطالبہ رکھا تھا۔

۱۹۲۵ء میں ترکی کے کُرد علاقے میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب موصل کا جھگڑا برطانیہ اور ترکی کے درمیان ناچاقی کا سبب بنا ہوا تھا۔ موصل خود ایک کُرد علاقہ تھا، جو ترکی کے اُس علاقے سے متصل تھا جہاں بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ ترکی کا اِس نتیجے پر پہنچنا قدرتی تھا کہ اِس بغاوت کے پسِ پردہ برطانیہ کا ہاتھ ہے اور برطانوی ایجنٹوں نے کٹّر کردوں کو کمال پاشا کی اصلاحوں کے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ یہ بتانا ممکن نہیں ہے کہ اس بغاوت کے پیچھے برطانوی ایجنٹوں کا ہاتھ تھا یا نہیں مگر جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ اس موقع پر ترکی کے اندر کردوں کی گڑبڑی برطانوی حکومت کے لیے خوشی کا باعث بن گئی تھی۔ یہ بات بھی صاف طور سے دکھائی دیتی ہے کہ اِس ہنگامے میں مذہبی کٹّرپن کا بہت بڑا ہاتھ تھا مگر قوم پرستی کے جذبے کی کارفرمائی بھی کچھ کم نہیں تھی۔

کمال پاشا نے فوراً یہ شور مچا دیا کہ ترک قوم خطرے میں ہے کیوں کہ برطانیہ کُردوں کی پُشت پناہی کر رہا ہے۔ اُس نے قومی مجلس آئین ساز سے ایک قانون پاس کرا لیا کہ تقریر یا تحریر کے ذریعے عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں مذہب کا سہارا لینا زبردست قومی غدّاری مانی جائے گی اور اس کے لیے سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔ مسجدوں میں ایسے مذہبی اصولوں کی تعلیم بھی روک دی گئی جن سے جمہوریہ کی طرف سے کسی طرح کی گمراہی پیدا ہونے کا امکان ہو۔ اس کے بعد اس نے بہت بے رحمی کے ساتھ کردوں کو کچلنا شروع کیا اور ان کا فیصلہ کرنے کے لیے ہزاروں

کی تعداد میں "آزادی کی مخصوص عدالتیں" قائم کر دیں۔ بہت سے کرد رہنما سولی پر لٹکا دیے گئے۔ وہ اپنے لبوں پر کردستان کی آزادی کی تمنا لے کر جاں بحق ہو گئے۔

غرض یہ کہ جو ترک کچھ ہی دنوں پہلے اپنی آزادی کے لیے سخت جدوجہد کر رہے تھے، انھوں نے ایک دوسرے آزادی کے دیوانے کردوں کو کچل دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ کس طرح مدافعانہ قومیت جارحانہ قومیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور آزادی کی لڑائی دوسروں پر اقتدار جمانے کی لڑائی بن جاتی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں کردوں نے دوسری بار بغاوت کی اس وقت اسے پھر کچل دیا گیا۔ مگر جو قوم آزادی حاصل کرنے پر تلی ہوئی ہو اور اس کے لیے ہر قیمت چکانے پر تیار ہو، اسے ہمیشہ کوئی کس طرح کچل سکتا ہے؟

اس کے بعد کمال پاشا نے ان سب لوگوں پر غصہ اُتارنا شروع کیا جنھوں نے قومی آئین ساز اسمبلی میں یا اُس سے باہر اُس کی پالیسی سے اختلاف کیا تھا۔ حکمراں کی حکمرانی کی ہوس حکم چلانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے یہ بھوک کبھی نہیں مٹتی، وہ کسی طرح کا اختلاف برداشت نہیں کر سکتی۔ پس کمال پاشا نے بھی ہر طرح کی مخالفت پر سخت ناراضگی ظاہر کی اور جب ایک دقیانوسی مذہبی خیال کے آدمی نے اس کے قتل کی کوشش کی، تب تو معاملہ بالکل ہی بگڑ گیا۔ اب "آزادی کی عدالتیں" غازی پاشا کی مخالفت کرنے والے سب لوگوں کا فیصلہ کرتی ہوئی اور انھیں سخت سزائیں دیتی ہوئی، سارے ترکی میں دَورہ کرنے لگیں، یہاں تک کہ اگر آئین ساز اسمبلی کے بڑے سے بڑے آدمیوں اور کمال پاشا کے پُرانے قوم پرست ساتھیوں نے بھی مخالفت کی تو انھیں بھی نہیں بخشا گیا۔ رؤف بیگ، جسے برطانوی حکومت نے مالٹا میں نظر بند کر دیا تھا اور جو بعد میں ترکی کا وزیرِ اعظم بنا، اس کی عدم موجودگی میں ہی اُسے سزا دے دی گئی۔ آزادی کی لڑائی میں حصّہ لینے والے دوسرے مشہور لیڈروں اور سپہ سالاروں کو بھی ذلیل کیا گیا۔ انھیں سزائیں دی گئیں اور کچھ کو سولی

پر لٹکا دیا گیا۔

تمام مخالفین کا صفایا کر کے مصطفیٰ کمال اب مطلق العنان حکمران بن گیا۔ عصمت پاشا اس کا دایاں ہاتھ تھا۔ اُس کے ذہن میں جو خیالات موجود تھے اس میں سے اس نے بیشتر پر عمل کرنا شروع کیا۔ اس نے بہت چھوٹی مگر بہت پتے کی چیز سے شروعات کی ۔ فیز ٹوپی (ترکی ٹوپی) جو ترک اور کچھ حد تک مسلمانوں کا نشان بن گئی تھی، سب سے پہلے نشانہ بنائی گئی ۔ اُس نے ہوشیاری کے ساتھ فوج سے اس کی پہل کی ۔ اس کے بعد وہ خود ہیٹ پہن کر باہر نکلا جس پر لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ آخر میں ترکی ٹوپی پہننا اُس نے قانونی جرم قرار دے دیا۔ محض ٹوپی کو اتنی زیادہ اہمیت دینا ذرا نادانی کی بات لگتی ہے کیوں کہ زیادہ اہمیت تو اس بات کی ہے کہ سر کے اندر کیا ہے نہ کہ سر کے اوپر کیا رکھا ہے ۔ مگر کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑی چیزوں کی نشان دہی کر دیتی ہیں ۔ سیدھی سادی ترکی ٹوپی کا سہارا لے کر کمال پاشا نے پرانے رسم و رواج اور دقیانوسیت پر حملہ کیا تھا۔ اس سوال کو لے کر بلوے اور فساد ہوئے۔ انھیں دبا دیا گیا اور بلوائیوں کو سخت سزائیں دی گئیں ۔

پہلی بازی جیت کر مصطفیٰ کمال نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ۔ اُس نے تمام خانقاہوں اور مذہبی اہمیت والی دوسری جگہوں کو بند کر دیا۔ انھیں توڑ دیا اور ان کی ساری جائدادیں ضبط کر لیں ۔ جو درویش ان میں رہتے تھے، ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ اپنی گذر اوقات کے لیے مزدوری کریں ۔ درویشوں کی خاص پوشاکوں پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

اس سے قبل مسلم مکتب توڑ دیے گئے تھے اور ان کی جگہ آزاد خیال سرکاری اسکول کھولے جا چکے تھے ۔ ترکی میں غیر ملکیوں کے بہت سے اسکول اور کالج تھے۔ ان میں دی جانے والی مذہبی تعلیم پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ کسی نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو اُسے حراست میں لے لیا گیا۔

قانون کا تو چولا ہی بدل دیا گیا۔ اب تک بہت سی باتوں میں قانون کی بنیاد شریعت تھی۔ اب سوئزرلینڈ کا ضابطہ دیوانی اور اٹلی کا ضابطہ فوجداری اور جرمنی کا ضابطہ تجارت عاید کر دیا گیا۔ ان معاملات سے متعلق پرانا اسلامی قانون بدل دیا گیا۔ ایک سے زاید شادی کا رواج بھی ختم کر دیا گیا۔

پرانے مذہبی رسم و رواج کے خلاف دوسری تبدیلی یہ کی گئی کہ انسانی شبیہوں، تصویروں اور مورتیوں کی تخلیق کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اسلام میں یہ عمل خلافِ شرع مانا جاتا ہے۔ مصطفیٰ کمال نے یہ فن سکھانے کے لیے متعدد دارالفنون قائم کیے۔

کمال پاشا کی دلی خواہش تھی کہ ترک عورتیں تمام بندھنوں سے آزاد ہو جائیں۔ "تحفظ حقوقِ نسواں" کی ایک انجمن بنائی گئی اور لڑکیوں اور دوسرے پیشوں کے دروازے عورتوں کے لیے کھول دیے گئے۔ سب سے پہلے برقع پر دھاوا بولا گیا۔ عورتوں کو تو اس برقع کو پھاڑ پھینکنے کا موقع ہاتھ آنے کی دیر تھی۔ کمال پاشا نے انھیں یہ موقع دیا۔ اُس نے یورپین انداز کے رقص کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ وہ خود تو اس کا دل دادہ تھا ہی اُس کے دل میں یہ رقص عورتوں کی آزادی اور یورپی تہذیب کا نشان بن گیا۔ 'ہیٹ اور رقص' تہذیب و ترقی کے نعرے بن گئے۔ یہ مغرب کے صحت مند نشان نہیں تھے مگر کم سے کم اوپری سطح پر ان کا اثر ضرور پڑا۔ ترکوں نے اپنی زندگی کا رنگ ڈھنگ بدل دیا۔ پردے کی پردروہ عورتوں کی پوری نسل نے کچھ ہی برسوں میں اپنے آپ کو ایک دم بدل ڈالا۔ انھوں نے وکیلوں، معلموں، ڈاکٹروں اور ججوں کی کرسیاں سنبھال لیں۔ لاطینی رسم الخط اختیار کر لینے سے ترکی میں ٹائپ رائٹروں کا رواج بہت بڑھ گیا۔ اس سے شارٹ ہینڈ جاننے والے ٹائپسٹوں کی ضرورت بہت زیادہ ہو گئی۔ نتیجے کے طور پر عورتوں کو روزگار کے اور مواقع مل گئے۔

بچوں کو بھی پورا پورا موقع دیا گیا کہ وہ اپنی اچھی طرح نشو و نما کر کے خود کفیل اور قابل شہری بن جائیں ۔"بچوں کا ہفتہ" اپنے ڈھنگ کا ایک انوکھا ادارہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر سال ایک ہفتے کے لیے ہر سرکاری ملازم کی جگہ نام کے لیے ایک ایک بچے کو بٹھا دیا جاتا تھا اور سارے ملک کا انتظام و انصرام بچے کرتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ نظام کیسے چلتا ہوگا۔ مگر یہ خیال بہت دل کش ہے اور مجھے یقین ہے کہ کچھ بچے خواہ کتنے ہی نادان اور ناتجربہ کار کیوں نہ ہوں ان کا طرزِ عمل ہمارے بڑی عمر والے، سنجیدہ اور رونی صورت والے افسروں اور سرکاری ملازموں کے طرزِ عمل سے زیادہ احمقانہ نہیں ہو سکتا۔

ایک چھوٹی سی تبدیلی تھی سلام کرنے کے رواج کو ختم کرنا۔ یہ بات ترکی حکمرانوں کے نئے نظریات کی بہت اچھی طرح ترجمانی کرتی ہے اس نے صاف کہہ دیا کہ مصافحہ کرنا خوش آمدید کہنے کا زیادہ مہذب طریقہ ہے اور آئندہ اسی کا چلن ہونا چاہیے۔

اس کے بعد کمال پاشا نے ترکی زبان پر، یا یوں کہیے کہ اس میں جن باتوں کو وہ غیر ملکی اثرات سمجھتا تھا ان پر زبردست ہلّہ بول دیا۔ ترکی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ کمال پاشا اسے مشکل رسم الخط بھی سمجھتا تھا اور بدیسی بھی۔ وسط ایشیا میں سودیت روس کے سامنے بھی اسی طرح کا مسئلہ آیا تھا کیوں کہ یہاں کی تاتاری قوموں کے رسم الخط عربی یا فارسی سے اخذ کیے گئے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں سودیتوں نے اس سوال پر غور کرنے کے لیے باکو میں ایک کانفرنس بلائی اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وسط ایشیا کی مختلف تاتاری زبانوں کے لیے لاطینی رسم الخط کام میں لایا جائے۔ مصطفیٰ کمال اس طریقے کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے اسے سیکھ لیا۔ اس نے اس کا اطلاق ترکی زبان پر کیا اور اس کو رواج دینے کے لیے ضروری کارروائیاں بھی شروع کر دیں۔ تقریباً دو سال تک لوگوں کو نیا رسم الخط سکھانے اور اس کا اچھی طرح پرچار کرنے کے بعد ایک تاریخ مقرر

کردی گئی جس کے بعد عربی رسم الخط کا استعمال ممنوع قرار دے کر لاطینی رسم الخط لازمی قرار دے دیا گیا۔

اس طرح ترکی میں لاطینی رسم الخط کی جڑیں جم گئیں مگر اس کے بعد جلدی ہی ایک دوسری تبدیلی آ گئی۔ جلدی ہی یہ محسوس کیا گیا کہ عربی اور فارسی الفاظ اس رسم الخط میں نہ آسانی سے لکھے جا سکتے تھے اور نہ ان کی مخصوص ہجے اور صوتی اوزان اس میں مناسب طریقے سے ادا ہو سکتے تھے۔ خالص ترکی الفاظ بہت بھونڈے اور سیدھے سادے سے تھے جو نئے رسم الخط میں آسانی سے لکھے جا سکتے تھے۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ترکی زبان میں سے عربی اور فارسی الفاظ نکال دیے جائیں اور ان کی جگہ خالص ترکی الفاظ رائج کیے جائیں۔ جیسا کہ میں بتلا چکا ہوں کمال پاشا چاہتا تھا کہ ترکی کو عرب اور دوسرے مشرقی اثرات سے جہاں تک ممکن ہو علیحدہ رکھا جائے۔

زبان میں ان تبدیلیوں کی وجہ سے شہروں اور اشخاص کے نام بھی تبدیل ہو گئے۔ "قسطنطنیہ" اب "استنبول" ہو گیا ہے۔ "انگورہ" اب "انقرہ" ہے اور "سمرنا" اب "اسمیر" ہے۔ ترکی میں اشخاص کے نام عام طور پر عربی سے لیے گئے ہیں۔ مصطفیٰ کمال بھی عربی نام ہے۔ اب خالص ترکی نام رکھنے کا عام رجحان ہو گیا ہے۔

ایک بہت اہم تبدیلی، جس کی وجہ سے بہت سی الجھن پیدا ہو گئی ہے، وہ ہے اسلامی نماز اور اذان کے لیے بھی ترکی زبان کو لازمی طور سے اختیار کرنے کا قانون پاس ہونا۔ مسلمان ہمیشہ سے عربی زبان میں نماز ادا کرتے آئے ہیں، اس لیے بہت سے مولویوں اور مسجدوں کے مُلّاؤں نے محسوس کیا کہ یہ بدعت سراسر ناجائز ہے اور انھوں نے نماز کی ادائگی عربی زبان میں جاری رکھی۔ مگر ترکی حکومت نے اسے بھی دوسری مخالفتوں کی طرح کچل دیا۔

ان دُور رس سماجی تبدیلیوں نے عوام کی زندگی بالکل بدل ڈالی ہے۔

پُرانے رسم و رواج اور پُرانی روایات اور مذہبی کٹرپن سے مبرّا ایک نئی نسل تیار ہو رہی ہے۔ ان سماجی تبدیلیوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے مگر اس کے باوجود ان تبدیلیوں کا ملک کی اقتصادی زندگی پر بہت گہرا اثر نہیں پڑا ہے۔ چوٹی پر کچھ چھوٹی موٹی تبدیلی کے سوا اقتصادی زندگی اب بھی اسی پُرانے ڈھرّے پر چل رہی ہے۔

زراعت سے شاید کمال پاشا کو خاص دلچسپی تھی کیوں کہ ترکی کسان کی حیثیت ترک قوم اور ترکی فوج کی ریڑھ کی ہڈی کی رہی ہے۔ نمونے کے فارم بنائے گئے۔ جدید طرز کے ہلوں کو رواج دیا گیا اور سہکاری سوسائٹیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

دُنیا کے دوسرے مُلکوں کی طرح ترکی بھی جنگ کے بعد کی کساد بازاری کا شکار ہوگیا تھا اور اُس کے لیے اپنی آمدنی اور خرچ میں توازن برقرار رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ مگر یہ ملک مصطفیٰ کمال کی رہنمائی میں آہستہ آہستہ مگر مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور مصطفیٰ کمال ملک کا چوٹی کا رہنما اور اعلیٰ حکمراں بنا رہا۔ اُسے "اتاترک" یعنی بابائے ملّت کا خطاب دیا گیا۔

اس طرح کمال اتاترک کی دانشمندانہ رہنمائی میں ترکی اپنے نسلی اور دوسرے مسائل سے پنڈ چھڑا کر داخلی استحکام کے راستے پر گامزن ہوگیا۔ اتاترک نے اپنے ملک والوں کی بہترین خدمت کی تھی اور جب نومبر ۱۹۳۸ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس نے اس اطمینان کے ساتھ اِس دُنیا کو خیرباد کہا کہ اُسے اپنے مقصد میں بہت خوبی کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے کا موقع مل چکا تھا۔ اس کے بعد اس کا دیرینہ رفیق کار عصمت انونو صدر کے عہدے پر فائز ہوا۔

کمال اتاترک نے وسط مشرق میں اسلامی محرکات کو ایک نئے سمت میں موڑ دیا۔ اسلام نے نیا چولا پہن لیا۔ قرونِ وسطیٰ کے خیالات کو ترک کر دیا اور اس طرح اپنے آپ کو آج کی دُنیا کی صف میں لاکر کھڑا کیا۔ وسط مشرق کے تمام

اسلامی ممالک پر اتاترک کی مثال کا زبردست اثر پڑتا ہے ۔ یہاں جدید ملی ریاستیں قائم ہو گئی ہیں، جنھوں نے مذہب کے بجائے ملت یا قومیت کو ہی بنیاد بنایا ہے ۔

ابراہیم الاآبادی ۲۱ ۳/ ۶۵ء

کچھ پُرانے خط

مرتب: پنڈت جواہر لعل نہرو　　　　مترجم: عبدالمجید الحریری

"کچھ پُرانے خط" پنڈت جواہر لعل نہرو کی مشہور کتاب 'A BUNCH OF OLD LETTERS' کا ترجمہ ہے جسے اردو میں دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

پہلی جلد ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک کے ۱۹۲ خطوط شامل ہیں۔

دوسری جلد ۴۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں سنہ ۱۹۳۲ء سے سنہ ۱۹۴۸ء کے ۱۴۷ خطوط شامل ہیں۔

خطوں کے اس نادر مجموعے میں اس صدی کے سرکردہ سیاسی رہنماؤں، فلسفیوں اور قابلِ فخر ہستیوں کے ایسے خطوط کو یکجا کیا گیا ہے جن سے اس دور کی تاریخ کا صحیح علم ہوتا ہے۔ بعض ایسے واقعات بھی منظر عام پر آتے ہیں جو اس سے پہلے نہیں آسکے تھے۔

قیمت جلد اول ۱۰/-　　　　قیمت جلد دوم ۱۰/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

یادگار شخصیتیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی